تفسیری
نکات و افادات
www.KitaboSunnat.com
از
حافظ ابن القیم رحمہ اللہ
جمع و ترتیب
مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ
مکتبہ اسلامیہ

تفسیری نکات وافادات

از

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ

جمع وترتیب
مولانا عبدالغفار حسن

مکتبہ اسلامیہ

ناشر ---------------- محمد سرور عاصم

کمپوزنگ ڈیزائینگ --------- مکتبہ اسلامیہ

اشاعت ------------- نومبر 2009ء

قیمت --------------- www.KitaboSunnat.com

بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ، لاہور - پاکستان فون:042-37244973

بیسمنٹ اٹلس بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد-پاکستان فون:041-2631204, 2034256

E-mail:maktabaislamiapk@gmail.com

فہرست

پیش لفظ ---------- 15

مقدمہ ---------- 17

ترجمہ کا پس منظر ---------- 20

سوانح حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ ---------- 22

نام ونسب ---------- 22

ابتدائی تعلیم ---------- 22

اساتذہ ---------- 22

علمی مرتبہ ---------- 23

زہد وعبادت ---------- 23

امام ابن قیم، امام ابن تیمیہ کے صحیح جانشین

اوران کے علوم کے مرتب، حامل اور ناشر تھے ---------- 25

امام ابن القیم کا مذہبی مسلک ---------- 26

مسئلہ ---------- 27

وفات ---------- 28

امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خدمات ---------- 28

امام صاحب کی تصانیف کی خصوصیات ---------- 29

تصانیف ---------- 30

امام ابن القیم کی سوانح پر لکھی جانے والی چند کتب ---------- 32

مولانا عبدالغفار حسن رحمانی عمر پوری ---------- 33

بسم اللہ کی لغوی توجیہ ---------- 36

سورۂ فاتحہ کے بعض اہم تفسیری نکات ---------- 38

❁ تفسیر سورۃ الفاتحہ ---------- 46

❁ توحید کی اقسام ---------- 46

❁ اللہ کی صفت کلام ---------- 48

❁ خلاصہ فصل ---------- 48

❁ خلاصہ فصل ---------- 49

❁ صفت مالکیت یا ملکیت ---------- 52

❁ یوم الدین ---------- 52

❁ خلاصہ فصل ---------- 52

❁ صفت رحمت کی لطیف تشریح ---------- 53

❁ خلاصہ فصل ---------- 53

❁ سورۂ مائدہ کی ایک آیت میں لطیف نکتہ ---------- 55

❁ سورۂ ابراہیم کی ایک آیت ---------- 56

❁ خلاصہ فصل ---------- 57

❁ مراتب ہدایت ---------- 57

❁ کلام کے معنی ---------- 57

❁ ایک شبہ کا جواب ---------- 59

❁ وحی کے معنی ---------- 59

❁ محدث کے معنی ---------- 60

❁ ایک جاہلانہ قول ---------- 60

❁ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فہم ---------- 63

❁ مراتب سماع ---------- 68

❁ الہام اور فراست میں فرق ---------- 70

❁ رؤیا کی قسمیں ---------- 72

❁ سچا خواب دیکھنے کا طریقہ ---------- 73

- خلاصہ فصل ---------- 73
- سورۃ الفاتحہ دل اور بدن دونوں کے لیے شفا ہے ---------- 73
- دو بڑی بیماریاں ریا اور تکبر ---------- 75
- اسرار إیاك نعبد و ایاك نستعین ---------- 76
- عبادت ---------- 77
- استعانت ---------- 77
- عبادت اور توکل ---------- 77
- استعانت پر عبادت کی تقدیم کا راز ---------- 78
- ایاك کی تقدیم فعل پر ---------- 80
- خلاصہ فصل ---------- 81
- تنبیہ ---------- 82
- توکل اور استعانت کے معنی ---------- 84
- خلاصہ فصل ---------- 84
- تفسیر النصف الآخر من سورۃ الفاتحہ ---------- 86
- سورۃ الفتح کی ابتدائی آیات کی تفسیر ---------- 89
- قرآنی شواہد ---------- 95
- قرآنی کلمات کی حکیمانہ ترتیب ---------- 126
- السماء کی تقدیم الارض پر ---------- 129
- قرآن مجید کے بعض الفاظ کو بعض پر مقدم کرنے کی حکمت ---------- 130
- آیات جہاد میں مال کا ذکر جان سے پہلے ---------- 134
- قرآنی ترتیب کلمات کے مصالح وحکم ---------- 143
- علامہ سہیلی کا قول ---------- 143
- علامہ ابن القیم کا ارشاد ---------- 143
- علامہ سہیلی کی تصریح ---------- 143

- فضل وشرف کے لحاظ سے تقدم ---------- 145
- ایک شبہ کا ازالہ ---------- 145
- مال کا تقدم اولاد پر ---------- 146
- قرآن میں بعض الفاظ کو جمع اور بعض کو مفرد لانے کی وجہ ---------- 147
- فرق معنوی ---------- 147
- ریح اور ریاح ---------- 153
- ظلمات، نور، یمین، شمائل ---------- 154
- جمع کی مثال ---------- 157
- تثنیہ کی مثال ---------- 158
- واحد کی مثال ---------- 158
- فصل عظیم النفع ---------- 162
- کفر کی حقیقت اور قسمیں ---------- 163
- کفر اکبر کی اقسام ---------- 165
- ۱۔ کفر تکذیب ---------- 165
- ۲۔ کفر استکبار ---------- 165
- ۳۔ کفر اعراض ---------- 166
- ۴۔ کفر شک ---------- 167
- ۵۔ کفر نفاق ---------- 167
- کفر جحود کی دو قسمیں ---------- 167
- ۱۔ کفر مطلق عام ---------- 167
- ۲۔ جحود (مقید خاص) ---------- 167
- شرک کی قسمیں ---------- 168
- ۱۔ شرک اکبر ---------- 168
- ہلاکت اقوام ---------- 168

- فسوق ---------- 173
- آیت کا شان نزول ---------- 175
- تشریح اثم وعدوان ---------- 175
- اثم اور بغی کا فرق ---------- 179
- فحشا اور منکر کی تشریح ---------- 179
- تفسیر ﴿وأن تقولوا على الله مالا تعلمون﴾ ---------- 180
- محرمات کی دو قسمیں ---------- 181
- رسول اللہ ﷺ پر اعتراضات ---------- 183
- سورۃ الفرقان کی ایک آیت ---------- 186
- تقویٰ ---------- 187
- استغفار کا استعمال ---------- 187
- توبۃ النصوح کی حقیقت ---------- 188
- نصوح کے معنی ---------- 189
- مغفرت ذنوب اور تکفیر سیئات میں فرق ---------- 190
- حاشیہ از رشید رضا ---------- 192
- مغفرت اور تکفیر کا فرق ---------- 193
- متعلقات توبہ ---------- 194
- توبہ ---------- 194
- کبائر ---------- 197
- گناہ کبیرہ کی تعریف ---------- 197
- لفظ أو کا استعمال ---------- 201
- حسنہ اور سیئہ ---------- 201
- انابت ---------- 203
- معنی سمع ونظائرہ فی القرآن ---------- 205

- زخرف القول ---------- 207
- دلائل توحید ---------- 209
- دلائل رسالت ---------- 217
- دلائل قیامت ---------- 220
- قیامت کی ایک اور دلیل ---------- 222
- دعا کے آداب واقسام ---------- 225
- دعائے سوال اور دعائے عبادت ---------- 225
- شان نزول ---------- 230
- سرّی دعا کے فوائد ---------- 233
- دعا اور ذکر کا تعلق ---------- 237
- دعا میں اعتداء کی ممانعت ---------- 240
- فساد فی الأرض ---------- 242
- تفسیر ﴿ان اللہ و ملائکته، یصلون علی النبی...... ﴾ الخ ---------- 246
- تفسیر ﴿وسلام علیه یوم ولد ویوم یموت و یوم یبعث حیا﴾ ---------- 249
- وایضا قول عیسیٰ علیہ السلام ---------- 249

تفسیر ﴿قل الحمد لله وسلام علی عباده الذین اصطفی﴾

- تفسیر آیت: ﴿قل الحمد لله وسلام علی عباده ...... ﴾ ---------- 250
- سلام کی حقیقت کیا ہے؟ ---------- 254
- تفسیر قول ملائکہ اور جواب ابراہیم علیہ السلام ---------- 258
- دعا اور بددعا کے طریقوں میں فرق ---------- 260
- تفسیر واسرار السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته ---------- 263
- رحمة الله وبرکاته ---------- 266
- رحمة کی اقسام اور الحي القیوم کی تشریح ---------- 267
- ا۔ رحمت مخلوقہ ---------- 267

۲۔رحمت بطور صفت الٰہیہ ---- 268
تفسیر صلوا علیه وسلموا تسلیما ---- 270
صلوۃ علی رسول اللہ کی لغوی توجیہ ---- 270
اسرار اللهم اور رب ---- 272
چند قرآنی کلمات کی تاویل وتشریح ---- 275
دعوت الی اللہ ---- 275
نکتہ ---- 275
ایّام ---- 276
اعتصام ---- 276
فرار الی الله ---- 278
الجهل ---- 278
علم الیقین ---- 278
السماع ---- 279
خوف ---- 280
خشية ---- 280
رهبة ---- 280
وجل ---- 280
هيبة ---- 280
اشفاق ---- 281
خشوع ---- 281
مقام ربه ---- 283
تاویل کے معنی لغت اور قرآن میں ---- 285
تاویل ---- 285
ایک اصولی بحث ---- 293

- آیت حج کے اسرار و حکم ---------- 298
- اسرار آیت قتال ---------- 303
- ایک شبہ ---------- 304
- قرآنی معارف وحقائق ---------- 306
- قرآن میں مقسم علیہ کون سی اشیاء ہیں؟ ---------- 308
- تفسیر سورۃ القیامۃ ---------- 312
- نفس لوّامۃ کی تشریح ---------- 313
- نفس لوّامۃ، جزاء اور اعمال ---------- 314
- جواب قسم کیا ہے؟ ---------- 315
- انسانی گمان کی تردید ---------- 316
- نکتہ اوّل ---------- 316
- تسویہ بنان کے ایک اور معنی ---------- 316
- سورۂ قیامہ کے بعض لطائف ---------- 322
- نکتہ دوم ---------- 324
- نکتہ سوم، اثبات نبوت وقیامت ---------- 326
- دوسری دلیل ---------- 328
- تفسیر سورۃ التکویر ---------- 329
- خنس کی لغوی تحقیق ---------- 329
- کنس کی تحقیق ---------- 329
- ذو قوۃ کی تشریح ---------- 333
- مطاع ---------- 334
- امین ---------- 335
- ایک دوسرا لطیف معنی ---------- 337
- دوسری قراءت ظنین ---------- 337

قدریہ اور جبریہ کا رد ---------- 342
جبریہ کا ایک شبہ ---------- 343
جواب شبہ ---------- 343
قدریہ کی تاویل ---------- 343
ایک ضروری امر کی تصریح ---------- 344
تفسیر سورۃ البروج ---------- 346
سلسلہ کلمات قسم میں تعلق ---------- 347
شاہد کے معنی ---------- 348
ایک لطیف نکتہ ---------- 348
یوم قیامت بھی مشہود ہے ---------- 349
قرآن بھی مشہود ہے ---------- 349
کتاب الابرار بھی مشہود ہے ---------- 349
جواب قسم کیا ہے؟ ---------- 350

ودود کے معنی ---------- 352
رحیم اور غفور کے ساتھ ودود کا تعلق ---------- 352
مجید کا معنی ---------- 353
حمید و مجید کا تعلق ---------- 353
سورۃ البروج کی جامعیت ---------- 356
تفسیر سورۃ الفجر ---------- 359
ایام عشر کی فضیلت ---------- 359
الفجر کی تشریح ---------- 360
متواضعین اور متکبرین کا مقابلہ ---------- 364
تفسیر سورۃ البلد ---------- 366
فی کبد کی تفسیر ---------- 366

- سلسلہ قسم کی تشریح ---------- 368
- انسانوں کی دو قسمیں ---------- 372
- اسرار سورت ---------- 373
- تفسیر سورۃ والشّمس ---------- 377
- وجود خالق پر استدلال ---------- 377
- محتاج، قدیم نہیں ہو سکتا ---------- 378
- زمین کا آباد حصہ ---------- 378
- خالق کائنات مختار کل ہے ---------- 379
- نفس سے مراد ---------- 380
- فلاح، انسان کے اعمال پر موقوف ہے ---------- 381
- سخی اور بخیل کے درمیان فرق ---------- 382
- تقدیر کا اثبات ---------- 383
- دعائے نبوی ---------- 384
- راجح مطلب ---------- 384
- تقدیر اور انسانی اختیار کے حدود ---------- 385
- تخصیص قوم ثمود ---------- 386
- قوم عاد ---------- 386
- پہلی قوموں کی برائیاں ---------- 386
- جیسا گناہ ویسا عذاب ---------- 387
- قوم عاد اور قوم ثمود میں فرق ---------- 387
- تفسیر سورۃ واللیل ---------- 389
- تفسیر سورۃ الضحیٰ ---------- 409
- تفسیر سورۃ التین ---------- 413
- تفسیر سورۃ العادیات ---------- 424

- مفسرین اور طریق تفسیر ---------- 426
- عادیات / موریات اور أثرن / وسطن میں فرق ---------- 427
- مقسم علیہ کا بیان ---------- 427
- بخل اور کفر ---------- 429
- اخلاص واحسان ---------- 431
- تفسیر سورۃ العصر ---------- 433
- سورۃ والعصر اور والتین کا لطیف فرق ---------- 434
- صفات اربعہ کا باہمی تعلق ---------- 436
- تمام کمالات انسانی کا احاطہ ---------- 436
- صبر کی قسمیں ---------- 437
- تفسیر سورۃ الکافرون ---------- 439
- مراجع ومصادر ---------- 444
- اجمالی فہرست ---------- 447

پیش لفظ

قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ اللہ کے بندوں نے اس کی تفسیر، تبیین اور بیان میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور جس طرح بھی ممکن ہوا اس کتابِ مقدس کی خدمت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کچھ حضرات نے تفسیر کے ذریعے ضخیم مجلّدات کے ڈھیر لگا دیئے، بعض مفسرین کرام نے صرف مختصر حواشی پر اکتفا کیا، بعض حضرات نے قرآن کریم کے مختلف پہلوؤں کو اپنی تحریر کا ذریعہ بنایا۔ ان تمام کارہائے نمایاں کے مقابل حافظ ابن القیم الجوزیہ رحمۃ اللہ علیہ کا تفسیری کام ایک الگ شان کا حامل ہے۔

انہوں نے قرآن کریم کی کوئی جامع تفسیر تحریر نہیں کی، بلکہ قرآن کریم کی مختلف آیات اور سورتوں کا گہرا مطالعہ پیش کیا ہے، وہ قرآن کریم کے مختلف اسالیب اور الفاظ کے معانی پر غور کرتے ہیں، کہیں وہ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کے سمندر میں سے موتی نکال کر لاتے ہیں اور صرف اس آیت کی روشنی میں کئی جلدیں تحریر کر دیتے ہیں، کہیں مختلف کلمات کی حکیمانہ ترتیب کی وضاحت فرماتے ہیں، کہیں ایک ہی طرح کے الفاظ کا مختلف مقامات پر استعمال کی حکمتیں بتاتے ہیں۔

انہی انفرادی خصوصیات کی بنا پر مولانا عبدالغفار حسن رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں کو اپنی جولان گاہ بنایا اور ان میں سے مختلف جواہر پارے منتخب کرکے ان کو اردو قالب میں ڈھال دیا اور یہ صرف ترجمہ ہی نہیں ہے بلکہ ان مطالب کی ترجمانی ہے جس کے ذریعے صحیح مفہوم سامنے آ جاتا ہے۔

مولانا مرحوم نے علامہ ابن القیم کی مختلف کتابوں خصوصاً بدائع الفوائد، مدارج السالکین، مختصر الصواعق المرسلة اور التبیان فی اقسام القرآن جیسی معرکۃ الآراء تالیفات کے مختلف مقامات سے یہ اقتباسات جمع کیے ہیں اور ان کو اپنے الفاظ میں ڈھال دیا ہے۔ یہ ترجمہ بذات خود ایک مستقل تصنیف معلوم ہوتا ہے۔

مولانا مرحوم کو حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں سے اتنا شغف تھا کہ انہوں

نے اپنے علمی سفر کے آغاز ہی سے یہ کام شروع کر دیا تھا،ان کی یہ تحریریں پاک وہند کے مختلف جرائد میں شائع ہوتی رہیں جن میں المنیر ، المنبر ، محدث (لاہور)، ارشاد جدید (کراچی) اور دیگر رسائل شامل ہیں۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ ان کی یہ تمام تحریریں یکجا ہو جائیں اور ان کا اصل کتاب سے تقابل کرنے کے بعد پیش کیا جائے، تخریج آیات و احادیث کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔

کتاب کے آغاز میں والد محترم کے دیرینہ رفیق کار حکیم عبدالرحیم اشرف رحمۃ اللہ علیہ کا مقدمہ ہمارے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے، اسی طرح انہی آیات کے بارے میں تمہیدی کلمات بھی والد محترم کے قلم سے میسر آگئے ہیں اور اس طرح یہ ایک مکمل کتاب انہی کے قلم سے وجود میں آگئی ہے۔

زیر نظر کتاب کے تمام مقالات کی جمع، تدوین و ترتیب اور تخریج کے لیے رفیق کار عزیزم کلیم حسین شاہ نے انتھک محنت کی ہے، میں دل کی گہرائیوں سے ان کا شکر گزار ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس محنت کی بہترین جزا عطا فرمائے اور ان کے علم و عمل میں روزافزوں اضافہ فرمائے۔

اسی طرح عزیزم محمد اسحاق خان کی محنت کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے کہ جنہوں نے نہایت شوق اور لگن سے اس کتاب کی کمپوزنگ کی۔

آخر میں ان تمام حضرات کا شکرگزار ہوں جنہوں نے اس کتاب کے مقالات جمع کرنے میں تعاون فرمایا، اللہ تعالیٰ انہیں اس تعاون کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔

والحمدلله الذی بنعمته تتم الصالحات ، وآخر دعوانا أن الحمدلله رب العالمین۔

سہیل حسن
اسلام آباد
۲۴ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ
۲۱ر اپریل ۲۰۰۹

مقدمہ

تفسیر ایک مستقل بالذّات فن ہے،لیکن متعدد فنون ایسے ہیں جو اس کالازمی ذریعہ ہیں۔مثلاًلغت،اسلوب اہل زبان،امتیازات،اسلوب قرآن،علم اسباب وماحول نزول قرآن،علم تاریخ واصول انسانیت،جاہلیت اُولیٰ کاتفصیلی مطالعہ،سرور کونین ﷺ کی سیرت پرعمیق نگاہ،آپ کے فرمودات کے ذخیرہ پرعبور اور سیرت صحابہ رضی اللہ عنہم کاتفصیلی مطالعہ،یہ تمام ذرائع بلکہ شرائط ولوازمات ہیں،جن کا حصول ہراس شخص کے لیے ضروری ہے جوقرآن مجید کی تفسیر کے پرخطر لیکن پُرعظمت میدان میں قدم رکھنے کاارادہ رکھتا ہے۔

لیکن جوچیز تفسیر قرآن کی شاہ کلید ہے، وہ ہے فاطر السمٰوٰت والارض، منزّل القرآن،رب رحمان کی ذات سے وہ محبت،جس پر"أشد حباً" کااطلاق ہوسکے اورصفات قدسیہ الٰہیہ واسمائے حسنٰی کی معرفت،ان کے حقائق کا قلب پرورود ونزول اوران صفات پرلازوال ایمان۔

یہی ایمان و معرفت اورمحبت،انسان میں اخلاص پیداکرتی ہے۔علوم دینیہ کاہرطالب علم بخوبی جانتاہے کہ قرآن جوآسمانی کلام ہے اوررب العزت تبارک وتعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے اورجس کامقصد مجمع وافرادِانسانیت کوشہواتِ نفس اورماحول کی پیداکردہ ظلمات سے نکال کرنورہدایت الٰہیہ کی جانب لانا ہے۔اس قرآن کے اسرارورموزاورکلام الٰہیہ سے اللہ رؤف ورحمان کی مراد معلوم کرنا،کسی ایسے شخص کے لیے ممکن نہیں جس کا قلب انوار الٰہیہ کامہبط،جس کی عقل غلط خواہشات اورامانی سے پاک اورجس کے جذبات پرہیبت الوہیت کاایسا غلبہ نہ ہوکہ ماسویٰ اللہ کی جانب جھکاؤ، غیراللہ کاخوف اوراس سے اُمید کی نجاست کاکوئی جزوقلب میں باقی نہ رہے اورجذبات کارخ تمام تر،اللہ رحمان ورحیم کی جانب مڑجائے۔

یہ بات بھی کتاب الٰہی کے متعلمین سے مخفی نہیں ہے کہ عقل وفہم اور قلب وفواد پر محبت باللہ اور ہیبت جلال وجمال کا غلبہ اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک انسان اپنے رب کو اس کی صفات جلال وجمال اور اس کے اسمائے حسنیٰ کے توسط سے نہ پہچانے اور اپنے آپ کو اس کے حوالے نہ کر دے۔

یہ معرفت اور سپردگی گویا تفسیر قرآن مجید کی شاہ کلید ہے اور جن افراد کو اس باب میں امتیاز وشرف کا مقام حاصل ہے، ان میں منجملہ بعض دوسرے اساطین علم ومعرفت کے امامین، ہمامین امام ابن تیمیہ اور امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہما کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان ہر دو حضرات کی تصانیف اس لائق ہیں کہ توحید خالص کے متلاشی اور اسماء وصفات الٰہیہ کے اسرار ومعارف کو سرمایہ ایمان وفہم قرار دینے والے شائقین ان تصانیف سے کماحقہ استفادہ کریں۔

شیخین کی تصانیف کے متعدد پہلوؤں میں ایک خاص رخ ان مقامات کا ہے جو آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر وتبیین سے متعلق ہیں۔ ان مقامات کو بعض ارباب ہمت نے یکجا کر دیا ہے اور اس وقت دو مہتم بالشان مجموعے اہل علم حلقوں تک پہنچ چکے ہیں۔ ان میں ایک مجموعہ ''التفسیر القیم'' کے نام سے ہمارے پیش نظر ہے۔ اس مجموعہ میں امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کے تفسیری اجزا یکجا کیے گئے ہیں۔ ان میں سب سے جامع تفسیر تو سورۂ فاتحہ کی ہے، اس کے علاوہ سورۃ التکاثر، سورۃ الکافرون، سورۃ الفلق اور سورۃ الناس تو تقریباً مکمل سورتوں کی مفصل تفاسیر ہیں۔ اور سورۂ والعصر اور بعض دوسری سورتوں کی تفاسیر اس انداز کی ہیں جو ان سورتوں کے جملہ مضامین پر حاوی ہیں۔

یہ مجموعہ تفاسیر ''التفسیر القیم'' بڑے سائز کے سوا چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے متعدد اجزا کا ترجمہ ہمارے مکرم فاضل ممدوح مولانا عبدالغفار حسن صاحب فرما چکے ہیں اور بقیہ ترجمہ کا سلسلہ ان شاء اللہ العزیز جاری رہے گا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے نفع حاصل کرنے کی توفیق سے نوازے۔

اللهم نور قلوبنا بالقرآن العظيم وارفعنا بالآيات والذكر الحكيم انك انت التواب الرحيم۔ ❶

(مولانا) حکیم عبدالرحیم اشرف (رحمۃ اللہ علیہ)

نوٹ: اس مجموعہ تفسیر ''التفسیر القیم'' کے منظر عام پر آنے سے قبل ہی مولانا عبدالغفار حسن رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کی کتب سے تفسیری افادات کا ترجمہ شروع کر دیا تھا۔ اس اعتبار سے مولانا عبدالغفار حسن رحمۃ اللہ علیہ کو امام ابن القیم کے تفسیری افادات مرتب کرنے والے دیگر مرتبین پر اوّلیت حاصل ہے۔ کچھ عرصہ قبل امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کے تفسیری افادات پر مشتمل دو مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں (۱) الضوء المنیر علی التفسیر: الشیخ علی الحمد المحمد الصالحی، [٦ جلد] (۲) بدائع التفسیر: یسری السید محمد، [۵ جلد]۔ (مرتب)

❶ المنبر، ۲۱ اگست ۱۹٦۴ء

ترجمہ کا پس منظر

اہل علم حضرات سے امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کا تبحر علمی اوروسعتِ نظری پوشیدہ نہیں۔خصوصاً قرآن فہمی میں جوآپ کا بلند درجہ ہے اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ جنہوں نے حافظ موصوف کی گراں قدر تصانیف مدارج السالکین،اجتماع الجیوش الاسلامیہ اورالتبیان فی اقسام القرآن کا مطالعہ کیا ہے وہ واقف ہیں کہ موصوف نے قرآنی آیات کی تشریح میں جونکتہ آفرینیاں اوردقیقہ سنجیاں ظاہر کی ہیں وہ کس قدر قیمتی اور بے نظیر ہیں۔افسوس کہ حافظ ممدوح کی کوئی مکمل اور مستقل تفسیر نہیں ہے ورنہ آج امت کے ہاتھوں میں علوم قرآنی کا ایک بیش بہا ذخیرہ ہوتا۔ [1]

راقم الحروف،طالب علمی کے زمانہ سے امام ابن تیمیہ اورحافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کے مطالعہ کا شیدائی رہاہے۔خاص طور پرحافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کے تفسیری نکات نے بہت زیادہ متاثر کیا۔آج سے پچاس سال قبل جب کہ میں مالیر کوٹلہ میں مدرسہ کوثر العلوم میں مدرّس تھا۔یہ کوشش کرتا رہا کہ حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کی تمام تصانیف جمع کی جائیں اوران میں سے تفسیری اجزا علیحدہ کرکے ان کا ترجمہ یا تلخیص کردی جائے۔اس مقصد کوسامنے رکھتے ہوئے کئی تصانیف میں سے تفسیری مباحث کا ترجمہ کیا گیا۔ زیادہ تر بدائع الفوائد کے چار اجزا میں سے تفسیری نکات کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

ظاہر بات ہے،یہ ترجمہ پچاس سال پہلے کا ہے،ہوسکتا ہے کہ کہیں ترجمہ میں روانی محسوس نہ ہو یا کہیں جھول نظر آئے یاترجمہ غلط ہوجائے۔اس لیے قارئین کرام سے درخواست ہے کہ جہاں کہیں وہ ترجمہ میں غلطی محسوس کریں تو "الدین النصیحۃ" کے مطابق اپنی تصحیح سے مطلع فرمائیں۔

واضح رہے کہ اس ترجمہ کے کافی عرصہ بعد''التفسیر القیم'' کے نام سے ایک

[1] ماہنامہ الارشاد جدید کراچی،جنوری ۱۹۶۴ء۔

کتاب (جس میں مولانا محمد اویس ندوی نے تمام تفسیری عبارات امام ابن القیم کی مختلف تصانیف سے انتخاب کر کے یکجا کر دی ہیں۔جزاہ اللہ خیرالجزاء) دستیاب ہوئی۔ان تفسیری افادات کے مطالعہ سے اچھا خاصہ تفسیری ذوق پیدا ہو سکتا ہے اورسلف صالحین کے طریقہ کار کے دائرہ میں رہتے ہوئے فہم قرآن کا ذوق حاصل ہوسکتا ہے۔اللہ تعالیٰ اس حقیر کاوش کوقبول فرمائے اورتوشہ آخرت بنائے۔ [1] (مترجم)

[1] ماہنامہ محدث لاہور،اکتوبر ۱۹۹۵ء۔

سوانح حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ

۶۹۱ھ - ۷۵۱ھ

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (م ۷۲۸ھ) کے تلامذہ و مستفیدین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان کی مصروف اور داعیانہ زندگی اور ان کی موثر و بلند شخصیت کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ ان کے گرد تلامذہ و معتقدین کا ایک بڑا گروہ جمع ہے۔ لیکن ان کے تلامذہ میں ان کے مایہ ناز شاگرد اور ان کے علوم کے مرتب و ناشر حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کو جو امتیازی خصوصیت حاصل ہے وہ کسی دوسرے شاگرد کو حاصل نہیں ہوئی۔ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۶سال امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی شاگردی میں گزارے۔ اس مدت میں آپ نے جس تیزی کے ساتھ علوم متداولہ پر عبور حاصل کیا، وہ واقعی حیرت انگیز ہے۔ آپ زندگی بھر امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے شریک حال رہے۔

نام ونسب

محمد نام، ابوعبداللہ کنیت، شمس الدین لقب۔ والد کا نام ابوبکر بن ایوب تھا جو مدرسہ الجوزیہ کے قیم تھے۔ اس لیے ان کا عرف ابن القیم ہوگیا۔۶۹۱ھ میں پیدا ہوئے، دمشق آپ کا مولد ومسکن ہے۔ [1]

ابتدائی تعلیم

سب سے پہلے قرآن مجید حفظ کیا اس کے بعد اپنے والد اور دیگر اساتذۂ دمشق سے مروجہ علوم کی تحصیل کی۔

اساتذہ

آپ کے اساتذہ میں قاضی تقی الدین سلیمان، امام عیسیٰ بن مطعم، امام ابو بکر بن عبدالدائم رحمۃ اللہ علیہم جیسے ممتاز ائمہ کا نام آتا ہے۔ ان اساتذہ سے آپ نے

[1] البدایة والنهایة، ج ١٤ ص ٢٣٤۔

فقہ اور فتاویٰ میں تعلیم حاصل کی۔ مگر جس استاد سے آپ نے تمام علوم میں دسترس حاصل کی وہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی ذات ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ (م۷۷۴ھ) لکھتے ہیں:

''جب حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ۷۱۱ھ میں مصر سے واپس آئے۔ تو حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی ایسی صحبت اختیار کی کہ انتقال تک ساتھ نہ چھوڑا۔'' [1]

علمی مرتبہ

امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کا علمی مرتبہ بہت بلند تھا اور وہ ایک ممتاز مقام کے حامل تھے۔ تمام علوم تفسیر و حدیث، اصول تفسیر، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، معانی، لغت، تاریخ، ادب، اسماء الرجال، عربیت اور علم کلام میں کمال حاصل تھا۔

حافظ ابن رجب (م ۷۹۵ھ) لکھتے ہیں:

''تمام علوم اسلامیہ میں دخل تھا لیکن تفسیر میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ اصول دین میں بھی وہ درجہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ حدیث، فقہ حدیث اور دقائق استنباط میں ان کا کوئی ہمسر نہیں نظر آتا۔ فقہ اور اصول فقہ اور عربیت اور علم الکلام میں بھی کمال حاصل تھا۔ علم سلوک اور اہل تصوف کے ارشادات و دقائق پر بھی وسیع نظر تھی۔ میں نے قرآن و سنت کے معانی اور حقائق ایمانی کا ان سے بڑا عالم نہیں پایا۔ وہ معصوم تو نہ تھے لیکن میں نے ان خصوصیات میں ان جیسا آدمی نہیں دیکھا۔'' (طبقات الحنابلہ)

زہد وعبادت

آپ حد درجہ کے متقی اور عابد تھے۔ دن رات درس و تدریس ذکر و اذکار، تلاوت قرآن مجید اور تہجد میں گزارتے۔ تواضع، انکسار، حسن خلق میں ممتاز مقام

---

[1] البدایة والنهایة، ج ١٤ ص ٢٣٤۔

کے حامل تھے۔

حافظ ابن رجب لکھتے ہیں:

”ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کثیر العبادات اور بڑے شب بیدار تھے ان کی نماز بڑی طویل اور پُرسکون ہوتی تھی وہ ہر وقت ذاکر و شاغل رہتے تھے اور ان میں محبت الٰہی کا ایک جوش اور انابت کی ایک خاص کیفیت تھی۔ ان کے چہرے پر بارگاہ الٰہی کی طرف سے فقرو احتیاج اور عجزو انکسار کا نور نظر آتا تھا۔ اس کیفیت میں، میں نے ان کو بالکل منفرد پایا۔“(طبقات الحنابلہ)

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ محبت سب سے، حسد کسی سے بھی نہیں، نہ کبھی کسی کے درپے آزاد ہوئے۔ نہ کسی کی عیب جوئی کی، نہ کسی پر رشک۔ میں اکثر ان کے ساتھ رہا ہوں، وہ مجھ سے بہت محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہمارے زمانہ میں کوئی شخص ان سے زیادہ عبادت گزار ہو۔ ان کی نماز بڑی طویل ہوتی تھی۔ رکوع اور سجود بھی خاصے لمبے ہوتے تھے۔ بہت سے ساتھی اور دوست اس پر کبھی کبھی انہیں ملامت بھی کرتے۔ لیکن انہوں نے کوئی جواب دیا، نہ اس کو ترک کیا۔“

رحمه الله تعالىٰ۔ [1]

پروفیسر محمد ابوزہرہ مصری لکھتے ہیں:

"وان ابن القيم كان هادى الطبع قوى الخلق اخذعن شيخه علمه واخلاصه وايمانه، ولم تاخذ عنه حدّته۔" [2]

”امام ابن القیم بڑے پُرسکون اور بااخلاق تھے آپ نے اپنے استاد

[1] البداية والنهاية ج ١٤ ص ٢٣٥۔ [2] ابن تيمية حياته و عصره ص٥٢٧۔

سے ایمان، اخلاص اور علم کی تحصیل تو ضرور کی لیکن ان کی حدت اور تیزی کو اختیار نہیں کیا۔"

امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ، امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے صحیح جانشین اور ان کے علوم کے مرتب، حامل اور ناشر تھے

امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ صحیح طور پر اپنے استاد کے علم کے حامل، مرتب اور ناشر تھے اور صحیح معنوں میں آپ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔

۷۱۲ھ میں جب امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ مصر سے واپس آئے تو امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ ان سے وابستہ ہوگئے اور ۷۲۸ھ تک (۱۶سال) آپ ان کے ساتھ رہے۔

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے بہت زیادہ علم حاصل کرلیا۔ دن رات طلب علم کی دھن تھی۔ لہٰذا متعدد علوم وفنون میں یگانہ روزگار بن گئے۔" [1]

پروفیسر محمد ابو زہرہ مصری لکھتے ہیں:

"ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ صحیح معنی میں علم ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے حامل تھے اپنے استاد کے علم کو بڑھانے پھیلانے اور اس کی توسیع و اشاعت میں انہوں نے غیر معمولی حصہ لیا۔ اسی کی طرف انہوں نے دعوت دی۔ اسی کی جانب سے دفاع کیا اور اسی کی تائید کے لیے تحقیق و تنقیح کی پوری کوشش کی۔ جس چیز کی نشر و اشاعت پر انہوں نے بہت زیادہ توجہ کی وہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ تھی۔ مسئلہ طلاق پر انہوں نے ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے افکار و آراء کی خوب پشت پناہی کی۔" [2]

امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ ہر لحاظ سے ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے وفادار جانشین تھے۔

---

[1] البدایة والنهایة ج ١٤ ص ٢٣٤۔ [2] ابن تیمیه حیاته وعصرهٗ ص ٥٢٦۔

آپ نے اپنے استاد کے طرز نگارش کو اپنایا اور آپ نے اپنے استاد کے فتاویٰ اور اصول کی پوری حمایت کی۔

پروفیسر ابو زہرہ مصری لکھتے ہیں:

''جب امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کو طلاق اور شد رحال کے مسائل کے بارے میں فتووں کی بنا پر آخری مرتبہ قید کیا گیا تو آپ کے شاگردوں کو بھی نشانہ ستم بنایا گیا اور بعض کو سزا بھی دی گئی۔ بعض بھاگ نکلے، بعض کو عرصہ دراز کے لیے قید و بند کی صعوبتوں میں ڈال دیا گیا۔''

امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ اسی گروہ میں سے تھے۔ امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ دیگر حضرات کو آزاد کر دیا گیا۔ لیکن چونکہ آپ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگرد تھے اس لیے آپ کو خاص طور پر تکلیف دی گئی۔ [1]

امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کا مذہبی مسلک

امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ تقلید شخصی کے خلاف تھے۔ مسائل میں آپ کا میلان اپنے شیخ کی طرح امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ (م ۲۴۱ھ) کی طرف تھا۔ اصول اور عقائد میں آپ حنبلی المذہب تھے لیکن فروع میں آزاد تھے۔ [2]

علامہ عبدالحی بن العماد الحنبلی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۰۸۹ھ) نے اپنی کتاب شذرات الذہب میں آپ کو ''المجتہد المطلق'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ اجتہاد کی جملہ شرائط آپ کی ذات میں پوری تھیں۔ اسی لیے آپ کو کسی امام کی تقلید کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن بایں ہمہ آپ نے امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے کسی مسئلہ میں اختلاف نہیں کیا۔ بلکہ اپنی تمام عمر مسلک ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تائید و حمایت میں صرف کی۔

پروفیسر محمد ابو زہرہ مصری لکھتے ہیں:

فانه كان القائم على تركه شيخه من بعده من الحيث

---

[1] ایضاً [2] شذرات الذهب ج ٦ ص ١٨٦۔

التحرير والمجادلة والمناظرة وقد تلقى علم ابن تيمية واقتنع به ونشره ودعااليه وجادله عنه وحامى عليه وقد كان اخص نشره ودعا اليه الى فقهه فقد ناصرأرائه فى الطلاق وحرّر عبارات فى فتاويه و جمع كثير من اصوله۔ [1]

''امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ اپنے استاد کی وفات کے بعد تحریر، مجادلہ اور مناظرہ کے اعتبار سے اپنے شیخ کے علمی ترکہ کے وارث تھے۔ آپ نے ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے جملہ علوم کی تحصیل وتکمیل اورنشرو اشاعت کی۔ آپ نے ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال کی تائید وحمایت کی اور لوگوں کو ان میں غور وفکر کرنے کی دعوت دی۔ طلاق کے مسئلہ میں انہوں نے ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے عقیدہ کی تصدیق کی اور فتاویٰ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی حمایت میں عبارات تحریر کیں۔ بعینہٖ آپ نے اصول ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تدوین کی۔''

مسئلہ

طلاق کے مسئلہ میں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک جمہور علما کے خلاف تھا اور اس کے لیے کتاب وسنت اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے ان کے پاس دلائل تھے۔ قاضی القضاۃ تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ (م ۷۵٦ھ) اور دیگر علمائے مصر سے اکثر اس موضوع پر مناظر ہوئے۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعد طلاق کے مسائل میں حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ کے مسلک کو نہیں چھوڑا۔ قاضی تقی الدین سبکی کی طرف سے آپ کو بڑی تکلیفیں اور اذیتیں پہنچائی گئیں۔ آپ نے سب کچھ برداشت کیا لیکن اپنے مسلک پر سختی سے قائم رہے۔

---

[1] ابن تيمية حياته وعصره ص ٥٢٦۔

وفات

آخر اس نابغۂ روزگار اور عجوبۃ الدہر ہستی نے ۱۳ رجب ۷۵۱ھ کو رات کے وقت انتقال کیا۔ دوسرے دن ظہر کی نماز کے بعد آپ کی تدفین عمل میں لائی گئی اور دمشق میں باب الصغیر کے مقبرہ میں دفن ہوئے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ ورفع درجاتہ۔

امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خدمات

آپ کی تصنیفات کا تذکرہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ آپ کی تصانیف کی امتیازی خصوصیات کا ذکر کیا جائے۔ عام طور پر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ جس مصنف کی تصانیف کی تعداد زیادہ ہو اس میں تحقیق و تدقیق کا پہلو نہیں ہوتا۔ مگر حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف میں یہ چیز نہیں ہے۔ ان میں کمیت کے ساتھ ساتھ کیفیت کی بھی کمی نہیں۔ مشہور علوم متداولہ پر آپ کی کئی کتابیں ہیں اور ایک کتاب کئی جلدوں میں ہے۔ آپ نے ہر کتاب کو پورے دلائل کے ساتھ لکھا ہے۔ قرآن پاک کی آیات میں تدبر، احادیث و روایات پر کامل غور، دلائل کی ترتیب، زورِ بیان اور زبان میں ادبیت کی چاشنی ان کی تصانیف میں موجود ہے۔

علم حدیث اور لغت کے متعلق ایسے وقائق بیان کیے جو مطولات میں نہیں ملتے۔ مختصر عبارت میں طویل مطالب اور اس کے ضمن میں کئی دیگر فوائد جو ایک صاحب ذوق کو فریفتہ کر دیں، آپ کی خاص خوبی ہے۔

آپ کے نظریات و تصورات براہ راست کتاب و سنت کی مئے رانی سے کشید ہوئے اور اُن میں عربیت کا صحیح ذوق رچا ہوا ہے۔

آپ کی جملہ تصانیف فی الحقیقت تفقہ فی الدین کا خزانہ ہیں۔ جن کے ہاتھ اس خزانہ کی چابی آ گئی وہ دولت علم سے مالا مال ہو گئے۔ امام صاحب نے اپنی تصانیف میں اطلاقات کتاب و سنت، انوار مشکوٰۃ نبوت، افکار و تصورات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمہ تابعین رحمۃ اللہ علیہم کا جہاں کہیں علوم موضوعہ اور فنون مخترعہ سے تصادم

ہوا، وہاں ہر جگہ کتاب و سنت کی حمایت میں ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کتاب و سنت کے پرچم کو سرنگوں نہیں ہونے دیا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا ہی ذوق، دینی بصیرت اور دین میں ڈوبا ہوا اور سمویا ہوا ذہن عطا فرمایا تھا۔ کہ فلسفہ یونان اور عقل و رائے کے نئے انداز و اسلوب، جدید معانی و معارف اور ادبی و فنی قواعد کتاب و سنت کے مقابلہ میں قطعاً اثر انداز نہ ہو سکے۔ بلکہ آپ نے علوم و فنون کو کتاب و سنت کی تصریحات سے ہم آہنگ کیا۔

امام صاحب کی تصانیف کی خصوصیات

علمائے کرام اور ارباب سیر نے آپ کی تصانیف کی بہت تعریف کی ہے۔

پروفیسر محمد ابو زہرہ مصری مرحوم لکھتے ہیں:

> ''ابن القیم نے بہت بڑا علمی ذخیرہ چھوڑا ہے جو ایک طرف تو استاد (ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ) کے علم کا خلاصہ ہے اور دوسری طرف استاد کی تحقیقات کے نتائج و اثرات اور تنویعات و توجیہات ہیں۔'' [1]

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ''امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات حسن ترتیب اور تالیفی سلیقہ میں اپنے شیخ حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات سے بھی ممتاز تر ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی کتابوں میں تصوف کی حلاوت، عبارت کی سلاست اور دل آویزی زیادہ پائی جاتی ہے۔ یہ غالباً ان کے مزاج کا نتیجہ ہے جس میں جلال سے زیادہ جمال ہے۔'' [2]

ڈاکٹر محمد یوسف کوکن پروفیسر مدراس یونیورسٹی لکھتے ہیں:

> ''حافظ ابن القیم کی تقریر اور تحریر دونوں مرتب، مربوط اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھیں۔ ان کی اور امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات

[1] ابن تیمیہ حیاتہ و عصرہ ص ٥٢٦۔ [2] تاریخ دعوت وعزیمت ج ٢ ص ٣٨٠۔

میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات میں تکرار نہیں ہوتا تھا۔ امام موصوف (ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ) کی تصنیفات کا یہ حال نہیں ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے کہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کو حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کی طرح سکون اور اطمینان سے لکھنا نصیب نہ ہوا، وہ جو کچھ لکھتے تھے قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ وہ تھوڑے سے وقت میں مضامین اور خیالات کا ایک دریا بہا دیتے اور اس میں وہ اکثر ضمنی باتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیتے تھے۔ ان دونوں کی تصانیف پڑھنے سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا علم بہت وسیع اور گہرا تھا۔ ان کی تحقیق و تدقیق بہت زبردست تھی۔" [1]

تصانیف

حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات کی ایک طویل فہرست علامہ عبد الحی بن العماد الحنبلی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۰۸۹ھ) نے اپنی کتاب "شذرات الذهب فی اخبار من ذهب" جلد ۶ صفحہ ۱۷۰ پر دی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی کتاب "اغاثة اللهفان من مصائد الشيطان" صفحہ ۲۳ پر آپ کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کی ایک مفصل فہرست درج ہے۔

چند مشہور تصانیف کے اسماء درج ذیل ہیں:

1. اجتماع الجيوش الا سلامية على غزو المعطلة و الجهمية
2. اغاثة اللهفان فى حكم طلاق الغضبان
3. اعلام الموقعين عن رب العالمين
4. اغاثة اللهفان من مصائدالشيطان
5. امثال القرآن

[1] امام ابن تیمیة ، مطبوعة مدراس ص ۵۵۹۔

⑥ بدائع الفوائد

⑦ التبیان فی اقسام القرآن

⑧ تحفة الودود فی احکام المولود

⑨ تفسیر المعوذتین

⑩ تهذیب سنن ابی داود

⑪ جلاء الافهام فی الصلوٰة والسّلام علیٰ خیر الانام

⑫ الجواب الکافی لمن سأل عن الدواء الشافی [الداء والدواء]

⑬ حادی الارواح إلی بلاد الافراح

⑭ کتاب الصلوٰة وحکم تارکها

⑮ کتاب الروح

⑯ روضة المحبین ونزهة المشتاقین

⑰ زاد المسافرین الی منازل السماء

⑱ زاد المعاد فی هدی خیر العباد

⑲ شفاء العلیل فی حکم القضاء القدر والحکمة والتعلیل

⑳ الصواعق المرسلة علی الجهمیة والمعطلة

㉑ الطرق الحکمیة فی السیاسة الشرعیة

㉒ طریق الهجرتین و باب السعادتین

㉓ عدة الصابرین و ذخیرة الشاکرین

㉔ الفوائد "المشوق الی علوم القرآن و علم البیان"

㉕ الکافیة الشافیة فی الانتصار الفرقة الناجیة

㉖ مدارج السالکین بین منازل ایاك نعبد وایاك نستعین

㉗ مفتاح دارالسعادة و منشور ولایة اهل العلم والارادة

㉘ هدایة الحیاریٰ فی اجوبة الیهود والنصاریٰ

(29) الوابل الصيب ورافع الكلم الطيب أوالكلم الطيب والعمل الصالح

(30) الرسالة التبوكية

(31) التفسير القيم (مرتب: مولانا محمد اویس الندوی)

(32) الضوء المنير على التفسير (مرتب: على الحمد المحمد الصالحي)

(33) بدائع التفسير (مرتب: يسرى السيد محمد)

(34) تفسیری نکات و افادات (مرتب: مولانا عبدالغفار حسن)

یہی کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ کی سوانح پر لکھی جانے والی چند کتب:

(1) ابن القيم الجوزية ، حياته وآثاره۔ (بكر بن عبدالله أبوزيد)

(2) ابن القيم وموقفه من التقليد الإسلامی۔ (عوض الله جاد حجازی)

(3) ابن القيم الجوزية ، عصره و منهجه وآراؤه فی الفقه و العقائد والتصوف۔(عبدالعظيم عبدالسلام شرف الدين)

(4) منهج ابن القيم فی التفسير۔ (محمد احمد السنباطی)

(5) ابن القيم وحسّه البلاغی فی تفسير القرآن۔ (عبدالفتاح لاشين)

مولانا عبدالغفار حسن رحمانی عمر پوری

۱۳۳۱ھ - ۱۴۲۸ھ

افادات ابن القیم کو اردو قالب میں ڈھالنے کا کام مولانا عبدالغفار حسن نے کیا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں جن شخصیات سے دل سے محبت کی اور ان کے پیغام کو آگے بڑھایا ان میں حافظ ابن القیم الجوزیہ رحمۃ اللہ علیہ کا نام بھی آتا ہے۔ مولانا نے ان کی اکثر کتب کا مطالعہ کیااور اس میں سے جواہر پارے منتخب کرکے اردو دان طبقے کے لیے پیش فرمائے، یہ مضامین مختلف دینی مجلات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔آپ کی زندگی کے حالات مختصراً پیش کیے جاتے ہیں۔

آپ مولانا حافظ عبدالستار حسن کے ہاں ۱۶ شعبان ۱۳۳۱ھ(۲۰ جولائی ۱۹۱۳ء) کو ضلع رہتک میں پیدا ہوئے۔آپ نے درس نظامی کی مکمل طور پر تعلیم دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں حاصل کی۔ دسمبر ۱۹۳۳ء میں وہاں سے فراغت حاصل کی۔

نیز ۳۵ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضل ادب (عربی) اور ۱۹۴۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل (عربی) کے امتحانات پاس کیے۔

حصول تعلیم کے بعد مختلف تعلیمی اداروں میں تدریس کے فرائض انجام دیے،ان میں قابل ذکر درج ذیل ہیں:

مدرسہ رحمانیہ بنارس میں سات سال ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۲ء تک تفسیر و حدیث، ادب عربی اور دیگر علوم عربیہ اسلامیہ کی تدریس کے فرائض انجام دیئے۔

مدرسہ کوثر العلوم مالیر کوٹلہ (مشرقی پنجاب) میں اگست ۴۲ء سے مئی ۱۹۴۸ء تک دینی علوم کی تدریس اور خطابت کا مشغلہ جاری رہا۔

جون ۱۹۴۸ء سے اکتوبر ۱۹۶۴ء تک لاہور،سیالکوٹ،راولپنڈی،فیصل آباد، ساہیوال، کراچی میں تدریس،تربیت،دعوت وتبلیغ کا سلسلہ جاری رہا اور اس عرصہ میں فتویٰ نویسی کا مشغلہ بھی رہا۔

مولانا محترم اگست ۴۱ء سے مئی ۴۸ء تک جماعت اسلامی متحدہ ہندوستان سے وابستہ رہے اور جون ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۷ء تک جماعت اسلامی پاکستان کی رکنیت اختیار کی، اس دوران متعدد بار مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے، ۵۲ء میں جماعت کے فیصلے کے مطابق ارکان مجلس شوریٰ کے ایک وفد نے مشرقی پاکستان کا دعوتی دورہ کیا جس میں آپ بھی شریک تھے،دو مرتبہ بانی جماعت مولانا مودودی مرحوم ومغفور کی غیر حاضری میں امارت جماعت کی ذمہ داری بھی انجام دی۔ اس کے بعد ستمبر ۵۷ء میں طریق کار سے اختلاف کی بنا پر جماعت سے مستعفی ہوگئے۔

۱۹۵۳ء مارچ سے فروری ۵۴ء تک بسلسلۂ تحریک ختم نبوت گیارہ ماہ سیالکوٹ اور ملتان کی سرکاری تربیت گاہوں میں گزارے۔

اکتوبر ۱۹۶۴ء میں تدریس کے لیے اسلامی یونیورسٹی مدینہ طیبہ سے بغیر کسی درخواست کے بلاوا آ گیا، جہاں ۱۶ سال ۱۹۸۰ء تک حدیث، علوم حدیث اور اسلامی عقائد پر محاضرات (لیکچرز) دیئے۔

اسلامی یونیورسٹی کے ماتحت متعدد شعبوں میں سے مولانا نے کلیہ شرعیہ، کلیہ اصول الدین اورکلیہ حدیث میں تدریس اور محاضرات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۸۱ء سے ۸۵ء تک جامعہ تعلیمات اسلامیہ میں حدیث کی مشہور اور مستند کتاب صحیح بخاری اور دوسرے علوم اسلامیہ کا درس دیا۔ دو سال تک اعزازی طور پر مدیر تعلیم کی حیثیت سے جامعہ کے تعلیمی شعبوں کی نگرانی کی۔

۸۱ء سے اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن کی حیثیت سے اہم دینی مسائل کی تحقیق کا سلسلہ قرآن وسنت کی روشنی میں جاری رہا اورتقریباً نو سال تک رکنیت باقی رہی، اسی اثنا میں اسلام آباد منتقل ہوگئے، جہاں ضعف اور علالت کے باوجود علمی اور تدریسی اشغال کسی نہ کسی حد تک جاری رہے۔ یہاں تک کہ وقت مقررہ

آپہنچا اور ۴ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ (۲۲ مارچ ۲۰۰۷ء) کو اس دارفانی سے دار ابدی کا سفر اختیار کیا۔

اللهم ارحمه و عافه و اعف عنه و اجعله مع من أنعمت عليهم من النبيين والصديقين و الشهداء والصالحين، وحسن اولئك رفيقا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بسم اللہ کی لغوی توجیہ

سوال بسم اللہ سے پہلے کسی فعل کا ذکر کیوں نہیں کیا جاتا، یعنی ”ابدأ بسم اللہ“ کیوں نہیں کہا جاتا؟

جواب بسم اللہ کے عامل (فعل) کو چند فوائد کی بنا پر حذف کیا گیا ہے:

① یہ ایسا مقام ہے جہاں اللہ کے ذکر کے سوا اور کوئی چیز مقدم نہیں ہونی چاہیے۔ اگر پہلے فعل ذکر کیا جاتا تو بہر حال وہ فاعل کے ساتھ پہلے آتا، تو ایسی صورت میں اصل مقصود کے خلاف ہوتا۔

فعل کے حذف ہونے کی صورت میں لفظاً و معناً مشابہت ہوگئی۔ یعنی معنوی اور حقیقی طور پر، اللہ کی ذات ہر چیز پر مقدم ہے اسی طرح لفظاً ابتدا بھی اسی کے نام سے ہونی چاہیے ۔ جیسا کہ ہم نماز میں کہتے ہیں ”اللہ اکبر“یعنی ”من کل شيء“ اللہ ہر چیز سے بڑا ہے۔ لیکن ہم اس مقدر لفظ ”من کل شيء“ کو زبان پر نہیں لاتے تاکہ لفظ قلبی مقصود کے مطابق ہو جائے اور وہ یہ ہے کہ دل میں اللہ کے سوا اور کوئی نہ ہو۔ جب نمازی کا دل خالص اللہ ہی کی یاد سے بھرپور ہے تو پھر اسی طرح زبان پر بھی اسی کا نام آنا چاہیے۔

② فعل کے حذف ہونے کی صورت میں ہر قسم کی حرکات، اعمال و اقوال کو بسم اللہ کے ساتھ شروع کرنا درست ہوگا۔ کسی ایک فعل کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ اس بنا پر حذف فعل، ذکر فعل سے زیادہ عمومیت رکھتا ہے۔ کیونکہ آپ جو بھی فعل ذکر کریں گے محذوف بہرحال اس سے زیادہ وسعت رکھے گا۔

③ فعل کے حذف میں زیادہ بلاغت ہے۔ اس کلمہ ”بسم اللہ“ کا بولنے والا گویا یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ وہ مشاہدہ کی بنا پر فعل کے تلفظ سے بے نیاز ہے۔ اس لیے کہ مشاہدہ اور زبان حال بتلا رہی ہے کہ یہ کام اور باقی تمام افعال اللہ تعالیٰ

کے نام سے ہی وابستہ ہیں۔ اس لیے زبان حال کی طرف توجہ دلانا مقال کی طرف توجہ دلانے سے زیادہ بلیغ اور واضح ہے۔ [1]

[1] بدائع الفوائد: ۱/ ۲۵۔

سورۂ فاتحہ کے بعض اہم تفسیری نکات

سورۂ فاتحہ کئی اہم اور بنیادی مسائل کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اس سورت میں اللہ تعالیٰ کے تین نام بیان ہوئے ہیں جو کہ تمام اسمائے حسنٰی اور صفاتِ الٰہیہ کے مرکز ومحور قرار دیئے جاسکتے ہیں، وہ تین اسماء یہ ہیں۔ اللہ، رب اور رحمٰن۔

یہ سورت الوہیت، ربوبیت اور رحمت کا مظہر ہے۔ الوہیت کا مفہوم ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ ﴾ سے واضح ہوتا ہے۔ ربوبیت ﴿ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ ﴾ میں پنہاں ہے اور صفتِ رحمت ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ﴾ سے آشکار ہوتی ہے۔ پھر لفظ ''حمد'' ان تینوں اسماء پر حاوی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنی الوہیت، ربوبیت اور رحمت میں محمود اور قابل ستائش ہے۔

اس سورت میں آخرت، جزا اور سزا، اللہ تعالیٰ کے اس دن حاکم مطلق ہونے اور عدل کے ساتھ فیصلہ کرنے کا تصور بھی دیا گیا ہے جو کہ آیت ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ ﴾ سے واضح ہے۔

اس سورت میں نبوت و رسالت کا اثبات بھی مختلف پہلوؤں سے کیا گیا ہے۔

اولاً: اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کا رب ہے [1] وہ اپنے بندوں کو دنیوی اور اخروی

---

[1] یعنی ان کو لاتعداد نعمتوں سے پرورش کرنے والا ہے جن میں سے سب سے اعلیٰ اور ارفع نعمت قرآن اُتارنا، رسولوں کا بھیجنا اور اپنے بندوں کو نورِ ہدایت اور علم وحکمت سے سرفراز کرنا ہے اور اسی کی ذات اپنے علم، حکمت اور قدرت سے تمام جہانوں کی تدبیر کیے ہوئے ہے۔ اسی کی ذات حکیم وخبیر ہے اور اپنے تمام بندوں پر غالب ہے۔ اس کی ذات آسمان اور زمین کو مسخر کیے ہوئے ہے اور وہی اپنی قدرت سے زمین وآسمان کی کچھ چیزیں انسان کی نشوونما کے لیے مسخر کردیتا ہے۔ تاکہ وہ ترقی کے درجات طے کرتا ہوا انسانیت کے درجہ کمال تک پہنچ سکے اور رب کی نعمتوں اور اس کی بے پناہ رحمت کو یاد کرکے اس کا شکر بجالاتا رہے۔

اس کے ساتھ ساتھ آیات کونیہ میں سوچ بچار اور آیات علمیہ میں غور وتدبیر کرتے ہوئے اپنی روحانیت کے لیے تزکیہ اور تصفیہ کا سامان بہم پہنچاتا رہے۔ اس کی محبت اور لگاؤ کا مرکز صرف اللہ ہی کی ذات ہو کہ جس نے اپنے بے پناہ احسانات اور نعمتوں سے اسے (بقیہ اگلے صفحے پر)

مصالح بتائے بغیر نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کی صفت ربوبیت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ان تمام چیزوں سے آگاہ کرے اور ایسا نہ ماننے کی صورت میں اس کی اس صفت ربوبیت پر حرف آتا ہے۔

ثانیاً: ''اللہ'' کا لفظ ہی اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ بس اسی کی ذات قابل عبادت ہے اور ظاہر ہے کہ بندے اس کی عبادت کا طریقہ اسی کے بھیجے ہوئے رسولوں کے سوا اور کسی ذریعہ سے جان نہیں سکتے۔

ثالثاً: لفظ ''رحمٰن'' اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس کی صفتِ رحمت اپنے بندوں کو بے سہارا چھوڑ دینے اور کمال تک پہنچنے کے ذرائع سے بے خبر رکھنے کے منافی ہے۔ جو شخص لفظ ''رحمٰن'' کی حقیقت جان لیتا ہے، اس سے یہ بات مخفی نہیں رہتی کہ اس کی صفت رحمت بارش کے برسانے ، پودوں کے اُگانے اور بیج کے نکالنے سے زیادہ انبیا کے بھیجنے اور کتب سماویہ کے اتارنے کی مقتضی ہے۔ جسم سے زیادہ روح رحمت الٰہی کی محتاج ہے۔ جن لوگوں کے دل و دماغ پر پردے پڑ چکے ہیں وہ اس لفظ سے صرف جانوروں اور چوپاؤں کی زندگی ہی اخذ کرتے ہیں لیکن اہل فکرو دانش اصل حقیقت کی تہ تک جا پہنچتے ہیں۔

رابعاً: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ کے لفظ سے ظاہر ہے کہ یہ وہ دن ہے جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان کے اعمال کی جزا و سزا دے گا۔ انہیں ان کی نیکیوں پر ثواب اور برائیوں پر سزا دے گا لیکن اللہ تعالیٰ کسی پر حجت قائم کرنے سے پہلے گرفت نہیں کرتا اور یہ حجت اس کے رسولوں اور کتابوں سے قائم ہو چکی ہے اور انہی کی آمد کے بعد اس دن کی نوبت آئے گی کہ تمام نیکوکاروں کو نعیم ابدی سے نوازا جائے گا اور تمام گناہ گاروں کو دوزخ میں دھکیل دیا جائے گا۔

❁❁ نوازے رکھا اور دنیا وآخرت میں پاکیزہ زندگی عطا کی۔ تمام بندے اس لحاظ سے صرف اسی کے محتاج ہیں اور صرف اللہ ہی ایک بے نیاز ہستی ہے۔ عبودیت کے ان مظاہر کے ساتھ ایک مخلص بندہ برابر کمالات کے زینے طے کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اعلیٰ علیین میں نیکوکاروں کے ساتھ پاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس کی توفیق دے، آمین!

خامساً: ﴿ إِيَّاكَ نَعْبُدُ ﴾ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت وہی ہوسکتی ہے جس سے اللہ خود راضی ہو۔ جہاں تک اس کے شکر بجا لانے، اس سے محبت رکھنے اور اس کی خشیت طاری کیے رکھنے کا تعلق ہے تو عبادت کا یہ مفہوم معقول ہے۔ لیکن عبادت کے اصل طریقے کی معرفت اس کے رسولوں کے بغیر معلوم نہیں ہوسکتی۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عقل سلیم رسولوں کے بھیجے جانے کو اسی طرح تسلیم کرتی ہے، جس طرح کہ خود اللہ تعالیٰ کے وجود کو۔ اسی لیے رسول کا انکار کرنے والا درحقیقت رسول کا منکر نہیں ہوتا بلکہ مرسل یعنی اللہ تعالیٰ کا بھی منکر ہوتا ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے رسول پر ایمان نہ لانے کو اللہ پر ایمان نہ لانے کے ہم معنی قرار دیا ہے۔

سادساً: ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ کے جملے سے پتہ چلتا ہے کہ ہدایت، بیان اور راہنمائی کا نام ہے جس کے بعد توفیق الٰہی اور الہام کا درجہ آتا ہے۔ بیان اور راہنمائی کا حصول رسولوں ہی کے واسطے سے ہوسکتا ہے اور ایسا ہونے کے بعد خدائی توفیق شامل حال ہو جاتی ہے۔ ایمان دل میں جاگزین ہو جاتا ہے اور اسی کا ایک جزو بن جاتا ہے۔

درحقیقت یہ دو الگ الگ ہدایتیں ہیں جن کے بغیر دنیا و آخرت میں کامیابی و کامرانی حاصل نہیں ہوسکتی اور جن کے حصول کے بعد ہی انسان حق کے مدارج کو تفصیلی طور پر جان لیتا ہے اور کھلے، چھپے اسی کا ہو رہتا ہے۔ اس کے تمام اعمال، تمام ارادے، تمام اقوال تاحیات دائرہ حق سے باہر نہیں نکلتے۔

یہاں اس بات کی ضرورت بھی معلوم ہوتی ہے کہ انسان کو ہر حال میں ہدایت پانے کی دعا کیوں کرتے رہنا چاہیے اور کہنے والوں کے اس قول کا بودا پن بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہدایت یافتہ ہوتے ہوئے بھی ہدایت کے طلب گار کیوں رہیں؟

وہ اس طرح کہ ہمارے علم میں آئی ہوئی حق باتوں کے مقابلہ میں ایک

بڑا حصہ ہمارے لیے نامعلوم ہے اور ایسی باتوں کا تو شمار ہی نہیں جنہیں ہم مجمل طور پر جانتے ہیں لیکن تفاصیل سے بے خبر ہیں۔ الغرض ہم مکمل ہدایت کے محتاج ہیں۔ یہ تمام امور کسی کو حاصل ہو بھی جائیں تو اس کا ہدایت کے لیے سوال کرنا ہدایت پر قائم و دائم رہنے کے لیے ہوتا ہے۔

ہدایت کا سب سے آخری مرتبہ قیامت کے دن جنت تک پہنچنے کے لیے پل صراط کو بآسانی پار کرنے کی ہدایت مانگنا ہے۔ اسی لیے جس شخص کو دنیوی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسولوں اور کتابوں کی معرفت، صراطِ مستقیم کی ہدایت ہوگئی۔وہ یقیناً آخرت میں پل صراط کا رستہ بھی پالے گا اور جس قدر وہ اس دنیا میں اللہ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر ثابت قدم رہا ہوگا،اسی قدر آخرت میں جہنم کے اوپر قائم کیے ہوئے پل صراط پر وہ ثابت قدم رہے گا اور جس تیزی سے وہ دنیا میں اس راستے کے نشیب و فراز سے گزرتا چلا گیا ہے اسی تیزی سے وہ پل صراط بھی پار کر لے گا۔ کئی تو ایسے ہوں گے جو بجلی کی طرح اسے پار کر جائیں گے اور کئی آنکھ جھپکنے کے وقفہ میں ، کئی ہوا کے ایک جھونکے کی طرح تو کئی سواری کی مانند، کئی دوڑتے نظر آئیں گے تو کئی معمولی چال چلتے ہوئے ، کئی گھٹنوں کے بل چلتے ہوں گے تو کئی لنگڑاتے ہوئے اور کئی بیڑیاں پہنے ہوئے رینگتے نظر آئیں گے۔

غرضیکہ بندہ اس دنیا میں اپنی چال ڈھال سے آخرت کے ان مراحل کا بآسانی اندازہ کرسکتا ہے اور یہی عادلانہ فیصلہ ہے۔

﴿ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝ ﴾ (۲۷/ النمل:۹۰)

''تمہارے کیے کا بدلہ ہی تمہیں دیا جائے گا۔''

بندے کو یہ دیکھتے رہنا چاہیے کہ وہ کون سے شکوک وشبہات ہیں جو اس دارفانی میں اس کے رستے کی آڑ بنے ہوئے ہیں۔کیونکہ یہی بندھن قیامت کے دن پل صراط کے دونوں طرف آہنی کنڈوں کی طرح اسے نوچتے اور آڑے آتے

دکھائی دیں گے۔

﴿ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ۝ ﴾ (٤١/ فصلت: ٤٦)

''اور تیرا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔''

الغرض طلبِ ہدایت ہر خیر کے حصول اور ہر شر سے سلامتی کو سموئے ہوئے ہے۔

سابعاً: نفس مسئول یعنی صراط مستقیم کی معرفت سے پتہ چلا کہ ایک راستہ ''صراط'' تب ہی ہوسکتا ہے جبکہ اس میں یہ پانچ امور پائے جائیں: استقامت، منزل مقصود تک پہنچانا، اس کا قریب ہونا، گزرنے والوں کے لیے اس کا کافی وسیع ہونا، منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے اس کا تعین ہونا۔ لفظ صراط میں یہ پانچوں باتیں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

اس کی صفت استقامت سے اس کا قریب ہونا سمجھ میں آتا ہے کیونکہ خط مستقیم دو نقطوں کے درمیان قریب ترین خط مانا گیا ہے۔ ذرا سا بھی ٹیڑھا پن اسے لمبا کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس کی صفت استقامت سے اس کا منزل مقصود تک پہنچانا ظاہر ہوتا ہے اور پھر اس کا تمام خلائق کے لیے نصب کیا جانا اس کی وسعت وہمہ گیری کا تقاضا کرتا ہے اور اس کا یہ وصف کہ یہ راستہ انعام کیے گئے لوگوں کا ہے، گمراہ اور مغضوب علیھم کا نہیں، اس بات کا یقین کرتا ہے کہ یہ راستہ ہی درحقیقت سیدھا اور سچا راستہ ہے۔

صراط کی اضافت کبھی اللہ کی طرف جاتی ہے کیونکہ وہی اس کا نصب کرنے والا ہے جیسا کہ فرمایا گیا:

﴿ وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا ﴾ (٦/ الانعام: ١٥٣)

''اور یہ میرا سیدھا راستہ ہے۔''

ایک دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ ﴾ (٤٢/ الشوریٰ: ٥٢)

"اور (اے رسول ﷺ!) تم اللہ کے سیدھے راستے کی طرف بلاتے رہو۔"

کبھی اس کی اضافت بندوں کی طرف جاتی ہے جیسا کہ سورۂ فاتحہ میں بیان ہوا اور یہ اس لیے کہ بندے ہی اس پر چلیں گے، انہی کے لیے وہ نصب کیا گیا اور وہی اس پر گزرنے والے ہیں۔

ثامناً: "منعم علیھم" کے ذکر اور "مغضوب علیھم" اور "ضالین" کے گروہ سے انہیں ممیز کرتے ہوئے، لوگ حق کی معرفت اور اس پر عمل کرنے کے لحاظ سے ان تین فرقوں میں تقسیم کیے گئے ہیں اور وہ اس طرح کہ انسان یا تو حق کی معرفت رکھتا ہوگا یا نہیں اور پھر حق کی معرفت رکھنے والا یا تو اس پر عامل ہوگا یا اس کا مخالف ہوگا۔

کوئی بھی مکلف فرد ان تین اقسام سے باہر نہیں ہوسکتا اس لیے حق کی معرفت رکھنے والا عالم باعمل شخص "منعم علیھم" کے گروہ میں سے ہے۔ یہ شخص مفید علم اور نیک عمل کے ساتھ اپنے نفس کا تزکیہ کرتا رہتا ہے۔

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا﴾ (۹۱/ الشمس: ۹)

"جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا وہ کامیاب ہوگیا۔"

حق کی معرفت رکھنے والا عالم لیکن عمل سے محروم ہوائے نفس کا تابع شخص "مغضوب علیھم" کی فہرست میں داخل ہوتا ہے۔ رہا حق کی معرفت سے کورا شخص تو اس کا شمار "ضالین" (گمراہوں) میں ہوگا۔ "مغضوب علیہ" شخص عمل کی ضلالت (گمراہی) کے باعث ضال بھی ہے اور ضال شخص عمل کی راہ دکھانے والے علم سے محرومی کے باعث "مغضوب علیھم" میں بھی شمار ہوتا ہے۔ غرضیکہ ان دونوں میں سے ہر ایک پر ضال اور "مغضوب علیہ" کا وصف صادق آتا ہے۔ مگر یہ کہ معرفت حق کے بعد عمل میں کوتاہی کرنے والا غضب کا زیادہ مستحق ہے۔ اسی لیے یہود کے بیان میں بار بار اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ایک جگہ

ارشاد ہوا:

﴿ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ ﴾ (۲/ البقرۃ:۹۰)

''انہوں نے اللہ کے اتارے ہوئے (اوامر ونواہی) کے انکار کو اپنی جانوں کے بدلے خرید کر کیا ہی برا سودا کیا ہے۔ صرف اپنی اس سرکشی کی بنا پر کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے (وحی) اتارتا ہے۔ اس لیے وہ اللہ کے غضب پر غضب کا شکار ہوئے۔''

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

﴿ قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ۝ ﴾ (۵/ المائدۃ:۶۰)

''کہہ دیجیے کہ کیا میں تمہیں بارگاہ الٰہی میں اس سے بھی زیادہ شرانگیز سزا (پانے والوں) کے متعلق بتاؤں؟ وہ لوگ جو اللہ کی لعنت اور غضب کے مستحق ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں سے کچھ (لوگوں کو) بندر، سؤر اور عباد باطل بنا ڈالا، یہ لوگ سیدھی راہ سے ہٹے ہوئے بدترین جگہ والے ہیں۔''

حق سے ناآشنا، لقب ضال کا زیادہ مستحق ہے۔ اس لیے اس آیت میں نصاریٰ کو اس لقب سے یاد کیا گیا:

﴿ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ۝ ﴾

(۵/ المائدۃ:۷۷)

”کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب! سوائے حق بات کے اپنے دین میں تجاوز نہ کرواور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی مت کرو جو پہلے خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا اور سیدھے راستے سے بھٹکتے رہے۔“

اس آیت میں خطاب نصاریٰ سے ہے جنہیں یہود کی پیروی سے منع کیا گیا ہے۔

بحوالہ جامع الترمذی اور صحیح ابن حبان، حضرت عدی بن حاتم راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”یہود مغضوب علیھم ہیں اور نصاریٰ ضالین“۔ [1]

”منعم علیھم“ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں معرفت حق حاصل ہوئی اور پھر اس پر عمل پیرا ہوئے اور ”مغضوب علیھم“ جو کہ حق جان لینے کے بعد بھی اپنی خواہشات کے تابع رہے اور ضالین جو کہ حق سے نا آشنا رہے۔ ان تینوں اقسام کے ذکر سے بھی رسالت اور نبوت کا ثبوت ملتا ہے کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ لوگ ان تین فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور درحقیقت رسالت ہی اس تقسیم کا باعث ہوئی ہے۔ [2]

---

[1] سنن الترمذی ٥/ ٢٠٤ (٢٩٥٤) تفسیر القرآن: باب (ومن سورة فاتحة الكتاب) مسند احمد ٤/ ٣٧٨، موارد الظمآن: ١٧١٥، ابوداود الطيالسی: ١٠٤٠۔

[2] مدارج السالكين: ١/ ٧-٣۔

تفسیر سورۃ الفاتحہ

سورۂ فاتحہ توحید کی تینوں قسموں کو شامل ہے جن پر تمام انبیائے کرام کا اتفاق رہا ہے۔

توحید کی اقسام

توحید کی دو قسمیں ہیں:

① توحید علمی، یعنی علم واعتقاد میں توحید۔

② توحید ارادی، یعنی قصد وارادہ میں توحید۔

توحید ارادی کی بھی دو قسمیں ہیں:

① توحید ربوبیت ② توحید الوہیت

یہ کل ملا کر تین قسمیں ہوئیں۔ توحید عملی کا مدار، صفات کمال کے اثبات، تشبیہ وتمثیل کی نفی اور عیوب ونقائص سے براءت پر ہے۔ اس چیز کا سورۂ فاتحہ میں اجمالاً اور تفصیلاً دونوں طرح بیان ہوا ہے۔ اجمالاً اس طرح کہ حمد کو اللہ کے لیے ثابت کیا گیا ہے اور تفصیلاً اس طرح کہ صفت ربوبیت، الوہیت رحمت اور مالکیت الٰہی کے لیے ذکر کی گئی ہیں۔ اب اس بات کی تفصیل کہ حمد کس طرح توحید علمی کو شامل ہے، ذیل کے بیان میں ملے گی۔

حمد کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کمالی وجلالی صفات کے اعتراف کے ساتھ ذاتِ محمود کی مدح اس طرح کرے کہ اس سے محبت، خوشنودی اور اطاعت کا پہلو نمایاں ہو جائے۔ اُسے ہرگز حامد (تعریف کرنے والا) نہیں کہا جاسکتا جو محمود کی صفات کا منکر ہو یا اس کی محبت واطاعت سے دل خالی ہو۔ جس قدر ممدوح کی کمالی صفات زیادہ ہوں گی اسی قدر اس کی حمد بھی کامل تر ہوگی۔ جتنی کمالی صفات میں کمی ہو گی۔ اتنی ہی حمد بھی ناقص ہوگی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات، کمال اور کثرت کے اعتبار سے بے نظیر ہیں۔ ان کا شمار بھی طاقت انسانی سے باہر ہے۔ اس لیے ہر قسم

کی حمد بھی اسی کے لیے سزاوار ہے، کوئی دوسرا اس کا مستحق نہیں ہوسکتا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے کفار کے اِلٰہ (معبودوں) سے کمالی صفات کی نفی کرتے ہوئے ان کی مذمت کی ہے کہ نہ وہ سن سکتے ہیں، نہ بول سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ ہدایت کرسکتے ہیں اور نہ نفع ونقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اس سے فرقہ جہمیہ کا بھی رد ہوگیا جو اللہ تعالیٰ کو صفت کمال سے خالی مانتا ہے۔

قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ گفتگو نقل کی ہے جو ان کے باپ سے ہوئی تھی:

﴿ يَٰٓأَبَتِ لِمَ تَعۡبُدُ مَا لَا يَسۡمَعُ وَلَا يُبۡصِرُ وَلَا يُغۡنِي عَنكَ شَيۡـٔٗا ﴾

(۱۹/ مریم: ٤٢)

''اے میرے پیارے باپ! ان بتوں کو کیوں پوجتے ہو جو نہ سن سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ تمہیں کچھ بھی بے نیاز کرسکتے ہیں۔''

اگر ابراہیم علیہ السلام کا ربّ بھی واقعتًا ایسا ہی ہوتا تو آزر یہ جواب دے سکتا تھا کہ تم بھی تو ایسے ہی اللہ کو مانتے ہو۔ یہ آزر، جہمیہ سے کہیں زیادہ اللہ کو پہچانتا تھا۔

اسی طرح کفار قریش اپنے شرک کے باوجود صفاتِ الٰہیہ کے اقراری تھے، قرآن میں ہے:

﴿ وَٱتَّخَذَ قَوۡمُ مُوسَىٰ مِنۢ بَعۡدِهِۦ مِنۡ حُلِيِّهِمۡ عِجۡلٗا جَسَدٗا لَّهُۥ خُوَارٌۚ أَلَمۡ يَرَوۡاْ أَنَّهُۥ لَا يُكَلِّمُهُمۡ وَلَا يَهۡدِيهِمۡ سَبِيلًاۘ ﴾ (۷/ اعراف: ١٤٨)

''موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے اس کے بعد اپنے زیوروں کا ایک بچھڑا (بطور معبود) بنا لیا۔ کیا وہ دیکھتے نہیں ہیں کہ نہ وہ ان سے بولتا ہے اور نہ ان کو راہ بتاتا ہے۔''

اگر ساری دنیا کا اللہ بھی ایسا ہی ہے تو پھر یہود پر اس اعتراض کے کچھ معنی نہیں رہتے۔

اللہ کی صفت کلام

سوال کیا اللہ بندوں سے کلام کرتا ہے؟

جواب ہاں کرتا ہے، کسی سے پس پردہ بلاواسطہ کلام کرتا ہے۔جیسا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوا، کسی سے بواسطہ جبرئیل علیہ السلام ہم کلام ہوتا ہے۔جیسا کہ دوسرے انبیا کی مثال ملتی ہے اورتمام بندوں سے بواسطہ انبیائے کرام علیہم السلام گفتگو کرتا ہے انبیائے کرام علیہم السلام اس کے کلام کو بندوں تک پہنچاتے ہیں۔اسی لیے سلف نے کہا ہے کہ جس نے اللہ کی صفتِ کلام کا انکار کیا۔اس نے دراصل تمام رسولوں کی رسالت ہی کا سرے سے انکار کردیا۔صفات کمال کی نفی الوہیت کے بطلان کی دلیل ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا آیت سے ظاہر ہے۔

کتب سماویہ اورعقول سلیمہ کا یہ فیصلہ ہے کہ جو ہستی صفات کمال سے خالی ہے وہ رب، الٰہ اور مدبر نہیں ہوسکتی۔وہ کسی طرح دنیا وآخرت میں حمدوثنا کی سزاوار نہیں ہوسکتی۔کسی ذات کی حمدوثنا سلب محض اورنفی خالص کی بنا پر نہیں ہوتی۔ہاں اگر سلب وانکار عیوب کے ساتھ ساتھ صفات کمال کے ثبوت کی طرف بھی اشارہ ہو تو پھر حمد کی جاسکتی ہے۔اللہ تعالیٰ کی حمد اس کا بیٹا نہ بنانے پر اس لیے ہوگی کہ وہ صمد، غنی اورآسمان وزمین کا بلاشرکت غیرے بادشاہ ہے اورنہ سونے کی سلبی صفت اس لیے محمود ہوگی کہ یہ اس کی قیومیت کے کمال کو شامل ہے۔یہی حال دوسری صفات کا ہے۔

خلاصہ فصل

اب تک تو اس بات کا بیان تھا کہ اسماء اورصفات کی توحید پر حمد کی دلالت کس طرح ہوسکتی ہے۔اب یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ، رب، رحمان، رحیم، مالک، یہ پانچ نام تمام اسماء اورصفات پر کیسے مشتمل ہیں، اس کی بنیاد دو قاعدوں پر ہے:

① اللہ تعالیٰ کے اسماء اس کی صفات کو بتلاتے ہیں۔یعنی یہ بظاہر اسماء ہیں لیکن

معنی کے اعتبار سے یہ صفات ہیں۔ان اسماء کو بلامعنی ماننا درست نہیں۔

② جس طرح ان اسماء سے ذات اور صفت کا پتہ چلتا ہے اسی طرح ضمنی طور پر صرف ذات یا صرف صفت کو بھی ظاہر کرتے ہیں اور لزوماً دوسری صفات کا علم بھی ہوتا ہے۔ مثلاً: سمیع کی دلالت ذات الٰہی اور سمع (سننا) پر دلالت مطابقی ہے اور صرف ذات یا صفت سمع پر تضمنی ہے اور حیات پر لزومی ہے۔ کیونکہ جو سمیع (سننے والا) ہوگا وہ یقیناً زندگی رکھتا ہوگا۔اسی لزوم کو سمجھنے میں لوگوں کے درمیان اختلاف پڑ جاتا ہے کیونکہ تمام کے ذہن برابر نہیں ہیں۔

خلاصہ فصل

ان دونوں قاعدوں کے ثبوت کے بعد یہ امر صاف ہے کہ اسم اللہ تمام اسمائے حسنٰی اور صفات عالیہ کو گھیرے ہوئے ہے۔اس لیے کہ لفظ اللہ صفت الوہیت کو بتلاتا ہے۔جو کہ الوہیت کی تمام صفات کو احاطہ کیے ہوئے ہے اور تشبیہ، مثال اور نقائص وعیوب سے پاک ہے۔یہی صفات الوہیت اور صفات کمال ہیں۔ اسی بنا پر تمام اسمائے حسنٰی کا سرچشمہ اسی اسم معظم ''اللہ'' کو قرار دیا جاتا ہے،جیسا کہ فرمایا:

﴿ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ﴾ (۷/ أعراف:۱۸۰)

''اللہ ہی کے لیے اچھے نام ہیں۔''

اسی طرح کہا جاتا ہے کہ رحمٰن ورحیم، ملک، قدوس،عزیز وغیرہ اللہ کے نام ہیں۔یہ نہیں کہا جاتا کہ اللہ رحمٰن کے ناموں میں سے ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ اسم اللہ سے تمام اسمائے حسنٰی کے معانی کا اجمالی طور پر پتہ چلتا ہے۔باقی اسمائے حسنٰی سے ان صفاتِ الوہیت کا تفصیلی علم حاصل ہوجاتا ہے۔جن پر اسم اللہ مشتمل ہے۔ اسم اللہ ذاتِ الٰہی کے مألوہ (معبود) ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ مخلوق، صائب وحوادث میں اسی کی طرف رجوع کرتی ہے اور اسی کی محبت، تعظیم اور اطاعت کے جذبہ سے سرشار رہتی ہے۔اس سے اس کی صفتِ ربوبیت ورحمتِ

کاملہ کا پتہ لگتا ہے۔ پھر ان دونوں سے اس کی صفت ملکیت (بادشاہت) کا علم حاصل ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی الوہیت، ربوبیت، رحمانیت اور مالکیت ہی تمام صفات کاملہ کا سرچشمہ ہیں۔ یہ بات ناممکن ہے کہ ایک ذات سمیع وبصیر، حیی، قادر، متکلم اور فعّال لما یرید نہ ہوتے ہوئے بھی ان صفات خمسہ سے متصف ہو۔

اب صفات کی تقسیم اس طرح ہوسکتی ہے کہ صفاتِ جلال و جمال سب کی سب لفظ اللہ سے ماخوذ ہیں اور صفات فعل قدرت اور نفع پہنچانے، دینے لینے میں مختارانہ حیثیت کی صفت کا تعلق صفت رب سے ہے، اور صفات احسان وکرم، مہربانی، شفقت کا سرچشمہ اس کی صفت رحمت ہے۔ اس صفت کو رحمٰن اور رحیم دو صیغوں کی صورت میں لایا گیا ہے۔ رحمٰن ورحیم میں فرق دو وجہوں سے ہے:

① رحمٰن کے معنی ہیں جس کے لیے صفتِ رحمت ثابت ہے اور رحیم سے یہ دکھلانا مقصود ہے کہ رحمت کا اثر بندوں تک پہنچ چکا ہے۔ فرمایا:

﴿ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا ﴾ (۳۳/ أحزاب:۴۳)

''اور وہ مومنوں پر رحیم ہے۔''

﴿ إِنَّهُ بِهِمْ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۱۷)

''بیشک اُن پر وہ شفقت والا مہربان ہے۔''

② رحمان کا وزن فعلان اس بات کو بتلانے کے لیے آتا ہے کہ صفت مطلوبہ، موصوف کے اندر پوری کثرت ووسعت کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ مثلاً غضبان اُس شخص کو کہتے ہیں جو غصہ سے بھرپور ہو۔ اسی طرح سکران وہ ہے جو نشہ میں چُور ہو، اسی طرح ندمان، حیران، لھفان یہ الفاظ اس شخص پر بولے جاتے ہیں جو سرتاپا ندامت، حیرت، اور افسوس بنا ہوا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ دیکھتے ہیں کہ استواء علی العرش (عرش پر متمکن ہونا) کے بیان کے ساتھ اکثر صفت رحمٰن کا ذکر ہے۔ فرمایا:

﴿ الرَّحْمَٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَىٰ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۵)

﴿ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ ﴾ (۲۵/ الفرقان: ۵۹)
یعنی وہ اپنے عرش پراپنی صفتِ رحمانیت کے ساتھ مستوی ہوگیا۔
اس کا عرش بھی تمام مخلوقات کو گھیرے ہوئے ہے اوراس کی رحمت
بھی ساری کائنات پرچھائی ہوئی ہے۔

جیسا کہ فرمایا:

﴿ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ ﴾ (۷/ أعراف :۱۵۶)
''میری رحمت ہر شے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔''

نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ اپنی وسیع ترین مخلوق عرش پراپنی وسیع ترین صفتِ رحمت کے ساتھ مستوی ہوگیا۔

صحیح بخاری کی روایت ہے:

''جب اللہ تعالیٰ مخلوق کو پیدا کرچکاتواس نے کتاب میں لکھا اوروہ کتاب اس کے پاس عرش پر ہے۔''

((اِنَّ رَحْمَتِيْ غَلَبَتْ غَضَبِيْ)) [1]

''بیشک میری رحمت میرے غصہ پرغالب ہے۔''

غور کریں اس کتاب میں رحمت کا اوراس کے عرش پر رکھے جانے کا بیان ہے۔اب اس حدیث اوران دوآیتوں میں مطابقت اورمناسبت آپ خود معلوم کرسکتے ہیں۔

فرمایا:

﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝ ﴾ (۲۰/ طه:۵)
﴿ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا ۝ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۵۹)

اس انداز سے غور کرنے سے معرفت الٰہی کاایک بہت بڑا دروازہ آپ کے سامنے کھل جائے گا۔

---

[1] صحیح البخاری ۳/ ۱۱۶۶ (۳۰۲۲) بدء الخلق۔

صفت مالکیت یا ملکیت

اللہ تعالیٰ کی صفت ملکیت کے ماتحت یہ صفات آتی ہیں۔عدل،قبض (سکیڑنا)بسط (پھیلانا)خفض (پست کرنا)رفع (بلند کرنا)اِعطاء،منع،اعزاز(عزت بخشنا)اِذلال(ذلت دینا)قہر(غالب ہونا)حکم(فیصلہ کرنا)۔

یوم الدین

اس کی صفت ملکیت کو یوم الدین(جزا کا دن)کے ساتھ خاص کرنے کی دو وجہیں ہیں:

① اس دن اس کے سوا کسی اور کا حکم جاری نہ ہو سکے گا۔

② دراصل وہی الیوم الحق (حقیقی دن)ہے۔اس سے پہلے جوکچھ بھی ہے، اس کی مدت ایک ساعت سے زیادہ نہیں۔

③ یہ یوم جزا اصل منزل مقصود ہے۔اس سے قبل جوکچھ ہے اس کی حیثیت سفری پڑاؤ اورعارضی ٹھہراؤ کی سی ہے۔

خلاصہ فصل

اللہ کے یہ تینوں نام اللہ،رب،رحمٰن اس کی صفت واَمر کے ساتھ گہرا ربط اورتعلق رکھتے ہیں۔انہی صفات نے مخلوق کو ایک لڑی میں پرودیاہے اورانہی کی وجہ سے ان میں جدائی پڑگئی ہے۔اسم رب کا مفہوم تمام مخلوقات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔کیونکہ وہ ہر شے کا رب وخالق ہے کوئی چیز اس کی قدرت اورربوبیت سے باہرنہیں ہے۔اسم رب سے پوری مخلوقات جمع ہوگئیں اوراسم اللہ سے افتراق پیدا ہوا۔جنہوں نے اللہ کو معبود مان لیااورخوف،محبت،اطاعت،انکساراورعاجزی کا مرکزانہی کوٹھہرایاوہ ایک فرقہ بن گئے اورجنہوں نے اس کاانکارکیاوہ دوسرے فرقہ میں شامل ہو گئے۔ ایک فریق جنت کا مستحق ہوا اور دوسرا جہنم کا سزاوار۔ دین، شریعت، امر، نہی ان کاقیام اللہ کی صفت الوہیت کی بنا پرہے اور خلق، ایجاد،

تدبیر وفعل ان کا تعلق صفت ربوبیت سے ہے۔اسی طرح ثواب، عقاب، جنت، نار کا دارومدار صفت ملکیت (بادشاہت) پر ہے۔اس کا امر صفتِ الوہیت اور توفیق وہدایت، ضلالت، صفت ربوبیت اور جزا وسزا صفت ملکیت کے ماتحت ہے۔ان صفات کا باہمی اتنا گہرا ربط ہے کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتیں۔

صفت رحمت کی لطیف تشریح

صفت رحمت بندوں اور اللہ کے درمیان تعلق اور ربط کا نام ہے۔ بندوں کا فرض ہے کہ وہ اس کی الوہیت کے تقاضوں کو پورا کریں اور اللہ کا ذمہ ہے کہ وہ اپنی ربوبیت کے اثرات سے ان کو نوازے۔یہ رحمت ایک رسی ہے جو بندوں کا رشتہ اللہ سے جوڑ دیتی ہے۔اسی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجے، کتابیں اتاریں، ان کو ہدایت بخشی اور دارِ ثواب (جنت) میں ان کا ٹھکانا بنایا اور اسی کی بدولت رزق، عافیت اور نعمت کی بارش برسائی۔بندوں کی طرف سے عبودیت (بندگی) ہے اور اللہ کی جانب سے رحمت ہے۔یہاں پر صفت ربوبیت اور رحمت کا ذکر یکجا اسی طرح ہے جس طرح استواء علی العرش کا بیان الرحمٰن کے ساتھ ہے۔﴿الرحمن علی العرش استویٰ، رب العالمین، الرحمن الرحیم﴾ کے بالکل مطابق ہے۔

ربوبیت اور رحمت دونوں صفتوں کے اثرات عالمگیر ہیں دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو ان سے خالی ہو۔لفظ رب العالمین سے اللہ کی بلندی، فوقیت بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ ہر مخلوق سے بالا و برتر ہے۔

خلاصہ فصل

حمد کے بعد ان اسماء (اللہ، رب، رحمٰن، ملک) کا ذکر اس بات کو بتلا رہا ہے کہ اللہ اپنی الوہیت، ربوبیت ورحمانیت، ملکیت میں سے ہر ایک کے لحاظ سے محمود ہے۔ اس طرح اس کے لیے ہر قسم کا کمال ثابت ہوجاتا ہے۔ان میں سے ہر نام

الگ الگ بھی اس کے کمال کو بتلاتا ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بھی صفت کمال کو ایک انداز سے ظاہر کر دیتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

﴿ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴾ (٦٤/ التغابن : ٦)

﴿ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴾ (٤/ النساء : ٢٦)

﴿ وَاللّٰهُ قَدِيرٌ ﴾ (٦٠/ الممتحنة : ٧)

﴿ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾ (٢/ البقرة : ٢١٨)

غنی بھی صفت کمال ہے اور حمد بھی صفت کمال۔ پھر ان دونوں کی یکجائی بھی ایک کمال ہے۔ اس طرح علم وحکمت ان میں سے دو الگ الگ مستقل کمال ہیں اور دونوں کی معیت بھی کمال ہے۔ یہی حال مغفرت، قدرت اور غفور اور علم وحلم کا ہے۔ فرمایا:

﴿ فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيرًا ﴾ (٤/ النساء:١٤٩)

﴿ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴾ (٢٤/ النور:١٨)

حاملین عرش چار ہیں ان میں سے دو کہا کرتے ہیں:

"سبحانك اللهم وبحمدك لك الحمد على حلمك بعد علمك۔"

"اے اللہ تو پاک ہے ہم تیری تعریف کرتے ہیں۔ تیرے لیے حمد ہے تیرے حلم پر تیرے علم کے بعد۔"

اور دو کہا کرتے ہیں:

"سبحانك اللهم وبحمدك لك الحمد علىٰ عفوك بعد قدرتك" [1]

"پاک ہے تو اے اللہ تیرے لیے حمد ہے تیری معافی پر تیری قدرت کے بعد۔"

[1] تفسیر الطبری، الفرقان / آیت:٢٥، ٢٦(١٩/ ٢٦١) تفسیر ابن کثیر ١/ ٥٧١۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ جو قادر ہو وہ معاف بھی کرے یا جو معاف کرے وہ قدرت بھی رکھتا ہو۔

اسی طرح یہ بھی لازمی نہیں ہے کہ ہر صاحب علم حلیم ہو، ہر حلم والا عالم ہو۔ علم وحلم، عفو وقدرت، ملک وحمد، عزت ورحمت ان صفات کی یکجائی عجب بے نظیر حسن وخوبی پیدا کردیتی ہے۔ فرمایا:

﴿وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ﴾ (۲۶/ الشعراء: ۹)

''اور بیشک تیرا رب عزت ورحمت والا ہے۔''

سورۂ مائدہ کی ایک آیت میں لطیف نکتہ

اسی بنا پر حضرت مسیح کا یہ قول:

﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ (۵/ المائدۃ: ۱۱۸)

''اگر تو ان کو عذاب کرے وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو معاف کرے (تو یہ بھی ہو سکتا ہے) کیونکہ تو عزت وحکمت والا ہے۔''

''فَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ'' سے زیادہ موزوں ہے۔

یعنی اگر تو نے معاف کردیا تو یہ معافی تیری صفت مغفرت رحمت کی بنا پر ہوگی۔ جو کہ کمال قدرت کا نتیجہ ہے اور تیری صفت حکمت کی وجہ سے ہوگی کہ جس کا سرچشمہ تیرا کامل علم ہے۔ دنیا والے، کمزوری یا مجرم کے جرم سے لاعلمی کی بنا پر معاف کرسکتے ہیں۔ لیکن تیری طرف سے مغفرت قدرت تامہ اور حکمت کاملہ کی بنا پر ہی ہوسکتی ہے۔ تو اپنی حکمت کی وجہ سے چیزوں کو اس کے محل پر ہی رکھتا ہے۔ یہاں ''الغفور الرحیم'' مناسب نہ تھا، اس صورت میں بے موقع مغفرت کی طرف اشارہ نکل آتا ہے اور یہ شان مسیح کے یکسر خلاف ہے۔ مغفرت کا وقت تو ختم ہو چکا، اب تو یہاں اللہ کی صفت عظمت وجلالت اور انتقام کا اظہار ہی موزوں ہے۔ کیونکہ

مسیح کے ماننے والوں نے اُسے اللہ کا بیٹا ٹھہرایا اوراس کو اللہ کا شریک قرار دیا۔
پس یہاں رحمت ومغفرت کے بجائے عزت وحکمت کا ذکر ہی زیادہ مناسب ہے۔

سورۂ ابراہیم کی ایک آیت

اس کے برخلاف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول میں صفت رحمت ومغفرت ہی مناسب ہے، فرمایا:

﴿ وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

(١٤/ ابراهيم: ٣٥-٣٦)

''اے رب! بچا مجھ کواور میری اولاد کوکہ وہ بتوں کی پوجا کریں۔ اے میرے رب! انہوں نے بہت سی مخلوق کو گمراہ کر ڈالا ہے، پس جس نے میری پیروی کی وہ مجھ سے ہے اورجس نے میری نافرمانی کی تو بیشک تو غفوررحیم ہے۔''

یہاں ''انك عزيز حكيم'' نہیں فرمایا۔ یہاں اس کی رحمت کی طلب اور دعا مقصود ہے اگرتو ان کو بخش دے اوران پر رحم فرمائے کہ توان کو توفیق دے دے کہ شرک سے باز آجائیں اورتوحید کی راہ اختیار کرلیں (تو یہ کوئی مشکل نہیں ہے کیونکہ تو بخشنے والا مہربان ہے۔)

اسی طرح حدیث میں ہے، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ)) [1]

''اے اللہ میری قوم کو بخش دے وہ جانتے نہیں ہیں۔''

اس تقریر سے یہ بھی صفت ثابت ہوگئی کہ رب تعالیٰ کے اسماء، اوصاف سے مشتق ہیں، بے معنی نہیں ہیں۔ ہراسم اس فعل وامر کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے جس کا ذکراس کے ساتھ ہوا ہے۔

[1] صحيح البخاری ٣/ ١٢٨٢ (٣٢٩٠) الانبياء۔ مسند احمد ١/ ٤٤١۔

خلاصہ فصل

مراتب ہدایت

ہدایت کے دس مرتبے ہیں:

① اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے سے بیداری کی حالت میں بلاواسطہ کلام کرنا۔ یہ ہدایت کا اعلیٰ درجہ ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے کلام کیا، فرمایا:

﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾ (٤/ النساء:١٦٤)

اس آیت میں اس جملہ سے قبل انبیائے کرام کی طرف وحی کے اتارنے کا ذکر ہے۔ پھر کلامِ موسیٰ کا بیان ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ کلام کی صورت عام وحی کی ایک خاص قسم ہے۔ یہاں پر کلام سے اشارہ، الہام وغیرہ مراد نہیں ہے بلکہ اس کا حقیقی معنی بھی مراد ہے۔ اسی لیے کلم کے بعد تکلیما لایا گیا ہے، تا کہ اس قسم کا شبہ پیدا نہ ہو سکے اور کوئی معتزلی مجازی معنی لینے کی جرأت نہ کرے۔

کلام کے معنی

فراء کا قول ہے کہ جو معنی انسان تک پہنچایا جائے وہ کلام ہے، خواہ کسی ذریعہ سے پہنچایا جائے۔ لیکن جب اس کے ساتھ مصدر کا استعمال ہوگا تو پھر اس صورت میں صرف حقیقی کلام ہی مراد ہوگا:

﴿وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ﴾ (٧/ الأعراف:١٤٣)

”اور جب موسیٰ اپنے وقت مقررہ پر آئے تو رب نے ان سے کلام کیا۔ کہا، اے میرے رب! مجھے دکھا میں تیرا دیدار کروں گا۔“

اس آیت میں دوسرے کلام کا ذکر ہے۔ پہلی آیت میں اُس کلام کا بیان ہے جس کو لے کر فرعون کے پاس آپ بھیجے گئے تھے۔ پہلی ملاقات کسی وعدہ کی بنا پر نہ تھی لیکن دوسری ملاقات کے لیے پہلے سے وعدہ ہو چکا تھا۔

﴿ يٰمُوْسٰۤى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ﴾

(٧/ الأعراف:١٤٤)

''اے موسیٰ! میں نے تجھے لوگوں پر فوقیت دے کر چن لیا ہے۔ اپنے پیغام اور کلام کے ساتھ۔''

اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے اس نے سرگوشی بھی کی ہے اور اسے پکارا بھی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ سرگوشی نزدیک سے ہوتی ہے اور پکار دور سے۔ حضرت آدم علیہ السلام اور موسیٰ کے مابین جو (ازل میں) مناظرہ ہوا تھا، اس میں بھی یہ الفاظ ملتے ہیں۔ آدم علیہ السلام نے کہا تو ہی وہ موسیٰ ہے جس کو اللہ نے اپنے کلام کے ساتھ شرفِ انتخاب بخشا اور تیرے لیے تورات اپنے ہاتھ سے لکھی۔ اسی کلامی فضیلت کا ذکر معراج والی حدیث میں بھی ملتا ہے۔ اب اگر یہ کلام عام ولی کی طرح تھا تو پھر احادیث وقرآن میں اس کا خصوصی ذکر بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے اور کلیم الرحمٰن لقب کی ضرورت باقی نہیں رہتی قرآن میں ہے:

﴿ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ﴾ (٤٢/ الشورىٰ:٥١)

''کسی بشر کی طاقت نہیں کہ وہ اللہ سے کلام کر سکے مگر تین طریقوں سے (۱) وحی (۲) پس پردہ (۳) بذریعہ فرشتہ۔ پھر وہ فرشتہ اللہ کے حکم سے دل میں کلام ڈالتا ہے۔''

یہاں تینوں قسموں کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے۔ لہٰذا ان تینوں کو ایک نہیں قرار دیا جا سکتا۔

① دوسرا مرتبہ وحی کا ہے جو کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے ساتھ مختص ہے، فرمایا:

﴿ اِنَّاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ كَمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ﴾

(٤/ النساء:١٦٣)

''ہم نے وحی کی تیری طرف جیسا کہ ہم نے وحی کی نوح اور اس

کے بعد میں نبیوں کی طرف۔''

ایک شبہ کا جواب:

آیت سابقہ ﴿وما کان لبشر﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی کلام الٰہی کی ایک قسم ہے۔لیکن آیت نساء﴿اِنَّا اَوْحَیْنَا......وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾ بتاتی ہے کہ وحی اور کلام ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں۔

جواب: کلام کے دو معنی ہیں:

① کلام خاص بلاواسطہ: اس معنی کے لحاظ سے وحی اس کے بالمقابل اُس کی قسم ہے۔

② کسی معنی کو مختلف طریقوں سے پہنچانا: اس اعتبار سے وحی کلامِ الٰہی کی ایک قسم بن جاتی ہے۔

وحی کے معنی

لغت میں وحی کے معنی ہیں، پوشیدہ طور پر جلدی سے خبر دینا۔

③ تیسرا مرتبہ، رسول ملکی (فرشتہ) کو رسول بشری (نبی) کی طرف بھیجنا، تاکہ وہ اللہ کے احکام اس تک پہنچادے۔

یہ تینوں مراتب انبیا کے ساتھ خاص ہیں کسی دوسرے میں نہیں پائے جا سکتے۔اب یہ رسول ملکی کبھی تو انسانی صورت میں نبی کے پاس پیغام لاتا ہے اور کبھی اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی نبی کے جسم میں داخل ہو کر وحی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔(اس آخری صورت میں نبی ایک قسم کی شدت محسوس کرتا ہے، جو کچھ دیر میں دور ہو جاتی ہے۔) یہ تینوں مراتب حضرت محمد ﷺ کو حاصل تھے۔

④ چوتھا مرتبہ تحدیث کا ہے۔یہ مرتبہ وحی خاص بلکہ صدیقیت سے بھی کم ہے۔

حدیث میں ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّهٗ كَانَ فِي الْاُمَمِ قَبْلَكُمْ مُحَدَّثُوْنَ فَاِنْ يَكُنْ فِيْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ

اَحَدٌ فَعُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ)) ❶

''تم سے پہلی امتوں میں محدث تھے اوراس امت میں اگر کوئی محدث ہوسکتا ہے تو وہ عمر ہے۔''

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

حدیث میں گزشتہ امتوں میں محدثین کے وجود کو پورے جزم ویقین کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔لیکن اس امت میں اِن شرطیہ کے ساتھ معلّق رکھا گیا ہے حالانکہ یہ امت تمام امتوں سے افضل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی قومیں محدثین کی محتاج تھیں، لیکن امت محمدیہ اپنے نبی کے کمالِ رسالت کی بنا پراس سے بے نیاز ہے۔اب اس امت کو کسی صاحب کشف اور صاحب خواب کی ضرورت نہیں ہے۔لہٰذا یہ تعلیق(اِن شرطیہ کا استعمال) کمالِ استغنا(بے نیازی) کی دلیل ہے نہ کہ عیب ونقص کی۔

محدث کے معنی

محدث وہ ہے جس کے دل میں کچھ القا ہوتا ہے،پھر اس کے مطابق واقع نظر آتا ہے۔صدیق کا درجہ محدث سے بلند تر ہے، صدیق اتباع رسول ﷺ اور کمالِ صدیقیت کی وجہ سے تحدیث، الہام،کشف سے بے نیاز ہے۔اس کا ظاہر باطن رسول کے لیے وقف ہوچکا ہے اوراب کسی دوسرے کی پروانہیں رہی ہے۔

محدّث کا فرض ہے کہ جوکچھ اس کے دل میں کھٹکے اسے کلام رسول پر پیش کرے، اگراس کے مطابق ہوتو قبول کرے ورنہ ردکردے۔

ایک جاہلانہ قول

بعض جہلا کہہ دیا کرتے ہیں:

''حدثنی قلبی عن ربی۔'' ❷

---

❶ صحیح مسلم ٤/ ١٨٦٤(٢٣٩٨) فضائل الصحابة: باب فضائل عمر بن الخطاب۔

❷ روح البیان ٢/ ٢٢٧۔

میرے دل نے میرے رب کی طرف سے حدیث بیان کی۔

یہ تو ٹھیک ہے کہ دل نے حدیث بیان کی لیکن کس کی طرف سے، رب کی جانب سے یاشیطان کی طرف سے۔ اب اگر وہ ربیّ کہتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی بات کو ایسی ہستی کی طرف منسوب کرتا ہے جس کے بارے میں اسے علم ہی نہیں کہ اس نے یہ بات کہی ہے یانہیں اور یہ کھلا ہواجھوٹ ہے۔ امت محمدیہ کامحدث اس قسم کی لاف زنی اوربکواس ہرگزنہیں کرسکتا۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر (محدث امت محمدیہ) کے کاتب نے لکھ دیا تھا:

"هذا ماأرى الله أمير المؤمنين عمر بن الخطاب۔"

یہ وہ شے ہے جس کا اللہ نے امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا ہے۔

عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اسے مٹا دو بلکہ یوں لکھو! اگر یہ درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو میری عقل کا قصور ہے۔'' [2]

اسی طرح ان کا ایک قول کلالہ کے بارے میں بھی منقول ہے۔ [3] یہ اس محدث کا قول ہے جس کی محدثیت کی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خود گواہی دی ہے۔ اب آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ حلولی، اباحیت پرست، سماع کے قائل اور مرتکب کبائر کا یہ قول کہاں تک درست ہوسکتا ہے: "حدثني قلبي عن ربّي۔"

⑤ ہدایت کا پانچواں مرتبہ افہام ہے، قرآن میں ہے:

﴿وَدَاوُدَ وَسُلَيْمَٰنَ إِذْ يَحْكُمَانِ فِي الْحَرْثِ إِذْ نَفَشَتْ فِيهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا

---

[2] شرح مشكل الآثار للطحاوي ٩/ ٢١٤، باب بيان مشكل ماروي عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في القضاة......

[3] سنن الكبرى للبيهقي (٢/ ٢٢٣) الفرائض: باب حجب الاخوة والأخوات......؛ سنن الدارمي ٢/ ٢٦٤(٢٩٧٦) الفرائض: باب الكلالة۔ مذکورہ بالا دونوں کتب میں یہ قول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۝ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ﴾

(۲۱/ الأنبياء: ۷۸-۷۹)

"اور داؤد اور سلیمان کا واقعہ یاد کرو جس وقت وہ دونوں ایک کھیتی کے بارے میں فیصلہ کر رہے تھے۔ جس وقت کہ قوم کی بکری اس میں چر چُگ گئی تھی اور ہم ان کے فیصلہ کو دیکھ رہے تھے، ہم نے اس کے سلجھانے کا فہم سلیمان علیہ السلام کو بخشا اور ہر ایک کو ہم نے حکم وعلم سے نوازا۔"

اس آیت میں دونوں نبیوں کو علم وحکم دیئے جانے کا ذکر ہے۔ لیکن فہم عطا ہونے کی خصوصیت حضرت سلیمان علیہ السلام ہی کے لیے ذکر کی گئی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا:

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو کوئی ایسی خاص بات بتلائی ہے جس سے دوسرے لوگوں کو بے خبر رکھا گیا ہے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

"نہیں! قسم ہے اس ذات کی جس نے دانہ کو پھاڑا اور نفس کو پیدا کیا، ہاں! مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو فہم عطا کیا ہے جس کے ذریعہ وہ قرآن میں اور جو کچھ اس صحیفے میں ہے غور کرتا ہے۔ اس صحیفے میں دیتوں کی تفصیل، قیدی کے چھڑانے کے احکام اور یہ کہ کافر کے بدلے مسلمان قتل نہیں کیا جا سکتا (مذکور ہیں۔)" [1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو خط لکھتے ہوئے فرمایا:

"افهم فيما أدلى إليك۔" [2]

"اور جو باتیں میں تمہیں کہہ رہا ہوں ان کو سمجھو۔"

[1] صحيح البخاری ۱/ ۵۳ (۱۱۱) العلم: باب كتابة العلم؛ سنن الترمذی ۴/ ۲۴ (۱۴۱۲) الديات: باب ماجاء لايقتل مسلم بكافر۔

[2] سنن الكبرى للبيهقی (۱۰/ ۱۵۰) الشهادات: باب لايحيل حكم القاضی علی المقضی……

فہم بندے پر اللہ کی ایک نعمت ہے، ایک نور ہے جس کو اپنے بندے کے دل میں ڈالتا ہے۔ جس کے ذریعہ وہ اس حقیقت کا سراغ لگالیتا ہے جس سے دوسرا عالم (جو کہ اصل نص کے حفظ کرنے اوراس کے معنی کے سمجھنے میں اس کے برابر ہے۔) قاصر رہتا ہے۔ پس یہ فہم صدیقیت کا عنوان اورولایت نبوت کا منشور ہے۔اسی فہم ہی کی بنا پر علما کے مراتب مختلف ہوگئے ہیں۔حتیٰ کہ ایک عالم ہزار علما کے برابر ہوجاتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فہم

ایک مجلس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے کبار صحابہ سے ﴿اذا جاء نصر الله﴾ کا مطلب دریافت کیا۔ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ سورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر دے رہی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی تائید کی۔ [1]

اب غور فرمایئے کہ اس سورت کا یہ مطلب صرف ان دونوں پر ظاہر ہوسکا اور دوسرے اس سے قاصر رہے،ابن عباس رضی اللہ عنہما اس وقت بالکل نوعمر تھے۔اس سورت سے وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا پتہ لگالینا اس فہم خاص کی بنا پر تھا جو اللہ کی طرف سے عطا ہوا تھا۔

بہت سے لوگوں سے اس قسم کی باریک حقیقت اوجھل رہ جاتی ہے وہ باوجود تشفی کے کسی دوسری وضاحت کے بھی محتاج ہوتے ہیں۔ لیکن صاحب فہم کے لیے صرف نص ہی کافی ہو جاتی ہے۔

⑥ ہدایت کا چھٹا مرتبہ بیان عام ہے اس کا مطلب ہے کہ دلائل وشواہد و علامات کے ذریعہ حق کو باطل سے اس طرح ممتاز اورواضح کردینا کہ دل کی آنکھیں اس کو بے نقاب دیکھ لیں، جس طرح کہ یہ ظاہری نگاہ محسوسات کا مشاہدہ کرتی ہے۔ یہ مرتبہ ہدایت اللہ کی مخلوق پر حجت ہے اس کے بغیر اللہ تعالیٰ کسی قوم

[1] صحیح البخاری ٤/ ١٩٠١ (٤٦٨٦) التفسیر: باب (فسبح بحمد ربك......)

کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا۔

فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ ﴾ (۹/ التوبة: ۱۱۵)

''اللہ تعالیٰ کسی قوم کو گمراہ نہیں کرتا ہدایت دینے کے بعد، تاوقتیکہ وہ ان کے لیے بیان نہ کر دے اُن چیزوں کو جن سے وہ بچیں۔''

یہ اضلال (گمراہ کرنا) اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور سزا کے ہے۔جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی راہ ان پر کھول دی۔ پھر بھی انہوں نے اسے قبول نہ کیا اور اس پر عمل پیرانہ ہوئے۔تو پھر اللہ ان کو ہدایت کی راہ سے بھٹکا دیتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس ہدایت (بیان عام) کے بعد بھی کسی قوم کو گمراہی میں ڈالا ہے۔

اس تقریر سے تقدیر کا سربستہ راز بھی آپ پر کھل گیا اور شکوک کے بادل چھٹ گئے اور اضلال کے بارے میں اس کی قلت کا بھی پتہ چل گیا۔قرآن میں کئی جگہ اس قسم کی تصریحات موجود ہیں۔

فرمایا:

﴿ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ ﴾ (۶۱/ الصف:۵)

''پھر جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے بھی ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے۔''

﴿ وَقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ ﴾

(۴/ النساء : ۱۵۵)

''اور انہوں نے (کافروں نے) کہا ہمارے دل غلاف میں ہیں بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔''

اس آیت میں پہلا کفر، کفرِ عناد (سرکشی) ہے اور دوسرا کفر طبع (مہر لگا دینا) ہے۔

﴿ وَنُقَلِّبُ أَفْـِٔدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِۦٓ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَذَرُهُمْ فِى طُغْيَـٰنِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴾ (٦/ الأنعام:١١٠)

''ہم ان کی نگاہوں اوردلوں کو پلٹتے ہیں۔جیسا کہ وہ پہلی بارایمان نہیں لائے تھے اورہم ان کوان کی سرکشی میں بھٹکتا چھوڑ دیتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے ان کویقین کرلینے کے بعد ایمان چھوڑنے پر یہ سزادی کہ ان کے دلوں اور نگاہوں کو پلٹ ڈالا کہ اب وہ راہ حق پا ہی نہیں سکتے۔

﴿ وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنَـٰهُمْ فَٱسْتَحَبُّوا۟ ٱلْعَمَىٰ عَلَى ٱلْهُدَىٰ ﴾ (٤١/ فصّلت:١٧)

''اورثمود توپھر ہم نے ان کوہدایت دی توانہوں نے اندھے پن کو ہدایت پر ترجیح دی۔''

یہاں ہدایت سے یہی بیان عام مراد ہے یہ نجات کے لیے شرط ہے۔لیکن صرف اسی کے ذریعہ نجات نہیں مل سکتی جب تک کہ اس کے ساتھ توفیق والہام کی ہدایت شامل نہ ہو۔

اب یہ بیان عام دوقسم کی آیات کے ذریعہ ہوتا ہے:

① آیات قرآنی ② آیات کائناتی

پہلی آیات سننے اورتلاوت کرنے میں اور دوسری دیکھنے اورمشاہدہ کرنے میں ہیں۔یہ دونوں کی دونوں توحید اوراللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات اوروحی الٰہی کی سچائی کوظاہر کرتی ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ آیات قرآنی کے ذریعہ آیات کائناتی میں غور کرنے کی دعوت دیتا ہے اورکبھی دونوں میں تفکر وتدبر کی طرف بلاتا ہے۔

اسی بیان عام کے ساتھ انبیائے کرام علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے اوران کے اورعلمائے کرام کے ذمہ اس کام کوڈالا گیا۔اب اس بیان عام کے بعد اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے۔

فرمایا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۝ ﴾ (۱۴/ ابراھیم: ٤)

''ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان میں تاکہ وہ ان کو کھول کھول کر بتلا دے۔ پھر اللہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت بخشتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ ہی عزت وحکمت والا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ انبیا کا کام بیان کردینا ہے۔اب اللہ اپنی مشیت کے مطابق کسی کو ہدایت اور کسی کو ضلالت کی راہ پر ڈال دیتا ہے۔

⑦ ہدایت کا ساتواں مرتبہ بیان خاص ہے۔اس کے بعد ہدایت خاصہ نمودار ہوتی ہے۔اس بیان کے ساتھ عنایت وتوفیق شامل حال ہوتی ہے اورنا کامی و نامرادی کے تمام اسباب کٹ جاتے ہیں۔اس بیان کے بعد راہ ہدایت پر گامزن ہوجانا یقینی ہے۔

جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿ اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ ﴾

(۱٦/ النحل: ۳۷)

''اگر آپ ان کی ہدایت پر حرص کریں تو اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت نہیں کرتا جو گمراہ ہوجاتا ہے۔''

دوسری آیت میں ہے:

﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ ﴾

(۲۸/ القصص:٥٦)

''(اے نبی) جن کو تم چاہو ہدایت نہیں کر سکتے۔ لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔''

پہلا بیان یعنی بیانِ عام شرط ہے اور یہ موجب ہے۔ (یعنی اس کے بعد

نجات کا حصول یقینی ہے۔)

⑧ آٹھواں مرتبہ اسماع (سنانا)، قرآن میں ہے:

﴿وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ۭ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ (۸/ الأنفال: ۲۳)

''اور اگر اللہ اُن میں کچھ بھلائی جانتا تو ضرور ان کو سنا دیتا اگر وہ ان کو سنا دے تو وہ پلٹ جائیں اعراض کرتے ہوئے۔''

﴿وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ۙ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ ۚ وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَاۗءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ؀ اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ؀﴾

(۳۵/ فاطر:۱۹۔۲۳)

''اندھے اور بینا، تاریکیاں اور روشنی، سایہ اور دھوپ برابر نہیں ہیں اور نہ زندے اور مردے یکساں ہیں۔ بیشک اللہ جسے چاہتا ہے سنا دیتا ہے اور تم (اے نبی!) قبر والوں کو سنا نہیں سکتے۔ آپ تو محض ڈرانے والے ہی ہیں۔''

یہ اسماع محبت وتبلیغ کے اِسماع (سنانے) سے خاص ہے۔اس قسم کا اِسماع (یعنی اسماع محبت وتبلیغ) تو پہلے سے بھی ان کو حاصل ہے اوراسی کے ذریعہ ان پر حجت بھی قائم ہوتی ہے۔لیکن یہ اِسماع الآذان (کانوں کو سنانا) ہے اور ہماری مراد (یہاں) اِسماع القلوب (دلوں کو سنانا) ہے۔کلام کے دو پہلو ہوتے ہیں: لفظ اور معنی اوران کا تعلق کان اوردل دونوں سے ہوتا ہے۔لفظ کو سُننا یہ کان کا حصہ ہے اورمعنی پر کان دھرنا یہ دل کا خاصہ ہے اِسی لیے اللہ تعالیٰ نے کفار سے سماعِ قلب کی نفی کی ہے اور سماعِ اذن کو ان کے لیے ثابت کیا ہے۔فرمایا:

﴿مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۙ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ۭ﴾ (۲۱/ الأنبیاء: ۲۔۳)

''ان کے پاس ان کے رب کی جانب سے کوئی نیا ذکر نہیں آتا مگر وہ اس پر کھیلتے کودتے کان دھرتے ہیں اوران کے دل غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔''

اس سماع سے صرف اتنا فائدہ ہوتا ہے کہ سامع پر حجت قائم ہوجاتی ہے۔ باقی رہا سماع کا مقصد تو بھلا وہ دل کی غفلت کے ساتھ کب حاصل ہوسکتا ہے۔ قرآن نے اس قسم کے ظاہری سامع کا یہ مقولہ نقل کیا ہے:

﴿مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾

(٤٧/ محمد: ١٦)

''ابھی (رب نے) کیا کہا ہے؟ یہی لوگ ہیں، جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگادی ہے۔''

مرتبہ اسماع اورمرتبہ فہم میں فرق دوطرح سے ہے:

❶ اس میں مرتبہ کا حصول صرف کان کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے اس کے برخلاف مرتبہ فہم عام ہے وہ کان کے علاوہ دوسرے ذرائع سے بھی حاصل ہوسکتا ہے۔

❷ مرتبہ فہم کا تعلق معنی مراد،اس کے لوازمات،اشارات اورمتعلقات سے ہوتا ہے۔اورمرتبہ سماع کا مدار اس بات پر ہوتا ہے کہ خطاب کے ذریعہ مقصود دل تک پہنچ جائے اس کے بعد ہی قبولیت کا پھل ملتا ہے۔

مراتب سماع

سماع کے تین مرتبے ہیں:

❶ سماع الأذن (کان کا سننا)۔

❷ سماع القلب (دل کا سننا)۔

❸ سماع القبول (ایسا سننا کہ پھر اطاعت فرمانبرداری کا جذبہ پیدا ہوجائے۔)

⑨ نواں مرتبہ الہام ہے۔قرآن میں ہے:

﴿ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ ﴾ (۹۱/ الشمس:۷۔۸)

''قسم ہے نفس کی اور جس نے اس کو ٹھیک ٹھاک کیا۔ پھر اس کے تقویٰ اور فجور (نیکی اور بدی) کا الہام کیا۔''

حصین بن منذر خزاعی رضی اللہ عنہ جب اسلام لائے تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا یہ دعا پڑھو:

((اَللّٰهُمَّ أَلْهِمْنِيْ رُشْدِيْ وَقِنِيْ شَرَّ نَفْسِيْ)) [1]

''اے اللہ! مجھے میری بھلائی کا الہام کر اور مجھے اپنے نفس کے شر سے بچا۔''

صاحب المنازل نے لکھا ہے:

الہام محدثین کا مقام ہے اور اس کا درجہ فراست (تاڑنا) سے اوپر ہے۔ کیونکہ فراست بعض مرتبہ غلط بھی نکل جاتی ہے اور الہام کا معاملہ ایسا نہیں ہے، اس کا حصول مقام قرب میں ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تحدیث (محدثیت) کا درجہ الہام سے خاص ہے۔ الہام تو عام مومنین کو ان کے ایمان کے لحاظ سے حاصل ہے۔ مومن پر اللہ نے بھلائی کا الہام کیا ہے جس کے ذریعہ اس نے ایمان کی دولت پائی ہے۔ لیکن تحدیث، تو اس کے بارے میں فرمانِ نبوی موجود ہے:

((إِنْ يَكُنْ فِيْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ أَحَدٌ فَعُمَرُ)) [2]

''اس امت میں اگر کوئی محدث ہوسکتا ہے تو وہ عمر ہے۔''

تحدیث الہام خاص کا نام ہے، یعنی غیر انبیا کی طرف وحی۔ اب اس کی دو صورتیں ہیں:

1. مکلفین کی طرف وحی، جیسا کہ فرمایا:

---

[1] سنن الترمذی ۵/ ۵۲۰ (۳۴۸۳) الدعوات: باب جامع الدعوات للنبی صلی اللہ علیہ وسلم لیکن ترمذی میں ((قنی شر نفسی)) کی جگہ ((اعذنی من شر نفسی)) کے الفاظ ہیں۔ مستدرك حاكم ۱/ ۵۱۰ كتاب الدعاء۔ [2] تخریج صفحہ نمبر ۵۲ پر گزر چکی ہے۔

﴿ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ ﴾ (۲۸/ القصص:۷)

''اور ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی کی کہ اُسے دودھ پلائے۔''

﴿ وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ ﴾

(۵/ المائدۃ:۱۱۱)

''اور جب کہ میں نے وحی کی حواریوں کی طرف کہ وہ مجھ پر ایمان لائیں اور میرے رسول پر۔''

2 غیر مکلفین کی طرف وحی:

﴿ وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۙ ﴾ (۱۶/ النحل:۶۸)

''اور وحی کی تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف کہ بنالے پہاڑوں سے گھر اور درختوں سے اور چھپروں سے۔''

الہام اور فراست میں فرق

فراست اور الہام میں سے ہر ایک کے دو دو مرتبے ہیں: عام اور خاص۔ ایک کا خاص دوسرے کے عام سے برتر ہے۔ فراست ایک کسبی چیز ہے اس کا مدار انسان کی اپنی محنت پر ہے اور الہام وہبی چیز ہے جو صرف اللہ کی عنایت سے حاصل ہوسکتی ہے اس میں کسی کا کچھ دخل نہیں ہے۔ الہام کے تین درجے ہیں (یہ بحث پانچ حصوں پر مشتمل ہے از صفحہ ۲۵ تا صفحہ ۲۷ چونکہ تفسیر سے غیر متعلق ہے اس لیے اس کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔ مترجم)

10 ہدایت کا دسواں مرتبہ رویائے صادقہ (سچا خواب) ہے۔ یہ نبوت کے اجزا میں سے ایک جزو ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے:

''سچا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔'' [1]

---

[1] صحیح البخاری ۶/ ۲۵۶۴ (۶۵۸۸) التعبیر: باب الرؤیا الصالحۃ جزء من ستۃ وأربعین جزءاً من النبوۃ'

اس عدد کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ رسول ﷺ کی وحی کا ابتدائی دور رؤیائے صادقہ ہی سے شروع ہوا تھا اور یہ سلسلہ برابر نصف سال تک جاری رہا پھر تیئس برس تک بحالت بیداری وحی آتی رہی۔اس لحاظ سے خواب کی مدت زمانہ وحی کے اعتبار سے چھیالیسواں حصہ بن جاتی ہے۔یہ نہایت لطیف نکتہ ہے لیکن دوسری روایت میں بجائے چھیالیس کے ستر کا عدد آیا ہے [1] جس سے یہ نکتہ بے محل ہوجاتا ہے۔

جواب ان دونوں روایتوں میں اس طرح تطبیق دی جاسکتی ہے کہ یہ دیکھنے والے کے حال پر موقوف ہے۔صدیقین کا خواب چھیالیسواں حصہ ہوتا ہے اور عام مومنین کا ستر واں۔سب سے زیادہ سچا خواب اسی کا ہوگا جو سب سے زیادہ سچائی پر کار بند ہوگا۔حدیث میں ہے:

"قرب قیامت کے موقع پر شاید ہی کوئی خواب غلط نکلے اور یہ اس لیے کہ زمانہ نبوت کی بُعد ودوری کی تلافی سچے خوابوں کے ذریعہ کی جائے گی۔" [2]

نورنبوت کی موجودگی میں ان خوابوں کی ضرورت نہ تھی۔یہی مثل ان کرامات کی ہے جو کہ دور صحابہ کے بعد ظاہر ہوئیں۔صحابہ کرام اپنی قوتِ ایمانیہ کی بنا پر اس قسم کی کرامات سے بے نیاز تھے۔بعد والے اس کے محتاج تھے کیونکہ ان کا ایمان کمزور تھا۔

امام احمد نے یہی توجیہ بیان کی ہے۔

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

"مومن کا خواب ایک گفتگو ہے جو رب تعالیٰ اپنے بندے سے سونے کی حالت میں کرتا ہے۔"

---

[1] صحيح مسلم ٤/ ١٧٧٥ (٢٢٦٥) الرؤيا۔ [2] صحيح البخاري ٦/ ٢٥٧٥ (٦٦١٤) التعبير:باب القيد في المنام؛ سنن الترمذي ٤/ ٥٣٢ (٢٢٧٠) الرؤيا: باب أن رؤية المؤمن جزء من ستة و أربعين؛سنن ابوداود ٥/ ٢٨٢ (٥٠١٩)الادب: باب في الرؤيا۔

حدیث میں ہے:

"اب نبوت میں سے سوائے مبشرات یعنی رؤیا صادقہ کے اور کچھ باقی نہیں رہا ہے۔" [1]

اگر کسی خواب پر کئی مسلمانوں کا اتفاق ہو جائے تو وہ جھوٹا نہیں ہو سکتا جیسا کہ شب قدر والی حدیث [2] سے معلوم ہوتا ہے۔

رؤیا کی قسمیں

رؤیا، کشف کی طرح ہے۔اس کی تین قسمیں ہیں:

① رحمانی ② نفسانی ③ شیطانی

اس کی تائید حدیث سے بھی ہوتی ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا:

"خواب تین قسم کے ہیں:

① اللہ کی طرف سے۔

② شیطان کی طرف سے، جو رنج میں ڈالتا ہے۔

③ انسان اپنے نفس میں بیداری کی حالت میں کچھ سوچتا ہے،اسی کو خواب میں دیکھتا ہے۔" [3]

اسباب ہدایت میں سے صرف پہلی قسم ہے۔ انبیا کا خواب وحی ہے کیونکہ وہ شیطان سے محفوظ ہیں اس پر امت کا اتفاق ہے۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے خواب کی وجہ سے ذبح اسماعیل پر آمادہ ہو گئے۔باقی رہے غیر انبیا کے خواب تو وہ کتاب وسنت کے مطابق ہوئے تو قبول کیے جائیں گے ورنہ رد کر دیے جائیں گے۔

---

[1] صحیح البخاری ٦/ ٢٥٦٤ (٦٥٨٩) التعبیر: باب المبشرات؛مؤطا امام مالك ٢/ ١٣٥ (٢٠١٢) الرؤیا: باب ماجاء فی الرؤیا۔ [2] صحیح البخاری ٢/ ٧٠٩ (١٩١١) صلاة التراویح: باب التماس لیلة القدر فی السبع الأواخر۔ [3] مسند احمد ٢/ ٢٦٩، ٣٩٥؛ صحیح مسلم ٤/ ١٧٧٣(٢٢٦٣) الرؤیاء؛الترمذی ٤/ ٥٤١ (٢٢٩١) الرؤیا: باب ماجاء فی رؤیا النبی ﷺ المیزان والدلو۔

سوال اگر سچا خواب ہو یا اس پر کئی آدمیوں کا اتفاق ہو تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے گا؟

جواب سچا خواب، متفق علیہ خواب وحی الٰہی کے مخالف ہو ہی نہیں سکتا۔ اس خواب کے ذریعہ یا تو نظر سے اوجھل فہم اس پر تنبیہ ہو جائے گی یا یہ معلوم ہو جائے گا کہ فلاں آیت مسئلہ فلاں کے ماتحت ہے۔

سچا خواب دیکھنے کا طریقہ

① سچائی پر کاربند رہنا۔ ② حلال روزی کھانا۔

③ امر و نہی کی محافظت۔ ④ باوضو سونا۔

⑤ آنکھ لگنے تک ذکرِ الٰہی میں مشغول رہنا۔

ان شرائط کے ساتھ خواب جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سچا خواب آخری رات کا ہوتا ہے جبکہ صبح نکلنے کو ہوتی ہے۔ یہ وقت نزولِ الٰہی، قرب و رحمت و مغفرت کا ہوتا ہے۔ شیاطین کی گرم بازاری سرد پڑی ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف اول رات کے خواب کا حال یہ ہے کہ اس وقت شیاطین اور ان کی شیطانی ارواح کا جال پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ خواب کے لیے ایک فرشتہ مقرر ہے جو بندے کو مناسب شکلیں اور صورتیں دکھلاتا ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

"خواب وحی کا ایک حصہ ہے اس کی بغیر علم تفسیر کرنا جائز نہیں۔"

خلاصہ فصل

سورۂ الفاتحہ دل اور بدن دونوں کے لیے شفا ہے۔

سوال سورۂ فاتحہ کے ذریعہ دل شفا پاتے ہیں۔ کس طرح؟

جواب اس کا جواب ذیل کی تفصیل سے معلوم ہو سکتا ہے۔

دلوں کی تمام بیماریوں کا سرچشمہ علم اور ارادہ کا بگاڑ ہے۔ انہی سے ضلالت

(گمراہی) اورغضب الٰہی کاظہور ہوتا ہے۔علم کا فساد، ضلالت اورقصد وارادہ کا بگاڑ، غضب کا سبب بنتا ہے۔ یہ دونوں مرض تمام قلبی بیماریوں کی جڑ ہیں۔صراط مستقیم کی ہدایت ضلالت کی ہر بیماری سے نجات بخشتی ہے۔اسی بنا پرشب وروز ہرنماز میں طلب ہدایت کو فرض قرار دیا گیا اوردنیا بھر کے سوالات پراسے مقدم رکھا گیا ہے۔

اور ﴿ایاك نعبد و ایاك نستعین﴾ کے ذریعہ قصد و ارادہ کی خرابی دور ہوسکتی ہے۔فساد قصد کاتعلق مقصد اورذرائع دونوں کے ساتھ ہے۔جس نے فانی شے کواپنا کعبہ مقصود ٹھہرالیا اوراس کے لیے اسی قسم کے ذرائع اور وسائل استعمال کیے تو ایسا شخص اپنے مقصد اوراپنے وسائل دونوں کے اعتبار سے ناکام رہا۔اس قسم کے فساد اوربگاڑ والے لوگ چند قسم کے ہیں:

① مشرکین، جنہوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود ٹھہرالیے۔(ان کا مقصد بھی کمزور اوروسائل بھی بودے ہیں۔)

② متبعین شہوات،جن کامقصد سوائے شہوت رانی اورہوسنائی کے اورکچھ نہیں ہے۔

③ حکومت وریاست کے علمبردار، یہ لوگ صرف اپنی برتری اورغلبہ چاہتے ہیں خواہ یہ جائز طریقے سے حاصل ہو یاناجائز طریقے سے۔اگر یہ سمجھتے ہیں کہ حق ان کی راہ میں رکاوٹ ڈال رہاہے۔توپھر پوری طرح سے اُسے روندنے اورکچلنے کی کوشش کرتے ہیں۔اگر اتنی طاقت نہیں ہوتی توپھر مدافعانہ جنگ لڑتے ہیں۔اگراتنی بھی سکت نہیں ہوتی توپھر دوسری راہ اختیار کرلیتے ہیں لیکن ساتھ ہی حق کوروکنے کی تدبیریں سوچتے رہتے ہیں۔پھرجب کوئی چارہ کار باقی ہی نہیں رہتا توخطبہ اور سکہ اس کے نام کاہوتا ہے اورفیصلے، قوانین اورنظام زندگی اپنی مرضی کے مطابق۔

ہاں اگر وہ یہ دیکھتے ہیں کہ حق کے ذریعہ کچھ ان کومل رہاہے تو پھر وہ لپک

کرآتے ہیں۔قرآن نے ان کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

﴿ وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم مُّعْرِضُونَ ۝ وَإِن يَكُن لَّهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ۝ أَفِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ أَمِ ارْتَابُوا أَمْ يَخَافُونَ أَن يَحِيفَ اللهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُ ۚ بَلْ أُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝ ﴾ (۲٤/ النور:٤٨۔٥٠)

''اور جب وہ اللہ اور رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں تو ایک گروہ ان میں سے منہ پھیر لیتا ہے۔ہاں اگر انہیں حق ملتا ہوتو وہ دوڑکر پہنچتے کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے یاانہوں نے شک کیایاوہ ڈرتے ہیں؟ کہ اللہ اور رسول ان پر ظلم کرڈالیں گے۔بلکہ یہی لوگ ظالم ہیں۔''

جس شخص نے بلند مقصد توطلب کیالیکن اس کے لیے راہ غلط اختیار کی اس کاحال بھی مذکورہ بالاگروہ سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ان دونوں مرضوں، فسادِ مقصد اورفسادِ ذریعہ کاعلاج ﴿إياك نعبد وإياك نستعين﴾ ہے۔یہ دوا چھ اجزا سے مرکب ہے:

1. اللہ کی بندگی اورعبادت اس کے سوا اورکسی کی نہیں۔
2. عبادت اس کی شریعت اورحکم کے مطابق۔
3. اس میں اپنی خواہش کادخل بالکل نہ ہو۔
4. اور نہ اس میں انسانی افکار، آراء، رسوم اور حالات کی آمیزش ہو۔
5. عبادت پرصرف اسی سے استعانت (مدد طلب کرنا)۔
6. اپنے نفس،قوت اورغیر اللہ کے ساتھ استقامت سے پرہیز۔

ان چھ اجزا کے ساتھ شفا کامل یقینی ہے۔اگرکبھی کچھ کمی نظر آئے گی تواس کی وجہ اجزا میں سے کسی ایک کی کمی ہوگی۔

دوبڑی بیماریاں ریا اورتکبر

کبھی دل کودوبڑی بیماریاں ریا اورتکبر لگ جاتی ہیں۔اگر ان کودور کرنے کی

کوشش نہ کی جائے تو بربادی یقینی ہے۔

ریا کا علاج "ایاك نعبد" اور تکبر کی دوا" ایاك نستعین" ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے بارہا میں نے سنا ہے:

''إیاك نعبد ریا کو اور إیاك نستعین غرور کو دور کرتا ہے۔''

جب مومن نے ریا اور تکبر کو تو یوں دور کرلیا اور ضلالت وجہالت سے "اھدنا الصراط المستقیم" کے ذریعہ نجات پالی تو مرض کون سارہ گیا جس سے چھٹکارہ پانے کی فکر کی جائے۔ اب تو وہ نعمت وعافیت کے لباس میں مٹکتا ہوا ملے گا اور اس کا شمار "انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولاالضالین" میں سے ہوگا۔

جب سورۂ فاتحہ سے دل کی خطرناک بیماریاں دور ہوسکتی ہیں۔ تو ظاہری امراض میں سورۂ فاتحہ کا اکسیر ہونا بہر حال یقینی ہے۔ [1]

(صفحہ۳۰ سے صفحہ۴۰ تک کے مباحث کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔ ان کا تعلق تفسیر قرآن سے خاص طور پر نہیں ہے۔ مترجم)

اسرار ایاك نعبد وایاك نستعین

خلق وامر، کتب و قوانین، ثواب و عقاب کا سرچشمہ دو کلمے ہیں۔ "إیاك نعبد وإیاك نستعین" انہی پر عبودیت (بندگی) اور توحید کا دارومدار ہے۔ اسی بنا پر کسی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک سو چار کتابیں اتاری ہیں۔ جن کا خلاصہ تورات، انجیل اور قرآن میں ہے اور ان تینوں کے معانی قرآن میں یکجا جمع ہیں اور پھر پورے قرآن کا مضمون مفصل (حجرات تا والناس) میں موجود ہے۔ ان تمام کے معانی سورۂ فاتحہ میں ہیں اور سورۂ فاتحہ کا لب لباب "إیاك نعبدوإیاك نستعین" میں آ گیا ہے۔ یہ دونوں کلمے رب اور بندے کے درمیان منقسم (بٹے ہوئے) ہیں۔ "إیاك نعبد" رب کے لیے ہے اور "إیاك نستعین" بندے کے لیے۔

---

[1] مدارج: ٢٤۔٥٥۔

عبادت

عبادت کا مفہوم دو بنیادوں پر قائم ہے:

① انتہائی عاجزی اور غایت درجہ کی محبت، اہل عرب کا قول ہے:"طریق معبدای مذلل" یعنی ذلیل پامال راستہ۔ عبادت میں خضوع (جھکاؤ) کا ہونا لازمی ہے۔ اگر آپ نے کسی سے رشتہ محبت بغیر خضوع کے قائم کیا تو اُسے عبادت نہ کہیں گے۔ اس طرح خضوع بلامحبت عبادت نہیں ہوسکتا۔

② مشرکین عرب توحید ربوبیت کے قائل تھے لیکن پھر بھی ان کی توحید اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہوئی۔ کیونکہ جب اس کی محبت ہی کا انکار کردیا، تو پھر اس کی الوہیت کا بھی انکار ہوگیا۔ اب رب ماننا اور نہ ماننا یکساں ہے۔

استعانت

استعانت اپنے اندر دو اصولوں کو سمیٹے ہوئے ہے:

① اللہ کی ذات پر بھروسہ اور اطمینان ② اللہ پر اعتماد

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کسی شخص سے مطمئن تو ہوتا ہے لیکن اپنے معاملات میں اس پر اعتماد کرنے کا اسے موقعہ ہی پیش نہیں آتا۔ بعض اوقات مجبوری کی وجہ سے اسے ایسے شخص پر اعتماد کرتا پڑتا ہے جو بھروسہ کے لائق نہیں ہے۔ توکل میں ثقہ (بھروسہ، اطمینان) اور اعتماد دونوں داخل ہیں۔ یہی اس آیت کی حقیقت ہے۔

عبادت اور توکل

یہ دونوں اصل قرآن میں یکجا کئی جگہ مذکور ہیں:

① ایک تو یہی آیت ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾

② قول شعیب علیہ السلام:

﴿وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ﴾

(۱۱/ هود:۸۸)

''میری توفیق اللہ ہی کے سہارے ہے اس پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میں لوٹوں گا۔''

③ ﴿ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ﴾ (۱۱/ هود:۱۲۳)

''اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کا غیب اور تمام کام اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔اس کی عبادت کرو اور اس پر بھروسہ رکھو۔''

④ ﴿ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴾

(٦٠/ الممتحنة: ٤)

''اے میرے پروردگار تجھ ہی پر ہم نے بھروسا کیا ہے اور تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔''

⑤ ﴿ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۞ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ﴾ (۷۳/ المزمل: ۸۔۹)

''تو اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کر اور تمام خلائق سے کٹ کے اس کی طرف متوجہ ہو جا۔مشرق اور مغرب کا پروردگار جس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو اسی کو اپنا کارساز بنالے۔''

⑥ ﴿ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ﴾

(۱۳/ الرعد: ۳۰)

''آپ کہہ دیجیے کہ میرا پالنے والا تو وہی ہے اس کے سوا درحقیقت کوئی بھی لائق عبادت نہیں، اسی کے اوپر میرا بھروسہ ہے اور اسی کی جانب میرا رجوع ہے۔''

استعانت پر عبادت کی تقدیم کا راز

سورۃ الفاتحہ میں عبادت استعانت پر چند وجوہ کی بنا پر مقدم ہے:

① عبادت اصل غرض وغایت ہے، انسان کی پیدائش ہی اسی مقصد کے لیے ہوئی ہے اوراستعانت عبادت کے لیے ایک وسیلہ اورذریعہ ہے۔یہاں غایت کو وسیلہ پرمقدم رکھا گیا ہے۔

② "ایاك نعبد" کاتعلق صفت الوہیت سے ہے اور اس کانام اللہ ہے اور "وایاك نستعین" کاتعلق صفت ربوبیت سے ہے اوراس کا نام رب ہے۔کیونکہ ابتدائے سورت میں اللہ، رب پرمقدم ہے اس لیے عبادت کواستعانت پرمقدم کیا گیا۔

③ "ایاك نعبد"یہ اللہ تعالیٰ کاحصہ ہے۔اس لیے اس کاشمار واتصال سورۂ فاتحہ کے نصف اول(حمدوثنا)کے ساتھ ہی مناسب ہے۔اور"وایاك نستعین"یہ بندے کاحصہ ہے اس بنا پراس کاذکر"اھدنا الصراط"کے ساتھ موزوں ہے۔

④ عبادت مطلقہ(کاملہ)کا مفہوم اپنے اندر استعانت کوبھی لیے ہوئے ہے۔لیکن استعانت کامفہوم اس قدر وسیع اورعام نہیں ہے کہ ہر عابد،مستعین(طالب مدد)ہے لیکن ہر مستعین عابدنہیں ہے۔کیونکہ بہت سے شہوت پرست اغراض کے بندے اللہ سے مدد تو طلب کرتے ہیں۔لیکن عبادت سے ان کی زندگی خالی ہوتی ہے۔اس اعتبار سے عبادت کامل حیثیت تو رکھتی ہے اوراس وجہ سے اس کو اللہ کاحصہ قرار دیا گیاہے۔

⑤ استعانت عبادت کاایک جزو ہے اورعبادت کادرجہ کُل کے برابر ہے۔

⑥ استعانت کے معنی ہیں، اللہ سے طلب کرنا اورعبادت یہ اللہ کی طرف سے مطالبہ ہے۔

⑦ عبادت کاملہ کا وقوع صرف مخلص ہی سے ہوسکتاہے۔باقی رہی استعانت تواس میں اخلاص ضروری نہیں اس کا صدورمخلص، غیرمخلص دونوں سے ہوسکتاہے۔

⑧ عبادت اس کا حق ہے جواس نے اپنے بندوں پرلازم ٹھہرایاہے اور استعانت کے معنی ہیں، عبادت پرمددطلب کرنا۔اس کی حیثیت صدقہ وخیرات کی سی

ہے۔ظاہر بات ہے کہ صدقہ کی طلب سے زیادہ فرض کی ادائیگی ضروری ہے۔

⑨ عبادت اس کی نعمت پر شکر کا نام ہے۔اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ اس کا شکر ادا کیا جائے اور اعانت تمہارے اوپر اس کی مہربانی پر توفیق کا نام ہے۔جب تم اس کی عبودیت (بندگی) کے پابند اور اس کی غلامی قبول کرلوگے تو پھر وہ عبادت پر تمہاری اعانت کرے گا۔گویا اس کی عبادت وغلامی اعانت کے حصول کا سبب ہے۔ اب جس قدر بھی بندہ بندگی میں مشغول ہوگا اسی قدر اللہ تعالیٰ کی اعانت اس کے شاملِ حال ہوگی۔

اس سے معلوم ہوا کہ عبادت دو اعانتوں کے درمیان گھری ہوئی ہے۔ایک اعانت، عبادت کی ادائیگی اور پابندی پر اور دوسری اعانت، آئندہ کی عبادت پر۔اسی طرح عبادت واعانت کا سلسلہ جاری رہتا ہے یہاں تک کہ پیغام اجل آ پہنچتا ہے۔

عبادت کا تعلق اس کی رضا اور محبت سے ہے اور استعانت کا معاملہ اس کی مشیت کے ساتھ ہے۔یہ سارا جہان اس کی مشیت کے ماتحت ہے۔ فرشتے، شیاطین، مؤمن، کافر اور ان کی اطاعت ومعصیت سب کا تعلق اسی مشیت سے ہے۔ لیکن مؤمنین کے ایمان اور اطاعت کے ساتھ مشیت کے علاوہ اللہ کی محبت ورضا بھی وابستہ ہے اس بنا پر کفار اہل مشیت اور مؤمنین اہل محبت ہوئے۔

مذکورہ لطائف ونکات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ'' کی تقدیم ''اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ'' پر اپنے اندر کس قدر خوبی اور جمال لیے ہوئے ہے۔

ایاك کی تقدیم فعل پر

''اِيَّاكَ'' (معبود) کو فعل ''نعبد اور نستعین'' پر مقدم کرنے کے چند اسباب ہیں:

① باری تعالیٰ کا ادب ملحوظ ہے۔

② اس کی طرف انتہائی توجہ اور تعلق کا اظہار ہے۔

③ کلام میں تخصیص اور حصر پیدا کرنا مقصود ہے۔

"اِیّاك نعبد" کے معنی ہیں "لانعبد اِلااِیّاك"، اسی طرح "اِیّاك نستعین" یعنی لانستعین اِلآبك "ہم نہیں عبادت کرتے مگر تیری اور ہم نہیں مدد چاہتے مگر تجھ سے۔"

اس قسم کے محاورات سمجھنے کے لیے ذوقِ عربیت کی ضرورت ہے۔ اگر کسی نے دس غلام آزاد کیے ہوں تو وہ صرف ایک کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ "ایاك اعتقت" (صرف تجھی کو میں نے آزاد کیا ہے۔) اسی قاعدہ کی روشنی میں "ایای فاتقون" اور "ایای فارھبون" میں غور کیجیے ان کے معنی ہیں کہ مجھ ہی سے ڈرو اور میرا ہی تقویٰ اختیار کرو۔ میرے سوا کسی دوسرے کا ڈر اور تقویٰ نہ رکھو۔

④ "ایاك" سے اصل ذات اور حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ "ایاك احببت" کے معنی ہیں "کہ میں نے تیری ذات کو ہی چاہا۔" یہ بات "احببتك" سے نہیں پیدا ہوسکتی۔ بس یہی فرق "ایاك نعبد" اور "نعبدك" میں سمجھ لیجیے۔ دوبارہ "ایاك" لانے سے کلام میں قوت اور زور پیدا ہوگیا ہے۔ مثلاً آپ نے کسی بادشاہ سے کہا:

"اِیَّاكَ اُحِبُّ وَاِیَّاكَ أَخَافُ۔"

"میں تجھ ہی کو چاہتا ہوں اور تجھ ہی سے ڈرتا ہوں۔"

اس اندازِ بیان میں خوف ومحبت کا بادشاہ کے ساتھ مخصوص ہونے کا جو زور اور اہتمام پایا جاتا ہے۔ وہ آپ کو "اِیَّاكَ اُحِبُّ وَاِیَّاكَ أَخَافُ" میں نہیں مل سکتا۔

خلاصہ فصل

عبادت واستعانت کے لحاظ سے تمام انسان چار قسموں میں بٹے ہوئے ہیں:

① عبادت اور استعانت دونوں کو اختیار کرتے ہیں، خوب عبادت کرتے ہیں اور پھر اس پر مدد بھی چاہتے ہیں۔ یہ لوگ سب سے افضل واعلیٰ ہیں۔ عبادت پر استعانت، اعلیٰ واشرف دعا ہے۔ اسی بناء پر رسول ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا کہ ہر فرض نماز کے بعد اس دعا کو ضرور پڑھا کرو:

((اَللّٰهُمَّ أَعِنِّیْ عَلٰی ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ)) [1]

”اے اللہ میری مدد کر اپنے ذکر، شکر اور اچھی عبادت پر۔“

یہی چیز ”اِیَّاكَ نعبد“ اور ”وإِیَّاكَ نستعین“ میں موجود ہے۔

② عبادت اور استعانت دونوں سے کورے، اگر کبھی اللہ سے مدد چاہتے بھی ہیں تو محض حیوانی جذبات کی تسکین اور خواہش کی پیروی کے لیے، رضائے الٰہی ان کے سامنے بالکل نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ ان کو بھی محروم نہیں رکھتا۔ اُس سے نیک وبدسب ہی مانگتے ہیں۔ وہ سب کو دیتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ معصیت کا طالب قبولیت دعا کی بنا پر اللہ کی رحمت سے اور دور ہو جاتا ہے۔

تنبیہ

قبولیت دعا کسی کرامت اور عزت کی علامت نہیں ہے۔ کبھی بندہ اپنی نادانی سے ایسی چیز طلب کرتا ہے۔ جس میں سراسر اس کی ہلاکت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کر لیتا ہے، یہ قبولیتِ دعا اس بات کی نشانی ہے کہ داعی اللہ کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس اگر کوئی صالح بندہ اس قسم کی دعا مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول نہیں فرماتا۔ اس سے مقصود داعی کی حفاظت و حمایت ہی ہوتی ہے۔

کبھی اللہ تعالیٰ ایسے بندے کی دعا بظاہر قبول نہیں کرتا۔ جس کو وہ بلند عزت دینا چاہتا ہے اور اس پر اپنی رحمت کی بارش برسانا چاہتا ہے۔ وہ اپنی نادانی سے یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ اللہ نے میری دعا قبول نہیں کی، میری اس کے ہاں کوئی وقعت نہیں ہے۔ اس طرح وہ بدگمانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا دعا کی قبولیت اور عدم قبولیت، مال و دولت کی فراوانی اور قلت اللہ تعالیٰ ان میں سے ہر ایک کے ذریعہ آزماتا ہے۔ فرمایا:

﴿فَأَمَّا الْإِنسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّيٓ

[1] سنن ابوداود ۲/ ۱۸۰ (۱۵۲۲) الصلوٰۃ: باب الاستغفار۔

أَكْرَمَنِ ۝ وَأَمَّآ إِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّيٓ أَهَانَنِ ۝ كَلَّا﴾ (۸۹/ الفجر:۱۵۔۱۷)

''انسان (کا یہ حال ہے کہ) جب اسے اس کا رب آزماتا ہے اور عزت ونعمت دیتا ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنایا اور جب وہ اس کو آزماتا ہے اس کی روزی تنگ کردیتا ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے میری اہانت کی، ایسا ہرگز نہیں۔''

یعنی میں کسی کو نعمت وخوشحالی سے سرفراز کرتا ہوں تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اللہ کا مقرب بن گیا ہے۔ بلکہ یہ تو میری طرف سے ایک آزمائش ہے کہ آیا وہ اس نعمت پر شکر ادا کر کے مزید نعمت کا مستحق بننا چاہتا ہے یا ناشکری کی بنا پر رحمت سے محروم ہونے کا خواہش مند ہے۔ اسی طرح تنگی اور ناداری بندے پر اس وجہ سے نہیں آتی کہ وہ اللہ کے ہاں ذلیل وحقیر ہے بلکہ یہاں بھی آزمائش مقصود ہے۔ اس حالت پر صبر کیا جائے تو اللہ کی طرف سے وسعت وکشادگی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اگر بے صبری اور غصہ سے کام لیا جائے تو پھر اس کے حصہ میں اللہ کا غصہ ہی آتا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تقرب الی اللہ کا معیار قبولیت دعا ہے اور نہ رزق کی فراوانی۔ بلکہ معرفت ومحبت، اطاعتِ الٰہی اصل کسوٹی ہے۔

③ عبادت بلا استعانت۔

اس گروہ کی دو قسمیں ہیں:

1 قدریہ، جن کا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمن وکافر دونوں کو پیدا کیا اور ان کے لیے اسباب وذرائع مہیا کردیئے۔ اب اس کے بعد مزید توفیق واعانت کا سلسلہ اللہ کی طرف سے بند ہے۔ ان لوگوں کی عبادت، استعانت کی لذت سے خالی ہے۔

2 یہ وہ لوگ ہیں جو نوافل درود اور وظائف میں مشغول رہتے ہیں۔ استعانت

وتوکل کا سرمایہ ان کے پاس بہت ہی کم ہوتا ہے۔ان کو اپنے سرمایہ کے مطابق توفیق واعانت کا حصہ ملتا ہے۔

توکل اور استعانت کے معنی

توکل اس کیفیت کا نام ہے جو بندے میں اللہ کی ذات اور صفات کی معرفت سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ پیدا کرنا، نفع ونقصان پہنچانا، تدبیر وانتظام کرنا ان سب امور کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔اس عقیدہ سے ایک عجیب اعتماد واطمینان کی حالت دل میں ابھرتی ہے۔جس سے اللہ کا قرب اور تعلق بڑھتا چلا جاتا ہے، اسی کو فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ (٦٥/ الطلاق:٣)

''جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو اللہ اُسے کافی ہے۔''

④ جو یہ تو جانتا ہے کہ نفع ونقصان کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن اسے یہ خبر نہیں کہ وہ کن کاموں سے ناراض اور کن سے خوش ہوتا ہے۔اس لیے وہ اپنی ہر قسم کی خواہشات کی تکمیل اسی سے چاہتا ہے۔اللہ کی طرف سے اس کے مطالبات پورے بھی کردیئے جاتے ہیں۔لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اللہ کا مقرب بن گیا ہے اور اس کے ہاں اس کی کوئی عزت ومنزلت ہے۔

خلاصہ فصل

''اِيَّاكَ نَعْبُدُ'' پر عمل اس وقت ہوسکتا ہے جبکہ اخلاص اور متابعت رسول ﷺ سے اس کا دامن بھرپور ہو۔اس اعتبار سے بھی سب لوگ چار حصوں میں بٹے ہوئے ہیں:

① اخلاص اور اتباع شریعت دونوں سے اپنے عقائد واعمال کو آراستہ رکھتے ہیں۔ریاکاری اور مخالفت سنت سے اُن کا دامن بالکل پاک ہوتا ہے۔ان کا ہر عمل محض اللہ کے لیے ہوتا ہے۔بندوں سے اپنے عمل پر نہ کوئی صلہ چاہتے ہیں اور نہ

شکریہ۔اسی لیے فرمایا:

﴿ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴾ (۱۸/ الکهف: ۱۱۰)

''پس جو اپنے رب سے ملاقات کی اُمید کرتا ہے وہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔''

دوسری آیت میں ہے:

﴿ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ ﴾

(٤/ النساء: ١٢٥)

''اس سے بڑھ کر دین میں کون اچھا ہو سکتا ہے جس نے اپنا چہرہ اللہ کے لیے جھکا دیا بحالیکہ وہ نیکو کار ہے۔''

② ایسا گروہ جو خلوص اور اتباع شریعت دونوں سے تہی دامن ہے۔یہ اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق ہے، ان پر یہ آیت صادق آتی ہے:

﴿ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۸۸)

''وہ لوگ جو اپنے کرتوتوں پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو انہوں نے نہیں کیا اس پر بھی ان کی تعریفیں کی جائیں آپ انہیں عذاب سے چھٹکارا میں نہ خیال کریں۔ ان کے لیے تو درد ناک عذاب ہے۔''

③ اخلاص تو موجود ہے لیکن اتباع رسول ﷺ ندارد،اس گروہ میں وہ جاہل مشائخ صوفیہ اور عابدین شامل ہیں جنہوں نے مختلف قسم کی خلافِ شریعت عبادات اور اوراد و وظائف ایجاد کیے ہوئے ہیں۔

④ اتباع شریعت بلا اخلاص ،اس قسم میں ریا کاروں کا گروہ داخل ہے۔[1]

[1] مدارج/ ٧٤-٨٥۔

تفسیر النصف الآخر من سورة الفاتحه

سوال ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہاں یہ فقرہ بدل واقع ہوا ہے، جس سے صراط مستقیم کی تشریح و توضیح مقصود ہے۔ لیکن یہاں تو مخاطب اللہ تعالیٰ ہے اس کے حضور میں اس کی وضاحت کی ضرورت ہی کیا ہے؟

جواب اس آیت کا نزول بندوں کی تعلیم کے لیے ہوا ہے۔ یہاں یہ بتلانا مقصود ہے کہ دعا کرنے والے کو دعا کے وقت اس کا امر کا احساس و خیال ہونا چاہیے کہ کس قسم کا عقیدہ رکھنا لازمی ہے، جس سے اس کے عقیدۂ ایمان کی پرورش کامل طور پر ہو سکے۔ کیونکہ دعا، عبادت کا مغز ہے اور مغز ہڈی میں ہوتا ہے اور ہڈی گوشت خون میں ہوتی ہے۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ عقیدۂ ایمان کا تصور دعا کے وقت ضروری ہے تو یہ امر بھی لازم ہوگیا کہ اللہ سے طلب ، التماس اور سوال حمد و ثنا کے ساتھ ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ فاتحہ میں طلبِ ہدایت کے الفاظ کے ساتھ خیر وسعادت کی آمیزش بھی ہے۔ گویا داعی اس طرح اپنے اعتقاد کو بھی ظاہر کر رہا ہے اور ساتھ ہی اس صحیح عقیدے کے ذریعہ کہ راہِ حق و صراطِ مستقیم ہی ہے، اور یہ بھی کہ یہ راہ ان لوگوں کی ہے جن کو اللہ نے اپنی نعمت و رحمت سے نوازا ہے۔ داعی اللہ کے حضور میں پہنچنا چاہتا ہے۔

جب بندہ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ کہتا ہے اور مخالفین حق کو بھی یہی کہتے ہوئے سنتا ہے کہ ہم بھی حق پر ہیں۔ تو ایسے وقت میں بندے پر لازم ہوتا ہے کہ وہ ان کے خلاف عقیدہ رکھے اور اس حق کے ظاہر کرنے کی کوشش کرے جو واقعی حق ہے۔ اس لیے ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ﴾ بطورِ بدل، وضاحت کے لیے لایا گیا ہے، تاکہ زبان بھی اس حق کے اظہار کی عادی ہو جائے، جو دل

میں پیوست ہے۔

یہ اہم دعا دو بڑے فائدوں پر مشتمل ہے:

① فائدۃ الخبر: یعنی رستہ کی استقامت کے بارے میں خبر دینا اور یہ بتلانا کہ یہ رستہ وہی ہے جو اس نے اپنے اہل نعمت کے ساتھ خاص کیا ہے۔

② لازم فائدۃ الخبر: یعنی داعی خود اس راہ کی استقامت (سیدھے ہونے) کا اقرار کرتا ہے اور اس اقرار کے بعد اپنے رب سے قرب چاہتا ہے۔

الحاصل: یہ آیات چار فوائد پر مشتمل ہیں:

① اس راہِ مستقیم کی طرف ہدایت کی دعا مانگنا۔

② اس دعا کے ذریعہ رستہ کی استقامت کی خبر دینا۔

③ اس استقامت کی تصدیق و اعتراف۔

④ اس تصدیق کے ذریعہ اللہ سے قرب حاصل کرنا۔

اس میں پانچواں فائدہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کا حکم اس لیے دیا ہے کہ یہ بندہ اس کا محتاج ہے اور یہ کہ نجات و سعادت کا دارومدار محض اسی کی ذات پر ہے۔ ایسی صورت میں بندہ پر لازم آتا ہے کہ جو کچھ وہ طلب کرتا ہے اس پر غور کرے اور معانی کے فہم و تدبر میں پوری کوشش صرف کر دے۔ یہاں "الصراط" کے وہ اوصاف بیان کیے گئے ہیں کہ اگر بندہ ان پر غور کرے اور کامل توجہ سے کام لے، تو اس سوال و طلب کی رغبت و حرص میں مزید اضافہ ہو جائے اور اس سے اپنے آپ کو کبھی بھی بے نیاز نہ پائے۔

سوال "الصراط" پر اَلْ تعریف کے لیے کیوں لایا گیا ہے۔ نکرہ لانے میں کیا قباحت تھی؟

جواب عربی بلاغت کا یہ قاعدہ ہے کہ جب موصوف پر الف لام داخل ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ موصوف اس صفت کا زیادہ حق دار ہے۔ اسی بنا پر جالس فقیها أو عالما اور جالسِ الفقيه أو العالم دونوں معنی کے لحاظ

سے یکساں نہیں ہو سکتے۔ یہی فرق اکلت طیبا اور اکلتُ الطیب میں ہے۔

حدیث میں ہے:

((اَنْتَ الْحَقُّ وَوَعْدُكَ الْحَقُّ وَقَوْلُكَ الْحَقُّ))

اخیر میں فرمایا:

((وَالْجَنَّةُ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ)) [1]

مذکورہ بالا قاعدہ کی روشنی میں اس روایت کے الفاظ میں غور وفکر کریں۔ ایسی اشیاء کے ناموں کے بعد حق پر الف لام نہیں لایا گیا ہے جو غیر قدیم (حادث) ہیں، یعنی جنت اور جہنم۔ لیکن اسم رب، اس کے وعدہ اور کلام کے بعد حق پر اَلْ لایا گیا ہے۔

اگر "إهدنا صراطا مستقیما" کہا جاتا تو یہ معنی ہوتے کہ ایک غیر معین رستہ کی طرف ہدایت کر دے۔ حالانکہ یہاں وہ معین رستہ مراد ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعام یافتہ بندوں کے لیے بنایا ہے اور اسی راہ پر چل کر انسان اپنے خالق کی رضا اور خوشنودی حاصل کرسکتا ہے۔ یہ حق وہی دین حق ہے جس کے علاوہ کوئی دین بھی صحیح معنوں میں دین کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ یہی دین ہے جو ایک جانا بوجھا راز ہے۔ جس کی معرفت، تصدیق اور تمام غلط راہوں سے اس کی امتیازی شان دل میں سمائی ہوئی ہے۔ اسی بنا پر "صراط" کو یہاں معرفہ لایا گیا ہے۔

سوال مندرجہ ذیل آیات میں "صراط" کو نکرہ کیوں لایا گیا ہے؟

1. ﴿ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ﴾ (٤٨/ الفتح:٢)
2. ﴿ وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴾ (٤٢/ الشوریٰ: ٥٢)
3. ﴿ وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴾ (٦/ الأنعام: ٨٧)
4. ﴿ قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴾ (٦/ الأنعام: ١٦١)

[1] صحیح البخاری ١/ ٣٧٧ (١٠٦٩) التهجد: باب التهجد بالليل۔

جواب ان سب آیات کا حل ایک ہی ہے۔ ان آیات میں جملہ خبریہ مستعمل ہے۔ صراطِ مستقیم کے بارے میں خبر دی جارہی ہے، طلب وسوال مقصود نہیں ہے۔ الف لام کو وہاں لایا جاتا ہے جہاں عبارت میں پہلے اس کا ذکر آچکا ہو یا مخاطب کو پہلے سے علم ہو۔ یہاں دونوں باتوں میں سے کوئی بھی نہیں پائی جاتی، لہٰذا نکرہ لایا گیا ہے۔ اسم کی اصل حالت تنکیر (نکرہ لانا) ہی ہے۔ سورۃ الفاتحہ میں معاملہ ہی دوسرا ہے۔ جب مومنین کے نزدیک ایک بات ثابت ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ایک صراطِ مستقیم ہے، جس کی طرف اس نے اپنے پیغمبروں کو ہدایت فرمائی ہے۔ تو اب دعا کے مقام پر یہ امر واضح ہے کہ جس سے ہدایت طلب کی جارہی ہے، وہی "الصراط" کا علم رکھتا ہے۔ یہاں الف لام کا لانا عجیب لطافت و حکمت پر مبنی ہے۔

اس مقام پر امام سہیلی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری توجیہ کی ہے جس کو مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے کمزور قرار دیا ہے۔

سورۃ الفتح کی ابتدائی آیات کی تفسیر

غور کریں! اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سورۃ الفتح کی ابتدائی آیات میں پانچ قسم کے عطیات کو بیان فرمایا ہے:

1. روشن اور ممتاز فتح و کامیابی۔
2. اگلی اور پچھلی لغزشوں کی معافی۔
3. صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت۔
4. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی نعمت کی تکمیل۔
5. کامل نصرت و تائید کی بخشش۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہدایت و نصرت دونوں کو جمع کر دیا ہے۔ کیونکہ ان دونوں ہی کے ذریعہ فلاح و سعادت کمال کو پہنچتی ہیں۔ ''ہدایت'' اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کے دین کا علم اور اس کی اطاعت

کا نام ہے۔ اسی کو علم صالح اور عمل نافع بھی کہہ سکتے ہیں۔

''نصر'' سے مراد یہ ہے کہ اس کے دین کو جاری اور نافذ کرنے کی پوری قدرت حاصل ہو۔ یہ نصرت (مدد) دو قسم کی ہے:

① برہان، حجت، قوتِ بیان، دلائل:

اس صورت میں دلوں کو مغلوب و تابع کیا جاتا ہے۔

② تیغ و سنان اور ظاہری اسلحہ:

ان کے ذریعے انسانی اجسام کو شکست دی جاسکتی ہے۔

قرآن نے ان دونوں اصولوں کو متعدد جگہ یکجا بیان کیا ہے۔ کیونکہ ان دونوں کے ذریعہ ہی دین کی تکمیل اور غلبہ دین حاصل ہوسکتا ہے۔

جیسا کہ قرآن میں فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (۹/ التوبہ:۳۳)

''یعنی اللہ وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، کہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے۔''

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (۵۷/ الحدید: ۲۵)

''بے شک ہم نے بھیجا رسولوں کو کھلی نشانیوں کے ساتھ اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو اتارا، تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ قائم ہو جائیں۔''

یہاں ''الکتاب'' سے مراد ہدایت ہے۔

اس کے بعد فرمایا:

﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾

(۵۷/ الحدید:۲۵)

"اور ہم نے لوہا اتارا، اس میں سخت قوت ہے اور لوگوں کے لیے فائدے ہیں۔"

یہاں "الحدید" سے مراد مادی قوتیں اور اسلحہ ہے۔ اس آیت میں بھی ہدایت "الکتاب" اور نصرت "الحدید" کو یکجا ذکر کیا گیا ہے۔

سورۂ آل عمران کی ابتدا میں ہے:

﴿الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۝ نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۝﴾ (۳/ آل عمران: ۱۔۴)

"اللہ ہی اکیلا معبود ہے، وہ زندہ اور نگران ہے۔ اس نے حق کے ساتھ کتاب کو اتارا، اس طور کہ وہ پہلی آسمانی کتب کی تصدیق کرنے والی ہے۔ اس نے تورات و انجیل کو اتارا، اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لیے اور الفرقان کو نازل کیا۔"

یہاں ہدایت کے ساتھ "الفرقان" کو بیان کیا گیا ہے۔ "الفرقان" سے مراد وہ مدد ہے جس کے ذریعے حق و باطل میں فرق کیا جا سکے۔ یہاں ہدایت و نصرت کو یکجا اس لیے لایا گیا ہے کہ ان دونوں سے حق و باطل میں پورا پورا امتیاز ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر اللہ نے اپنی نصرت و تائید کو فرقان کہا ہے:

﴿وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ﴾

(۸/ الانفال: ۴۱)

"اور جو ہم نے اُتارا اپنے بندے پر فرقان کے دن جب کہ دونوں لشکروں کی مٹھ بھیڑ ہوئی۔"

"یوم الفرقان" بدر کا دن ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی تائید اور ان کے دشمنوں کی رسوائی سے حق و باطل کے درمیان خط امتیاز کھینچ دیا۔

اور اسی قبیل سے یہ آیت ہے:

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴾

(۲۱/ الانبیاء: ٤٨)

''اور ہم نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو الفرقان، روشنی اور ذکر عطا کیا۔''

''الفرقان'' سے مراد وہ نصرت الٰہی ہے جس کے ذریعے فرعون اور اس کی فوجوں پر غلبہ حاصل ہوا۔ ''ضیاء'' اور ''ذکر'' سے مراد تورات ہے۔

سوال ''صراط'' کا ماخذ کیا ہے اور اصلی معنیٰ کیا ہیں؟

سوال عربی زبان کا محاورہ ہے، ''صَرِطت الشيء'' یعنی میں نے اس کو آسانی سے نگل لیا۔ رستہ کو ''صراط'' اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ گزرنے والے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بآسانی منتقل کر دیتا ہے، گویا اس کو نگل جاتا ہے۔

''صراط'' اسی رستہ کو کہیں گے جس میں یہ پانچ اوصاف پائے جائیں:

① مستقیم (سیدھا) ② آسان ③ آباد، چلتا پھرتا

④ کشادہ ⑤ منزل مقصود تک پہنچا دینے والا

ٹیڑھے، دشوار گزار اور بند رستہ کو ''صراط'' نہیں کہیں گے۔ عربی کلام کے مواقع استعمال پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

جریر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

امیر المومنین علی صراط   اذا أعوج الموارد مستقیم

''امیر المومنین سیدھے راستہ پر ہیں جبکہ دوسری گزر گاہیں کج اور ٹیڑھی ہیں۔''

''صراط'' بروزن فعال ہے۔ یہ وزن زیادہ تر ان اشیاء کے لیے آتا ہے جو دوسرے پر مشتمل اور چھا جانے والی ہوں۔ راستہ میں چلنے والا اسی طرح اس میں سما جاتا ہے جس طرح کہ حلق میں نگلی ہوئی چیز حلق میں۔

اسی وزن پر یہ الفاظ آتے ہیں، ان کے معانی پر غور کریں:لحاف، فراش، خمار، رداء، غطاء، کتاب...... یہ وزن تین معنوں میں مستعمل ہے:

① مصدر، جیسے قتال، حراب

② بمعنی مفعول، جیسے کتاب، غراس، بناء

③ بطور آلہ،خمار (اوڑھنی)،غطاء(ڈھکنا) ،سداد(ڈاٹ)

یہ الفاظ بطور آلہ کے استعمال ہوتے ہیں اور مفعول اس میں وہ چیز ہے جو ڈھانکی اوراوڑھی جاتی ہے۔ اسی تیسری قسم سے إلہٰ بمعنی مألوہ ہے۔سورۂ احقاف میں بجائے "صراط" کے "طریق" لایا گیا ہے اس میں ایک خاص نکتہ ہے۔مکمل آیت یوں ہے:

﴿ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ﴾ (٤٦/ الأحقاف: ٣٠)

یہاں مؤمن جنوں کا کلام نقل کیا گیا ہے ۔پہلے انہوں نے اپنی قوم کو نصیحت کرتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ جو کتاب وہ سن کر آئے ہیں وہ تو ان کی تصدیق ہی کرنے والی ہے۔گویا انہوں نے ہر طرح رسول اللہ ﷺ کے قول ﴿ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ ﴾ (٤٦/ الاحقاف: ٩) کو دہرایا ہے۔ یعنی میں کوئی پہلا رسول نہیں ہوں بلکہ مجھ سے پہلے بھی رسول آچکے ہیں، میں ان کی تصدیق اور پیغام کو زندہ کرنے والا ہوں۔ اسی بنا پر انہوں نے لفظ "طریق" استعمال کیا۔ طریق بمعنی مطروق،یعنی پامال چلتا پھرتا آباد رستہ۔ اس پر پہلے بھی انبیائے کرام چل چکے ہیں۔ یہ کوئی اچھوتا اور انوکھا رستہ نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ جب حضرت محمد ﷺ کا پیش کیا ہوا رستہ انوکھا اور نیا نہیں ہے تو مخاطبین کو یہی زیب دیتا ہے کہ جس طرح وہ رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔ اسی طرح نبی خاتم الرسل ﷺ پر بھی ایمان لے آئیں۔ لفظ طریق لا کر آنحضور ﷺ کی اتباع

کی پرزور تاکید وتنبیہ کر دی گئی۔

سوال صراط الذین، یہاں الذین مبہم لفظ کیوں لایا گیا۔ کیا صراط النبییّن مناسب نہ تھا؟

جواب اس طرز بیان سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ انعام یافتہ ہونا محض اس بنا پر ہے کہ وہ صراط مستقیم کو پاچکے ہیں۔ اس قسم کا انداز بیان قرآن مجید میں بہت سی آیات میں ملے گا، اس کا نام "تعلیق الحکم بالصّلة" ہے اس میں جو لطافت ہے وہ صراحتًا نام ذکر کر دینے میں نہیں ہے، مطلب یہ ہوا کہ انعام اس بنا پر ہے کہ وہ راہِ ہدایت پر چل رہے تھے۔ حسبِ ذیل آیات میں بھی یہی طرز اختیار کیا گیا ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ ﴾ (٢/ البقرة: ٢٧٤)

﴿ وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ ﴾ (٣٩/ الزمر: ٣٣)

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ﴾ (٤٦/ الأحقاف: ١٣)

فائدہ:

اس آیت میں دل سے تقلید کا ازالہ اور یہ یقین دلانا ہے کہ جس نے اس ہدایت کی طرف راہ پالی، وہ انعام الٰہی کا حق دار ہوگیا۔ یہاں سائل اللہ تعالیٰ سے ہدایت و انعام کا طالب ہے۔ یہی سوال اس کے ذہن میں پرورش پا رہا ہے۔

ذکر کیے گئے پہلے فوائد کی طرف نظر کریں تو معلوم ہوا کہ فائدہ نمبر۱ کا منشا یہ تھا کہ اہل ہدایت انعام یافتہ ہیں۔ اور فائدہ نمبر۲ سے مقصود ہدایت کی طلب اور سوال ہے۔

فائدہ نمبر۳ "الذین انعمت علیھم" انعام یافتہ لوگوں کے تمام طبقات کو شامل ہے۔ کسی اسم خاص کے لانے سے یہ فائدہ حاصل نہ ہوتا۔ "الذین" سے مراد انبیائے کرام، صدیقین، صالحین، شہدا سب ہیں۔ یہ سوال نہایت اہم ہے اور یہ

مطلوب نہایت ہی شاندار مطلوب ہے۔ اگر دعا کرنے والا اس دعا کی اہمیت اور عظمت کو پہچان لے تو اس کا ایک سانس بھی خالی نہ جائے۔ اس لیے کہ اس سوال نے دنیا و آخرت کی تمام بھلائیوں کو سمیٹ لیا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دن رات میں اس کا بار بار دہرانا فرض کیا ہے۔ کوئی دوسری سورت اس کے قائم مقام نہیں ہوسکتی۔

سوال "مغضوب علیهم" کے وزن پر "منعم علیهم" کیوں نہ کہا گیا۔ اَنعَمتَ لانے میں کیا حکمت ہے؟

جواب قرآن حکیم کا یہ معلوم و معروف انداز بیان ہے کہ خیرواحسان اور جودوکرم کے افعال کو صراحتاً براہِ راست اللہ کی طرف منسوب کرتا ہے اور جزا اور انتقام کے افعال کے لیے فاعل کو ذکر کیے بغیر صیغہ مجہول لاتا ہے۔ ادب و احترام کا تقاضا بھی یہی ہے ۔ یہی اسلوب اس آیت میں بھی برتا گیا ہے۔ فعل انعام کی نسبت صراحتاً اللہ کی طرف کی گئی ہے اور غضب کے بیان میں فاعل کو ذکر نہیں کیا گیا۔ چند قرآنی شواہد ملاحظہ ہوں۔

قرآنی شواہد

① حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ۝ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ۝ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ۝﴾ (۲٦/ الشعراء: ۷۸۔۸۰)

"وہ ذات جس نے مجھ کو پیدا کیا پھر وہی مجھ کو ہدایت دیتا ہے اور وہی ہے جو مجھے کھلاتا ہے اور سیراب کرتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی شفا دیتا ہے۔"

ان آیات میں پیدا کرنے اور ہدایت دینے اور کھلانے پلانے کی نسبت حضرت خلیل علیہ السلام نے اللہ کی طرف کی ہے اور بیماری کو اپنی طرف منسوب کیا۔ "مَرِضتُ" کہا، "اَمرَضَ" نہیں کہا یعنی وہ مجھ کو بیمار کرتا ہے۔

② مؤمن جنوں کا قول قرآن نے یوں نقل کیا ہے:

﴿وَأَنَّا لَا نَدْرِي أَشَرٌّ أُرِيدَ بِمَنْ فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا﴾ (۷۲/ الجن: ۱۰)

''اور ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کے ساتھ شر کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے رب نے ان کے ساتھ بھلائی چاہی ہے۔''

یہاں ارادہ رُشد (بھلائی) کے فاعل کو صراحتًا بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ارادہ شر کی نسبت اللہ کی طرف نہیں کی گئی۔

③ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا:

﴿فَأَرَدْتُ أَنْ أَعِيبَهَا﴾ (۱۸/ الکھف: ۷۹)

''میں نے چاہا کہ اس کشتی کو عیب دار بنا دوں۔''

یہاں کشتی کو عیب دار کرنے کی خواہش کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ لیکن آگے چل کر یتیم بچوں کے قصہ میں فعل خیر کے ارادہ کی نسبت اللہ کی طرف کی ہے۔

﴿فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ﴾ (۱۸/ الکھف: ۸۲)

''پھر تیرے رب نے چاہا کہ وہ بلوغت کو پہنچ جائیں اور اپنا خزانہ نکال لیں، تیرے رب کی رحمت کی بنا پر ایسا ہوا۔''

④ ﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۸۷)

''اُحِلَّ'' بصیغہ مجہول اس لیے لایا گیا ہے کہ ''رفث'' (جماع) کے ساتھ فاعل کی تصریح مناسب نہ تھی۔ لیکن ﴿وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾ (۲/ البقرۃ: ۲۷۵)

یہاں اس قسم کی قباحت نہ تھی اسی انداز پر حسب ذیل آیات کو پڑھیں اور ان پر غور کریں:

① ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ ﴾ (٥/ المائدة:٣)

② ﴿ قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ ﴾ (٦/ الانعام: ١٥١)

③ ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ ﴾ (٤/ النساء: ٢٣)

④ ﴿ وَأُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ ﴾ (٤/ النساء: ٢٤)

⑤ ﴿ فَبِظُلْمٍ مِنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ ﴾

(٤/ النساء: ١٦٠)

اس آخری آیت میں تحریم کے فاعل کو صراحتاً بیان کیا گیا ہے۔ مگر مومنین کے حق میں یوں کہا گیا ہے، ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ ﴾ (٥/ المائدة:٣)

دوسری وجہ: اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے انعام سے سرفراز فرمایا، اس بنا پر اس کا شکر مومنوں پر واجب ہے۔ شکر کی صورت یہ ہے کہ اس کی نعمتوں کا ذکر کیا جائے اور اس کی اطاعت میں سرگرم رہا جائے۔ اس شکر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس ضمیر کو بھی ظاہر کر دیا جائے۔ جس کے بیان سے منعم حقیقی کا ذکر زبان پر آجاتا ہے، اسی بنا پر "انعمت علیھم" کو "منعم علیھم" پر فوقیت حاصل ہوئی۔ یہ کلام توحید کی دو بنیادوں ذکر و شکر پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے:

﴿ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴾

(٢/ البقرة: ١٥٢)

''تم میرا ذکر کرو، میں تمہارا ذکر کروں گا، میرا شکر کرو اور میری ناشکری مت کرو۔''

تیسری وجہ: ہدایت کا انعام صرف اللہ کی طرف سے ہے اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوسکتا۔ اس لیے ضرورت تھی کہ خصوصیت کے ساتھ ضمیر واحد کے ذریعہ اس حقیقت کو بے نقاب کیا جاتا، یعنی تو ہی تنہا اس نعمت کا مالک ہے اور بخشنے والا ہے۔ لیکن غضب کا معاملہ دوسرا ہے۔ اللہ خود صراط مستقیم سے ہٹنے والوں پر غصہ ہوا اور اس نے اپنے صالحین بندوں کو حکم دیا کہ وہ بھی اس کی پیروی میں ان پر غضب ناک ہوں۔ بندگی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ رب جس سے راضی ہو

اس سے بندہ بھی خوش ہو، رب جس سے ناراض ہو، مومنین کی بھی یہی شان ہے کہ وہ اس سے ناراض ہوں، اس لیے یہاں فاعل کا ذکر نہیں کیا گیا۔ کیونکہ اس غضب میں صالحین بھی حصہ دار ہیں۔ بخلاف انعام کے وہ محض اللہ کے ساتھ خاص ہے اس میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔

چوتھی وجہ:"مغضوب علیھم" کی حیثیت ہی ایسی ہے کہ ان سے اعراض و بے توجہی لازمی ہے۔ اس لیے صرف صفت کی طرف اشارہ کر دینا ہی کافی ہے۔ ان کی ذات کو بتلانا مقصود نہیں ہے۔ لیکن اہل نعمت کے ذکر میں ان کی ذات سرتاپا ہدایت کی طرف بھی اشارہ ضروری تھا اس لیے الذین لایا گیا ہے۔ "المغضوب" میں اَلْ بھی الذین کے معنی میں ہے۔ لیکن وہ بات کہاں جو "الذین" کو صراحتًا لانے میں ہے۔

سوال کیا وجہ ہے کہ سورۂ فاتحہ میں "إھدنا" کا تعلق مفعول "الصراط" کی طرف براہ راست ہے لیکن دوسری آیات میں ایسا نہیں ہے۔ وہاں حروفِ جارہ لام اور الی کا ذکر بھی موجود ہے؟

جواب فعل ہدایت کا تعلق اپنے مفعول سے کبھی براہِ راست ہوتا ہے اور کبھی بواسطہ لام یا الی ہوتا ہے۔ یہ تینوں صورتیں قرآن میں مذکور ہیں۔ براہ راست کی مثال ایک تو یہ آیت ہے:

دوسری ﴿ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ﴾ (۴۸/ الفتح: ۲)

بواسطہ الی جیسے:

﴿ وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ: ۵۲)

بواسطہ "ل" جیسے: ﴿ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا ﴾ (۷/ الأعراف: ۴۳)

اور ﴿ إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ ﴾ (۱۷/ الإسراء: ۹)

انداز بیان کا یہ فرق ایک خاص قاعدہ کے ماتحت ہے۔ جب کسی فعل کا استعمال متعدد حروفِ جارہ کے ساتھ ہوتا ہے، تو ہر ایک حرفِ جر کے ساتھ ایک

خاص معنی اس فعل کے ہوں گے جو دوسرے حرف جر لانے کی صورت میں مراد نہ ہوں گے۔ اس لیے کہ حروف کے معانی مختلف ہیں۔ مثلاً رغبت فیه، رغبت الیه اور عدلت الیه، اور عدلت منه میں فرق ہوگا۔حروف کے اس معنوی اختلاف کو نہ سمجھنے سے آیات کا فرق ملحوظ نہیں رہ سکتا۔ اور ظاہر بین نحویوں نے "ھدیت لکذا" اور "الی کذا" کو ایک جیسا قرار دے دیا۔ لیکن فقہائے اہل عربیت اس سطحیت کے قائل نہیں ہیں، ان کا طریقہ یہ ہے کہ فعل کے معنی ہر ایک حرف کے ساتھ الگ متعین کرتے ہیں اور دوسرے حرف کے ساتھ دوسرے معنی مراد لیتے ہیں۔ پھر وہ اس نام اور اس فعل کو نگاہ میں رکھتے ہیں جس کو اس حرف سے مناسبت اور لگاؤ ہے۔پھر دوسرے فعل کو پہلے فعل کے معنی پہنا دیئے جاتے ہیں۔ یہ سیبویہ اور اس کے اصحاب کا طریقہ ہے جو بغیر لطافت ذہنی کے سمجھ میں نہیں آسکتا۔

اس مسئلہ کو وضاحت کے ساتھ مثال سے سمجھیں، قرآن میں ہے:

﴿عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ﴾ (٧٦/ الإنسان:٦)

یہاں "یَشْرَبُ" کو "یَرْوٰی" کے معنی پہنائے گئے ہیں۔ اس لیے یہاں باء کو لایا گیا ہے، جو کہ "یروی" کے ساتھ استعمال ہوتی ہے۔ اس مختصر طریقے سے ایک فعل "یشرب" کا ذکر صراحتًا اور دوسرے فعل کا اشارتًا ہوگیا۔ اسی طرح ایک شاعر نے بالوں کے بارے میں کہا ہے:

شربن بماء البحر حتیٰ روین   ثم ترفعن و صفدن

یشرب بھا، یشرب منھا سے کہیں زیادہ لطافت و فصاحت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں ری (سیرابی) کی طرف بھی اشارہ ہوگیا۔ اگر صرف "یروی بھا" کہا جاتا تو "شرب" کے معنی ظاہر نہ ہوتے۔ "یشرب بھا" سے دونوں باتیں حاصل ہوگئیں۔

اسی اصول کے ماتحت یہ آیت بھی ہے:

﴿ وَمَنْ يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴾ (۲۲/ الحج:۲۵)

فعل ارادہ کا استعمال باء کے ساتھ نہیں ہوتا ہے۔ یہاں "ھَمَّ" کے معنی "یُرِدْ" کو پہنائے گئے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ محض "ھَمَّ" (نیم پختہ ارادہ) بھی اگر الحاد کا ہو جائے تب بھی عذاب کا سزا وار ہوگا۔ اس قاعدے اور نظائر و شواہد کو جان لینے کے بعد اصل مقام پر غور کریں۔ لفظ ہدایت کا استعمال جب الی کے ساتھ ہوگا۔ اس صورت میں اس کے معنی ہوں گے منزل مقصود تک پہنچا دینا۔ جب "ل" آئے گا تب معنی ہوں گے کسی شے یا شخص کو مطلوب کے ساتھ خاص کر دینا۔ کہا کرتے ہیں کہ ھدیته لکذا یعنی ذکرته له، جعلته له، ھیأته له وغیرہ۔

﴿ إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ ﴾ (۱۷/ الإسراء: ۹)

کے معنی ہوں گے کہ "قرآن خاص اس رستہ کو بتلاتا ہے جو تمام راستوں سے زیادہ درست ہے۔" (مترجم)

جب ہدایت کا تعلق مفعول سے براہ راست ہوگا تو ان میں سے کسی ایک معنی کی خصوصیت نہ ہوگی جو کہ إلى یا لام کے ذکر کر دینے سے پیدا ہو جاتی تھی، بلکہ تمام معنی مراد ہوں گے۔ ﴿ اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ﴾ کہنے کا منشا یہ ہوا کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے سوال کر رہا ہے کہ مجھے سیدھی راہ بتلا دے۔ اس راہ کے علم و ارادہ سے سرفراز فرما دے۔ معنی کی یہ وسعت اور جامعیت حرف جر نہ لانے سے ہی پیدا ہوئی ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے اہل ہدایت ہی کو نعمتوں کے ساتھ خاص کیوں کیا ہے۔ کیا کافر اللہ کی نعمتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے؟

جواب اس بارے میں اہل علم کے دو گروہ ہیں:

① ایک کا خیال ہے کہ کافر پر اللہ کی کوئی نعمت ہی نہیں ہے۔ اللہ نے خود فرمایا ہے:

﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ﴾

(٤/ النساء: ٦٩)

''یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں یہی لوگ ہیں جو انعام یافتہ لوگوں کے ساتھ ہوں گے۔''

اس آیت میں فرمانبرداروں کے لیے انعام یافتہ طبقات کی معیت و رفاقت کو خاص کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ کفار اس سے محروم ہیں۔ نیز فرمایا:

﴿ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ ﴾ (٢/ البقرة: ١٥٠)

''اور تاکہ پوری کردوں اپنی نعمت تم پر۔''

یہ بات بھی ظاہر ہے کہ انعام، سزا اور انتقام کے منافی ہے۔ اس شخص کے لیے کون سی نعمت ہوسکتی ہے جو دائمی عذاب کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

② دوسرا گروہ، کفار کے لیے نعمت کا قائل ہے۔ اس کے دلائل یہ ہیں:

﴿ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ﴾ (١٤/ ابراهيم: ٣٤)

''اور اگر تم اللہ کی نعمتیں شمار کرنا چاہو تو تم شمار نہیں کر سکتے۔''

﴿ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ ﴾

(٢/ البقرة: ٤٠)

''اے بنی اسرائیل! میری نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی ہیں۔''

یہ خطاب یہود سے ہو رہا ہے جب کہ وہ کفر کی حالت میں تھے۔

سورۂ نحل میں ہے:

﴿ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ ﴾ (١٦/ النحل: ٨١)

''اللہ اس طرح پوری کرتا ہے اپنی نعمت تم پر تاکہ تم مسلمان بن جاؤ، پھر بھی اگر تم اعراض کرو تو اے نبی! تمہارے اوپر واضح طور سے پیغام پہنچا دینا ہے۔''

﴿ يَعْرِفُونَ نِعْمَتَ اللَّهِ ثُمَّ يُنكِرُونَهَا وَأَكْثَرُهُمُ الْكَافِرُونَ ﴾

(١٦/ النحل: ٨٣)

''اللہ تعالیٰ کی نعمت کو پہچانتے ہیں۔ پھر اس کا انکار کر دیتے ہیں اور اکثر ان میں سے کافر ہیں۔''

یہ آیت اس بارے میں نص واضح ہے کہ کافر بھی اللہ کی نعمت سے مستفید ہوتے ہیں اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ مومن وکافر سب ہی اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس کھلی ہوئی حقیقت کا انکار ہٹ دھرمی نہیں تو اور کیا ہے۔ حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں گروہوں کے درمیان اعتدال و میانہ روی کی راہ یہ بتلائی ہے کہ کامل نعمت، اہل ایمان کے ساتھ خاص ہے۔ اس میں کوئی کافر ان کا شریک نہیں ہے۔ باقی رہی مطلق نعمت یعنی نعمتوں میں سے کچھ حصہ، تو اس میں مومن وکافر سب شریک ہیں۔ نعمت کاملہ اور رحمت تامہ کا دامن ابدی سعادت اور دائمی راحت سے بندھا ہوا ہے۔ یہ غیر مشترک اور مخصوص ہے اور مطلق نعمت سے ساری مخلوق بلا تخصیص فائدہ اٹھاتی ہے۔ اب اگر کفار سے نعمت کاملہ کی نفی مقصود ہے تو اس کی صحت پر کوئی کلام نہیں اور اگر مطلق نعمت کا سلب (نعمت چھین لینا) مراد ہے تو بھی یہ صحیح نہیں۔ اسی طرح کفار کے لیے نعمت ثابت کرنے والے، نعمت سے اگر کامل نعمت مراد لیتے ہیں تو وہ غلطی پر ہیں اور اگر فی الجملہ نعمت مراد ہے تو درست ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ ﴿ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا ﴾ (٢/ البقرة: ٤٠) میں اللہ تعالیٰ یہود کو وہ نعمتیں یاد دلا رہا ہے جو اس کے آباء و اجداد پر نازل ہوئیں۔ اس آیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک ایک کر کے اپنی نعمتوں کا شمار کیا ہے: فرعون سے نجات، سمندر میں رستہ بن جانا، موسیٰ علیہ السلام سے چالیس رات کا وعدہ، ان کے بعد بنی اسرائیل کی گمراہی، پھر توبہ اور معافی، بادلوں کا سایہ، من وسلویٰ کا اترنا وغیرہ وغیرہ۔ ان نعمتوں کے ذکر کرنے سے مقصود ہے کہ یہود ایمان و اطاعت پر

آمادہ ہو جائیں اور اللہ کی نافرمانی سے باز رہیں ورنہ وہی حشر ان کا بھی ہوگا جو اس کے اسلاف کا ہو چکا ہے۔ ان کے اسلاف پر انعام، ان پر انعام کے ہم معنی ہے اس لیے ان پر بھی شکر گزاری لازم ہے۔ اب بجائے شکر کے کفر اور بجائے تصدیق کے تکذیب و عداوت اختیار کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ بہرحال یہاں حالتِ کفر میں نعمت کاملہ مراد نہیں ہو سکتی۔

سوال "غیر المغضوب علیھم" کے بجائے "لا المغضوب علیھم" کیوں نہیں کہا گیا؟

جواب اصل میں لا کا استعمال اثبات کے بعد ہوتا ہے۔ کہا کرتے ہیں:

جاء نی العالم لا الجاھل "میرے پاس عالم آیا، جاہل نہیں آیا۔"

یہ لا عطف کے لیے آتا ہے۔ لیکن غیر، اپنے ماقبل کا تابع ہوتا ہے اس میں وصفی معنی پائے جاتے ہیں اور لا کے ہم معنی نہیں ہے۔ یہاں عطف کے بجائے صفت کے معنی زیادہ مناسب ہیں۔ عطف اور وصف کے فرق کو سمجھ لینے سے اس آیت کی لطافت واضح ہو جائے گی۔ لا المغضوب علیھم کے معنی اس سے زیادہ نہ ہوں گے کہ مغضوب علیھم سے صراط کی نسبت سلب کر لی جائے۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے:

جاء نی العالم لا الجاھل، اس کے معنی بس اتنے ہی ہیں کہ عالم کے لیے مجيء (آنا) ثابت اور جاہل سے اس فعل کی نفی کر دی جائے۔ مگر غیر اپنے سے پہلے کلمہ کی صفت ہوتا ہے اس طرز بیان سے دو وصف حاصل ہوئے۔ ایک وصف ثبوتی "منعم علیھم" دوسرا سلبی "غیر المغضوب علیھم" لا کے ذریعہ جو فائدہ حاصل ہو سکتا تھا وہ بھی حاصل ہو گیا اور ساتھ ہی مزید حمد و ثنا ثابت ہو گئی اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ اہل ایمان غضب والوں سے قطعاً مختلف ہیں، وہ غضب کے مستحق نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غیر یہاں بطور صفت کے لایا گیا ہے، نہ کہ

بصورتِ استثنا۔ دوسری حالت میں وصفی معنی فوت ہو جاتے جو کہ اصل مقصود ہیں۔

دوسرا فائدہ: اہل کتاب یہود و نصاریٰ اس بات کے مدعی ہیں کہ ہم ہی انعام یافتہ ہیں، مسلمان نہیں ۔ تو اس کے جواب میں کہا گیا کہ انعام یافتہ تم نہیں بلکہ تمہارے غیر ہیں اور مسلمانوں سے خطاب ہے کہ نعمت والے تم ہو نہ کہ تمہارے غیر۔ یہاں لفظ غیر پوری طرح مغایرت (اجنبیت) کو بتلا رہا ہے۔

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اس آیت میں یہود و نصاریٰ کا صراحتًا نام نہیں لیا گیا ہے، ان کے وصف کو بیان کیا گیا ہے۔ اس سے ان کی صفات مغضوبیت و ضلالت کو بے نقاب کرنا مقصود ہے اور یہ کہ ان کی راہ، انعام یافتہ مومنین کی راہ سے بالکل الگ ہے۔ اس لیے کہ انعام کامل، غضب و ضلال کے یکسر منافی ہے۔ یہ انعام کامل کسی مغضوب علیہ اور ضال کے لیے ثابت نہیں ہوسکتا۔

سوال غیر باوجود اضافت کے نکرہ ہی رہتا ہے۔ اس کو "الذین" (معرفہ) کی صفت کیسے قرار دے سکتے ہیں؟

جواب اس اعتراض کے کئی جواب دیئے جاسکتے ہیں جن کا تذکرہ آیندہ صفحات پر آئے گا۔ بعض لوگوں نے غیر کو بدل بھی بنایا ہے جو درست نہیں۔ بدل بنانا تین وجوہ سے درست نہیں ، پہلی وجہ یہ ہے:

① مبدل منہ (متبوع) اور بدل (تابع) ان دونوں میں سے دوسرا اسم اصل مقصود ہوتا ہے۔ اور پہلا اسم بطور تمہید لایا جاتا ہے۔ مثلا:

﴿ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ﴾

(۳/ آل عمران: ۹۷)

"اللہ کے لیے لوگوں پر بیت اللہ کا حج فرض ہے، ان پر جو رستہ کی استطاعت رکھتے ہیں۔"

یہاں مَن استطاع بدل واقع ہے اصل مقصود یہی ہے۔ الناس محض تمہید

کے لیے آیا ہے۔ اسی طرح عام طور پر کہا کرتے ہیں:

أعجبنی زید علمه ''یعنی مجھے زید، اس کے علم نے لبھا لیا۔''

یہاں اصل مقصود ''علمه'' ہے، زید صرف تمہیداً مذکور ہے۔ اسی انداز پر دو آیتیں ہیں:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ﴾ (۲/ البقرة: ۲۱۷)

''وہ آپ سے دریافت کرتے ہیں حرمت والے مہینے، اس میں لڑائی کے بارے میں۔''

یہاں سوال قتال سے ہے نہ کہ محض شہر حرام سے۔ یہاں اصل مطلوب قتال ہے نہ کہ الشهر الحرام۔ اسی طرح فرمایا:

﴿لَنَسْفَعًاۢ بِالنَّاصِيَةِ ۝ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۝﴾ (۹۶/ العلق: ۱۵، ۱۶)

''ہم ضرور گھسیٹیں گے پیشانی کے بالوں سے، جھوٹی خطا کار پیشانی کے بالوں سے۔''

اس آیت سے بھی اصل مقصود ''ناصية كاذبة'' ہے۔ ''الناصية'' صرف تمہیداً لایا گیا ہے۔

اب اصل آیت کی طرف نظر کریں! یہاں منعم علیھم کا ذکر اور صراط کی نسبت، ان کی طرف درحقیقت مطلوب و مقصود ہے۔ اور غیر المغضوب بطور تکملہ اور تتمہ کے لایا گیا ہے۔ یہ وصف اصل مقصد کے لیے کمال و وضاحت پیدا کر دیتا ہے۔ خود مقصود بالذات نہیں ہے۔

② بدل، مبدل منہ کے لیے تاکید و تکرار کا حکم رکھتا ہے۔ اگر مبدل منہ کی جگہ بدل کو رکھ دیا جائے تو کلام میں کوئی خلل پیدا نہ ہو۔ مثلاً قرآن کے علاوہ اگر کسی عبارت میں یوں کہا جائے:

''لله حج البيت على من استطاع اليه سبيلا'' تو غلط نہ ہوگا۔ یا کوئی اس طرح دعا مانگے:

"إهدني صراط من انعمت عليه"

تو اس کی صحت میں کلام نہیں ہوسکتا۔ لیکن اگر "غير المغضوب عليهم" کو بدل مان لیا جائے تو اس کے معنی ہوں گے کہ اس لفظ کو "الذين انعمت عليهم" کی جگہ رکھ سکتے ہیں حالانکہ اس صورت میں کلام کا اصل مقصود ہی فوت ہو جاتا ہے۔ مقصد تو یہ تھا کہ صراط کی نسبت الذین انعمت علیھم کی طرف کی جائے نہ کہ غیر المغضوب علیھم کی طرف۔ نیز غیر کے لانے سے اصل غرض تو یہ تھی کہ اہل نعمت کی حمد وثنا میں لفظ غیر کے ذریعہ اضافہ کیا جائے۔

③ غیر بدل واقع ہو ہی نہیں سکتا۔ صفت، حال، استثنا: انھی تینوں صورتوں میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اصل وضع کے اعتبار سے اس کا استعمال مستقل طور پر نہیں ہوسکتا۔ صرف تابع کی حیثیت سے اس کو لایا جاسکتا ہے۔ "جاء نی غیر زید" بہت ہی کم بولا جاتا ہے۔ بخلاف بدل کے کہ اس کی حیثیت کلام میں مستقل اور مقصود بالذات ہوتی ہے۔ بدل اور صفت میں فرق یوں سمجھیں کہ اول الذکر میں مبدل منہ بطور زینہ کے لایا جاتا ہے اور مقصود بدل ہوتا ہے۔ جبکہ صفت میں اصل مطلوب موصوف ہوتا ہے۔ صفت وضاحت یا تشریح یا کسی اور فائدہ کے لیے لائی جاتی ہے۔ اب غور کرلیں، کیا یہاں "غير المغضوب" بدل واقع ہوسکتا ہے؟

جواب دوم: "الذین" اسم موصول ہے جو مبہم غیر معین ہے، اس لیے اس کی صفت نکرہ، غیر کو لانا درست ہے۔ (اصل بحث میں کچھ سوال و جواب ہے جس کی افادی حیثیت عام فہم نہیں، اس لیے نظر انداز کر دیا گیا۔ مترجم)

جواب سوم: یہاں غیر اضافت کی وجہ سے معرفہ ہوگیا ہے۔ غیر کے بعد معرفہ ہونے سے مانع، اس کا ابہام وعموم ہے۔ لیکن یہاں دو متضاد وصفوں کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے اس لیے ابہام جاتا رہا اور تعین پیدا ہوگیا۔ یہاں غیر، انعمت اور مغضوب کے درمیان واقع ہے۔ اس کی نظیر کلام عرب میں یوں ملتی

ہے:

نحن بنو عمر و بن الھجان الازھر، النسب المعروف غیر المنکر۔

یہاں غیر، معروف اور منکر کے درمیان واقع ہیں۔ اس لیے اس کو النسب معرفہ کی صفت قرار دینا صحیح ہوا۔ اسی طرح کہا کرتے ہیں:

المحسن غیر المسیی والبر غیر الفاجر۔

ان اُمثلہ میں غیر کو نکرہ ماننا غلط ہے ابہام اور عموم تو یہاں باقی ہی نہیں رہا۔

سوال ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ کو بصورت بدل لانے کی کیا ضرورت تھی۔ مبدل منہ تو نیت میں ساقط الاعتبار ہوتا ہے؟

جواب مبدل منہ، علی الاطلاق ساقط اعتبار نہیں ہوتا بلکہ اس کی دو قسمیں ہیں:

① بدل بعض اور بدل اشتمال، یہاں مبدل منہ کا اعتبار نہیں ہوتا۔

② بدل الکل، اس صورت میں بدل بمنزلہ تاکید اور یاد دہانی کے لیے لایا جاتا ہے اور اس کے کلام میں نسبت اسنادی کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے۔ جب یہ کہا گیا ہے:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾

”بتا ہم کو سیدھی راہ۔“

تو دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ راہ ہمارے ساتھ ہی خاص ہے یا ہم سے پہلے کوئی دوسرا بھی اس راہ میں چلا ہے۔ ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ سے یہ سوال حل ہو جاتا ہے۔ مزید وضاحت کے لیے اس کی مثال یوں سمجھیے کہ آپ کسی انجان کو رستہ بتلا رہے ہیں کہ یہ راہ تمہاری منزل مقصود تک پہنچے گی پھر آپ اس کے اطمینان اور مزید تاکید کے لیے یوں کہتے ہیں کہ یہ راہ وہ

ہے جس پر تم سے پہلے بہت سے مسافر چل کر اپنی منزل مقصود پا چکے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اس صورت میں انجان مسافر کے دل میں سفر کا جو عزم اور بلند ہمتی پیدا ہوسکتی ہے، وہ صرف رستہ بتلا دینے سے پیدا نہیں ہوتی۔ عام انسانی فطرت یہی ہے کہ کسی نمونہ کو دیکھے اور پھر میدان عمل میں کود پڑے۔

سوال "مغضوب علیھم" کی تفسیر یہود اور "ضالین" کی تفسیر نصاریٰ سے کیوں کی جاتی ہے۔ یہ دونوں وصف تو باہمی لازم ملزوم ہیں، جو مغضوب ہے وہ ضال بھی ہے اور جو ضال ہے وہ مغضوب ہے؟

جواب نصاریٰ کو ضال، یہود کو مغضوب کہنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے وصف سے خالی ہے۔ بلکہ دونوں میں سے ہر ایک ضال بھی ہے اور مغضوب بھی۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر فریق کے ساتھ وہ وصف خصوصیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس کا وہ حق دار ہے اور جس کے ساتھ وہ مشہور ہے۔ اس تفسیر سے ذیل کی آیات کی طرف اشارہ ہے۔ یہود کے حق میں کہا گیا ہے:

﴿ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۹۰)

"برا ہے وہ جس کے عوض انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا ہے کہ وہ کفر کرتے ہیں اس کا جو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے سرکشی کی راہ سے (محض اس بنا پر) کہ اللہ اتارتا ہے اپنا فضل جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے پس وہ پے در پے غضب کے ساتھ پلٹے۔ اور منکروں کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔"

اس آیت کی تفسیر میں چند اقوال ہیں:

① ان کے دو گناہ تھے، کفر اور بغاوت، اس لیے دوہرے عذاب کے مستحق ہیں۔

اسی کے ہم معنی یہ آیت ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ ﴾

(١٦/ النحل: ٨٨)

”جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا، ان پر ہم عذاب پر عذاب بڑھا دیتے ہیں۔“

پہلا عذاب کفر کی بنا پر اور دوسرا عذاب، راہِ حق سے روکنے کی وجہ سے۔

② پہلا غضب تورات کے بدلنے اور انبیا کرام کے قتل کی بنا پر اور دوسرا غضب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے۔

③ یہ دو غضب ان کے کفر کی وجہ ہیں، پہلا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار اور دوسرا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار۔

④ اصل بات یہ ہے کہ یہاں دو غضب مراد نہیں ہیں۔ جیسا کہ تثنیہ میں ہوتا ہے بلکہ ان کے بار بار کفر، قتل انبیا، فساد اور اللہ کے رسولوں سے مسلسل عداوتوں کی وجہ سے ان پر پے در پے غضب الٰہی برستا رہتا ہے۔ ان کا ہر عمل الگ الگ ایک مستقل غضب کو چاہتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ ﴾

(٦٧/ الملك: ٣)

”پس لوٹاؤ نگاہ کو کیا تم دیکھتے ہو اس میں کوئی شگاف؟ پھر لوٹاؤ نگاہ کو بار بار۔“

یہاں ”کرتین“ کے معنی بار بار کے ہیں نہ کہ صرف دوبارہ کے۔ پس یہی معنی ﴿ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ ﴾ (٢/ البقرة: ٩٠) کے ہیں۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ انہوں نے تورات کے حدود و احکام کو معطل کرکے رکھ دیا، اس کی تحریف کر ڈالی۔ انبیائے کرام کو جھٹلایا، قتل کیا، مسیح علیہ السلام کا انکار کیا۔ ان کے قتل کے درپے ہوئے، ان کی ماں پر بدترین تہمت اور بہتان باندھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو

جھٹلایا، ان سے جنگ کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ مسلمانوں کو ستانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ خود گمراہ ہوئے اور لوگوں کو سختی کے ساتھ راہِ حق سے روکا۔ ان کا ہر جرم ایک مستقل غضب الٰہی کا تقاضا کرتا ہے۔ گویا یہ امت سرتاپا غضب ہی غضب ہے۔ کیا ایسی صورت میں یہ لوگ بہ نسبت نصاریٰ کے مغضوب علیہم کہلانے کے زیادہ لائق نہ ہوں گے؟

دوسری جگہ فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۚ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ۚ﴾

(۵/ المائدۃ: ٦٠)

”کہہ دو کہ میں تم کو بتلاؤں، اس سے بھی زیادہ برے بدلے میں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور غضبناک ہوا اور بنا دیئے ان میں سے بندر اور سور اور پوجا انہوں نے طاغوت کو۔“

یہاں غضب کو لعنت اور مسخ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یہ غضب کی انتہائی سخت صورت ہے۔ نیز فرمایا:

﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۚ...... أَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾ (۵/ المائدۃ: ۷۸)

”جن لوگوں نے بنی اسرائیل میں سے کفر کیا ہے ان پر داؤد اور عیسیٰ علیہما السلام کی زبانی لعنت کی گئی...... کہ اللہ ان پر ناراض ہوا۔“

باقی رہی ”ضالین“ کی تفسیر، نصاریٰ کے ساتھ۔ تو اس کی تائید اس آیت میں ملتی ہے:

﴿قُلْ يٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا أَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَأَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ۝﴾

(۵/ المائدة: ۷۷)

''اے اہل کتاب! دین کے معاملہ میں غلو نہ کرو سوائے حق کے۔
اور ایسی قوم کی خواہشات کی پیروی مت کرو جو پہلے گمراہ ہو چکی
اور بہت سوں کو گمراہ کر چکی اور خود بھی سیدھی راہ سے بہک گئی۔''

یہاں اہل کتاب سے مراد نصاریٰ ہیں۔ اس سے پہلے کی آیت میں ذکر ہے کہ:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ...... وَضَلُّوْا عَنْ سَوَاۗءِ السَّبِيْلِ﴾ (۵/ المائدة: ۷۲)

''بلاشبہ انہوں نے کفر کیا جو کہتے ہیں کہ اللہ وہی ابن مریم ہے
حالانکہ مسیح نے کہہ دیا ہے، اے بنی اسرائیل! میرے اور اپنے رب
اللہ کی عبادت کرو۔''

یہ نصاریٰ کا حال بیان کیا گیا ہے کہ پہلے خود گمراہ ہو گئے پھر دوسروں کو گمراہی میں ڈالا۔ پھر جب نبی آخر الزمان ﷺ کی بعثت ہوئی تو تکذیب وکفر کی وجہ سے مزید ضلالت میں مبتلا ہو گئے۔ اس طرح ان کی گمراہی کئی گنا بڑھ گئی۔ یہ تفصیل زمخشری کے قول کی بنا پر ہے لیکن یہ ضعیف ہے درحقیقت یہاں آنحضور ﷺ کے ہم زمانہ نصاریٰ کے اسلاف مراد ہیں۔ اس آیت میں ان کی تین صفتیں بیان ہوئی ہیں:

① خود گمراہ ہوگئے۔
② دوسروں کو گمراہ کیا۔
③ سیدھی راہ سے ہٹ گئے۔

عہد نبوی کے نصاریٰ کو ان کے اسلاف کی روش سے روکا گیا ہے نہ کہ ان کی روش سے کسی دوسری قوم کو۔ اس لیے یہاں عہد نبوی کے عیسائی مراد لینا درست نہیں۔ اس مقام پر غور کرو یہ آیت کس طرح نصاریٰ کی پے درپے اور حد

سے بڑھی ہوئی دین سے ناواقفیت ظاہر کر رہی ہے۔ اس آیت میں ضلال کو بار بار لایا گیا ہے۔ جیسا کہ یہود کے تذکرہ میں غضب کو دہرایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نصاریٰ بہ نسبت یہود کے ضلال و گمراہی میں زیادہ نمایاں درجہ رکھتے ہیں۔

ضلال کی تین قسمیں ہیں:

① ضلال فی الغایۃ: منزل مقصود متعین کرنے میں بھٹک جانا۔

② ضلال فی الوسیلۃ: منزل مقصود کی صحیح معرفت تو حاصل ہو جائے لیکن اس تک پہنچنے کی راہ مقرر کرنے میں غلطی ہو جائے۔

③ اس ضلال کی طرف دوسروں کو بھی دعوت دی جائے۔

نصاریٰ کے اسلاف میں یہ تینوں ضلالتیں جمع ہوگئیں۔ انہوں نے اپنے الٰہ (معبود) کے متعلق یہ تصور کر لیا کہ وہ کھاتا پیتا ہے، روتا ہے اور وہ قتل کیا گیا، سولی پر چڑھایا گیا۔ یہ اصل مقصود کے پانے میں گمراہی ہے۔ اسی طرح ان سے منزل مقصود تک پہنچانے والی راہ کے متعین کرنے میں بھی غلطی ہوئی ہے اور پھر اس غلطی کی طرف دوسروں کو بھی انہوں نے دعوت دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نصاریٰ بہ نسبت یہود کے ضلال میں زیادہ ڈوبے ہوئے ہیں۔

یہود کا انکار عدم علم کی بنا پر نہ تھا بلکہ آنحضرت ﷺ کو خوب اچھی طرح پہچانتے تھے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے بچوں سے واقف تھے۔ صرف حسد، تکبر، حرام خوری کی چاٹ اور عزت و سرداری کی چاہت نے ان کو قبول حق سے اور اتباع نبوی سے باز رکھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انہی مذکورہ بالا امور کی بنا پر ان کو سخت ڈانٹ پلائی ہے اور نصاریٰ کو جہل وضلال اور عدمِ معرفت کی وجہ سے تنبیہ کی گئی ہے۔

کفر و بغاوت کبھی تو عدم معرفت اور لاعلمی سے ہوتی ہے اور کبھی حق سے بے پرواہی اور عدمِ توجہی کی بنا پر، یہود کا کفر دوسری قسم کا ہے اور نصاریٰ کا کفر پہلی صورت سے تعلق رکھتا ہے۔ جب نصاریٰ نے حق کے ظاہر و واضح ہو جانے

کے بعد بھی اپنے کفر پر اصرار کیا تو وہ بھی امت مغضوبہ یہود کے مشابہ ہوگئے اور مغضوب و ضال دونوں کے مصداق بن گئے۔

پھر جب کہ ہدایت و سعادت، فلاح و نجات کا تمام تر دارومدار حق کو پہچاننے، اسے اختیار کرنے اور اس کے مطابق عمل کرنے پر ہے، خواہ اس صورت میں دنیوی فائدوں اور تمناؤں کا خون کتنا ہی کیوں نہ ہو اور یہ کہ جہالت بندے کو حق کی معرفت اور تکبر حق کی طلب سے روک دیتا ہے، ان حالات میں بندے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں اللہ سے صراط مستقیم کی طلب جاری رکھے۔ اس پر چلنے کے لیے ہمیشہ ہدایت، توفیق اور مدد مانگتا رہے، تاکہ اس طرح وہ مغضوب علیھم کی راہ سے الگ ہو جائے۔ جنھوں نے باوجود علم کے قصداً سیدھی راہ سے علیحدگی اختیار کی ہے اور نصاریٰ کے طریقے سے بھی، جنھوں نے جہالت و ضلالت کی راہ سے حق کو قبول نہیں کیا۔

علمائے سلف کا قول ہے کہ ہمارے علما میں سے جو بگڑے وہ یہود سے مشابہت رکھتے ہیں اور عابدوں، زاہدوں کی جماعت میں سے جو گمراہ ہوئے وہ نصاریٰ کے مانند ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ ہمارے وہ علما جنھوں نے یہودی اخلاق کو اپنایا، آیات قرآنی کو غلط معنی پہنائے اور محض اس بنا پر کہ ان کی اغراض فاسدہ کو ٹھیس لگتی ہے۔ انھوں نے حق کو چھپایا علمائے حق کے فضل و کمال پر حسد کیا۔ کتاب و سنت اور عدل و انصاف کی طرف بلانے والے اہل علم کے درپے آزار ہوگئے۔ ان کو قتل کی دھمکیاں دیں۔ حرام و حلال کے درمیان تمیز اٹھا دی۔ اور محرمات و ممنوعات کو طرح طرح کی حیلہ سازیوں سے جائز کر ڈالا۔ کیا ایسے لوگ یہود کے مشابہ نہ ہوں گے؟ اسی طرح ہمارے عابدوں، زاہدوں کا وہ گروہ بھی ہے جس نے عبادت الٰہی کو اپنی خواہش کے سانچے میں ڈھال لیا۔ کتاب و سنت کی پابندیوں سے آزاد ہوگئے، مشائخ کو خدا کا درجہ دے دیا اور حلول و الحاد ہمہ اوست تک کے قائل ہوگئے۔ کیا یہ گروہ نصاریٰ کا پیرو نہ کہلائے گا؟

ایک مسلمان کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان دونوں گروہوں کی مشابہت و اتباع سے دور رکھے۔جس شخص نے ان دونوں قسم کی مشابہتوں اور صفتوں کو پہچان لیا اور مخلوقات کے حالات سے آگاہ ہوگیا۔ وہ اس سورۃ الفاتحہ کی دعا کی اہمیت و ضرورت سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ یہی وہ دعا ہے جس سے بڑھ کر کوئی دعا مفید اور نفع بخش نہیں ہوسکتی۔ اس ظاہری زندگی اور سانس کی آمدورفت سے کہیں زیادہ انسان اس دعا کا محتاج ہے ۔ سانس کی بندش اور ظاہری زندگی کے ختم ہونے سے صرف موت ہی طاری ہوتی ہے ۔لیکن اس دعا سے محرومی تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدبختی اور مصیبت میں مبتلا کر دیتی ہے بس اب بندے کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں کہ صراط مستقیم جو اللہ کے انعام یافتہ بندوں کی راہ ہے، اس کو اپنے رب سے طلب کرے اور یہی سوال اس کی زبان پر ہمیشہ جاری رہے۔

سوال اہل غضب کے لیے اسم مفعول کا صیغہ اور اصحاب ضلال کے لیے اسم فاعل کا وزن اختیار کیا گیا ہے۔ اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب ظاہر بات ہے کہ اہل غضب وہ ہیں جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔ ان کو مغضوب کہنا ہی صحیح ہے۔ باقی رہے اہل ضلال تو یہ خود گمراہ ہوئے اور گمراہی کو انہوں نے پسند کیا، یہاں ضال لانا مناسب تھا اور یہ وجہ بھی ہے کہ "مضلین" (گمراہ کیے گئے) کہنے کی صورت میں ان کے لیے ایک قسم کا عذر کا پہلو نکل آتا کہ خود گمراہ نہیں ہوئے بلکہ گمراہ کیے گئے ہیں۔ مگر یہ بھی واضح رہے کہ اس توجیہ کی بنا پر منکرین تقدیر (قدریہ) کے لیے استدلال کی گنجائش نہیں ہے۔ اس آیت کا منشا یہ ہے کہ یہ لوگ گمراہ ہوگئے ۔لیکن اضلال کی اصل نسبت اللہ ہی کی طرف ہے۔ (کیونکہ اسباب ضلال کا خالق وہی ہے ......مترجم)

اس آیت میں گروہ جبریہ کا بھی رد ہے۔ جو بندے کی طرف کسی فعل کی نسبت کو حقیقتاً جائز قرار نہیں دیتے۔"اھدنا الصراط" سے قدریہ کی تردید ہوگئی۔

چنانچہ اس پوری آیت میں قدریہ اور جبریہ کے عقائد فاسدہ کا ابطال موجود ہے اور ساتھ ہی مذہب اہل حق اہل سنت کی تائید و نصرت کا بھی واضح بیان ہے۔ اصل میں اہل حق ہی کا مسلک صحیح ہے جو کہ بلحاظ توحید و خلق، تقدیر و قدرت کے قائل ہیں اور عمل وکسب کے اعتبار سے بندوں کے افعال کی نسبت ان کی طرف کرتے ہیں۔

اس آیت سے تقدیر، شریعت، قیامت اور نبوت سب ثابت ہوگئے، نبوت کا ثبوت اس طرح ہوا کہ نعمت اور غضب، عذاب وثواب کا دوسرا نام ہے اور نعمت والے انبیائے کرام اور ان کے پیروکار ہی ہیں۔ متبعین کو جو کچھ بھی ہدایت ملی ہے وہ انبیائے کرام کے ذریعے ہی سے ملی ہے۔ کیونکہ انسان کی نجات کے لیے اللہ کی ہدایت ضروری ہے اور یہ ہدایت انبیائے کرام کی راہنمائی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس دلیل سے وضاحت و اختصار کے ساتھ نبوت ثابت ہوگئی۔ یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ اس ہدایت کا پھل وہ کامل نعمت ہے جو دارالنعیم جنت میں حاصل ہوگا اور اس کی مخالفت کا بھی ایک ثمر ہے اور وہ دائمی بدبختی کی صورت میں غضب الٰہی کا نزدل ہے۔ غور کیجیے کہ یہ سورت باوجود اختصار کے، دین کے کتنے عظیم اور اہم مطالب پر مشتمل ہے۔

سوال "مغضوب علیھم" کو "ضآلین" پر مقدم کرنے میں کیا مصلحت ہے؟

جواب یہ تقدیم چند وجوہ کی بنا پر ہے:

① "مغضوب علیھم" (یہود) بلحاظ زمانہ مقدم ہیں۔

② یہود مدینہ میں آپ کے پڑوس میں آباد تھے، نصاریٰ کی بستیاں دور تھیں۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن میں یہود سے زیادہ خطاب کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ، آل عمران، مائدہ ان سورتوں میں غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

③ یہود کا کفر بہ نسبت نصاریٰ کے زیادہ سخت ہے۔ اس لیے غضب، لعنت اور

عقوبت خاص طور سے ان پر مسلط ہے۔ ان کا کفر سرکشی اور بغاوت کی راہ سے آیا ہے۔ ان کی روش سے بچانے کے لیے لازمی تھا کہ ان کا ذکر پہلے کیا جاتا اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ناواقف مجرم اور جان بوجھ کر سرکشی کرنے والے دونوں یکساں نہیں ہوسکتے۔

④ اس سے پہلے "منعم علیھم" کا ذکر ہو چکا ہے۔ غضب انعام کی ضد ہے، لہٰذا متصلاً ذکر، علم بلاغت کے لحاظ سے صفت، مقابلہ اور ازدواج کا حسن پیدا کر رہا ہے جو ضالین کو پہلے لانے سے حاصل نہ ہوگا۔ ازدواج کے معنی ہیں کہ شے اور اس کی ضد یا مقابل دونوں ساتھ ساتھ ذکر کیے جائیں۔ سورۃ سبع المثانی (الفاتحہ) اس باب میں امتیازی حسن و جمال رکھتی ہے۔

سوال "ولاالضالین"، اس جگہ لا کے اضافہ سے کیا فائدہ ہے؟

جواب لا کے لانے میں چند فوائد ہیں:

① اس کے ذریعہ سے غیر میں جو نفی کے معنی پائے جاتے ہیں، اس کی تاکید ہو جاتی ہے۔ اگر غیر میں نفی کے معنی نہ ہوتے تو پھر لا کے ساتھ حرف عطف واوٴ کا لانا بے معنی ہو کے رہ جاتا ہے۔

② لا کے اضافہ سے یہ فائدہ ہوا کہ انعام یافتہ گروہ کی راہ، یہود و نصاریٰ دونوں میں سے ہر ایک کی راہ سے الگ ہے، یہاں فرداً فرداً مغایرت ثابت ہو گئی۔ لا کے نہ لانے کی صورت میں یہ وہم پیدا ہوسکتا تھا کہ دونوں گروہوں سے مجموعی طور پر غیریت مقصود ہے نہ کہ ہر ایک سے علیحدہ۔

③ اس وہم کو دور کرنا مقصود ہے کہ ضالین، مغضوب علیھم کی صفت ہے۔ ایسا ہوا کرتا ہے کہ ایک ذات کی چند صفتوں کے درمیان حرف عطف لے آیا کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہوں، سورۂ مؤمنون کی ابتدائی چند آیات)

جب لا یہاں داخل ہوگیا تو معنی یہ ہوئے کہ دونوں وصف دو گروہوں سے الگ الگ تعلق رکھتے ہیں اور دونوں مقصود بالذکر ہیں۔ اس مقام پر لا، غیر پر چند

وجوہ کی وجہ سے فوقیت رکھتا ہے:

① حرف کم ہیں۔

② تکرار نہیں ہے۔

③ غیر کے دوبار لانے سے زبان پر ثقل ہو جاتا۔ درمیان میں صرف ایک کلمہ مغضوب ہی کا فصل ہوتا۔عبارت کے اس بھونڈے پن سے کسے انکار ہوسکتا ہے؟

④ لا کے ساتھ عطف کرنے میں ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ صراط مستقیم والوں سے غضب اسی طرح دور ہے جس طرح ان سے ضلال مُنتفی (دور) ہے۔ اگرچہ غیر نے اس نفی کو بتلایا ہے، مگر لا نفی کے معنی میں زیادہ زور دار ہے۔

سوال ہدایت کے کیا معنی ہیں؟ اس کی کتنی اقسام ہیں اور یہاں کون سی قسم مراد ہے؟

جواب ہدایت کی چار اقسام یا مراتب ہیں:

① عام ہدایت جو تمام کائنات کو شامل ہے۔اس کا ذکر اس آیت میں موجود ہے:

﴿الَّذِيٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى﴾ (۲۰/ طه: ۵۰)

"اللہ وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی پیدائش بخشی، پھر اس کی راہنمائی کی۔"

یعنی ہر شے کو ایسی صورت اور ساخت عطا کی کہ ایک دوسرے سے امتیاز ہوگیا۔ ہر عضو کو مناسب شکل سے آراستہ کیا، ہر موجود کو خاص بناوٹ سے سرفراز فرمایا۔ پھر جن کاموں کے لیے ان کو پیدا کیا تھا، ان کی طرف ہدایت و راہنمائی کی۔ یہ حیوانی ہدایت ہے جس کے ذریعہ سے ہر جاندار اپنے نفع کو حاصل کرتا ہے اور نقصان سے بچتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تمام حیوانات، نباتات، جمادات اور اعضائے انسانی نعمت ہدایت سے مالا مال ہیں، خواہ بظاہر صورت و نوع کے لحاظ سے کتنا ہی فرق کیوں

نہ ہو۔ قدموں کو چلنے، ہاتھ کو پکڑنے، زبان کو بولنے، کان کو سننے اور آنکھ کو دیکھنے کی ہدایت عطا فرمائی ہے۔ حیوانات میں سے ہر جوڑا اس فطرتی ہدایت کی بنا پر صنفی تعلق، بقائے نسل، اور تربیت اولاد کی طرف مائل ہوتا ہے۔

بچہ خود بخود اسی ہدایت کی بدولت ماں کی چھاتی سے غذا حاصل کرتا ہے۔ یہ ہدایت کی وہ شکلیں اور قسمیں ہیں۔ جن کا شمار سوائے اللہ کے اور کون کرسکتا ہے۔

شہد کی مکھی کو دیکھیں، کس طرح پہاڑوں، درختوں اور مکانوں میں اپنا گھر بناتی ہے اور اللہ کی ہدایت کے مطابق اپنا پروگرام پورا کرتی ہے۔ اپنی راہ اور روش سے ہٹنا جانتی ہی نہیں۔ پھر غور سے دیکھیں اپنی سردار (ملکہ) کے پورے نظام کی پیروی کرتے ہوئے کس خوبی و کمال سے اپنا مضبوط خوشنما چھتا تعمیر کرلیتی ہے۔

ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہدایت کے مناظر کو جو انسان بھی غوروفکر کی نگاہ سے دیکھے گا وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ اللہ کے سوائے کوئی الہٰ نہیں۔ وہ کھلے اور چھپے کا علم رکھتا ہے، عزت و حکمت کا اصل مالک وہی ہے۔ اس ہدایت کی معرفت سے بغیر کسی الجھاؤ پیچیدگی اور طول بیانی کے نبوت بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ جب آپ نے یہ مان لیا کہ اللہ تعالیٰ نے حیوانات کو بے کار نہیں چھوڑا بلکہ ان کو ایسی ہدایت سے نوازا ہے۔ جس سے خود انسانی عقل اور سمجھ، عاجزو درماندہ ہے۔ پھر کیسے ہوسکتا ہے کہ انسان جیسی اشرف المخلوقات ہستی بے کارو مہمل چھوڑ دی جاتی۔ رب العالمین کی طرف سے کوئی ہدایت نامہ اس کے پاس نہ آتا۔ اس کو اعلیٰ مقصد اور انتہائی کمالات کی راہ نہ بتلائی جاتی اور ثواب و عذاب کے اسباب وتفصیلات سے آگاہ نہ کیا جاتا۔ ایسا ہونا رب اکبر کی حکمت و عزت کے یکسر منافی ہے۔ اس لیے اس نے اپنے کلام پاک میں اس عیب سے براءت ظاہر کی ہے اور اس قسم کے لوگوں کی سخت مذمت فرمائی ہے:

﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ۝ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ﴾ (۲۳/ المؤمنون: ۱۱۵، ۱۱۶)

''کیا پھر تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تم کو بے کار پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہ آؤ گے، وہ سچا بادشاہ اس بات سے بلند ہے۔''

اس قسم کے گمان سے اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو پاک بتلایا ہے۔ یہ خیال ہی ایسا ہے جس کے بطلان اور فساد سے کسی سلیم الفطرت، صحیح العقل انسان کو انکار ہی نہیں ہوسکتا۔ یہاں سے عقلی طور پر قیامت کا بھی ثبوت مل گیا۔ جس نے ہمارے اس استدلال کو سمجھ لیا۔ اس کے لیے ذیل کی دو آیتوں میں تناسب، ربط اور تعلق معلوم کرنا مشکل نہیں:

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ۝ ﴾

(۶/ الانعام: ۳۸)

''اور نہیں ہے کوئی جانور زمین میں اور نہ کوئی پرندہ جو اڑتا ہو اپنے دونوں بازوؤں کے ساتھ مگر وہ امتیں ہیں تمہاری مانند۔ ہم نے الکتاب میں سب کچھ درج کر دیا ہے۔ پھر تم اپنے رب کی بارگاہ میں جمع کیے جاؤ گے۔''

﴿ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۝ ﴾ (۶/ الانعام: ۳۷)

''اور کافروں نے کہا کہ اس کے رب کی طرف سے اس پر کوئی نشانی کیوں نہیں اتری۔ کہہ دو بے شک اللہ نشانی کے اتارنے پر قادر ہے لیکن بہت ان میں سے علم نہیں رکھتے۔''

اس مقام پر منکرین نبوت محمدیہ ﷺ کے سوال کے جواب میں حیوانات کا

ذکر خاص حکمت رکھتا ہے۔ اس انداز بیان سے اثبات نبوت کی طرف لطیف اشارہ ہوگیا۔ جس خالق نے زمین پر چلنے والے، فضا میں اڑنے والے جانوروں کو اپنی ہدایت سے محروم نہیں کیا بلکہ ان کو اُمم (گروہ در گروہ، جماعتی رنگ میں) بنایا اور ان کو مقاصد و مصالح بتلائے، وہ تم کو تمہارے مقاصد و مصالح اور راہِ نجات سے کیسے نا آشنا رکھ سکتا ہے۔ یہ ہدایت کی پہلی قسم ہے۔

② خیر و شر، نجات وہلاک اور ثواب و عذاب کی راہوں کو بندوں پر واضح کر دینا اور ان کو یہ بتلا دینا کہ اس راہ میں تمہاری اَبدی فلاح پوشیدہ ہے اور اس کے علاوہ دوسری راہوں میں سوائے ابدی بدبختی اور تباہی سے کچھ نہیں۔ یہ ہدایت منزل مقصود تک پہنچانے والی کامل ہدایت کے کم معنی نہیں ہے اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ جب یہ ہدایت حاصل ہو تو کامل ہدایت بھی حاصل ہو جائے۔ مثلاً فرمایا:

﴿ اَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى ﴾

(٤١/ فصّلت: ١٧)

''ہم نے ثمود کو راستہ بتلا دیا۔ لیکن انہوں نے اندھے پن (گمراہی) کو ہدایت کے مقابلہ میں پسند کر لیا۔''

اور یہی معنی اس آیت کے ہیں:

﴿ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ (٤٢/ الشورٰی: ٥٢)

''بے شک آپ لوگوں کو سیدھی راہ بتلاتے ہیں۔''

③ ہدایت توفیق والہام، یعنی منزل مقصود تک پہنچا دینا۔ اس ہدایت کے بعد پھر راہِ حق سے انسان بھٹک نہیں سکتا۔ مثلاً:

﴿ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ (١٦/ النحل: ٩٣)

''گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت کرتا ہے جسے چاہتا ہے۔''

اور اس معنی میں آنحضرت ﷺ کا قول ہے:

((ومن یهد الله فلا مضل له))

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ مَنْ يُضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ﴾ (٧/ الأعراف: ١٨٦)

''جسے اللہ گمراہ کرنا چاہے اسے آپ ہدایت نہیں دے سکتے۔''

﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ ﴾ (٢٨/ القصص: ٥٦)

''آپ جسے چاہیں، ہدایت نہیں کر سکتے۔''

یہاں ہدایت بمعنی سوم کی نفی کی گئی ہے اور دوسری آیت میں ہدایت بمعنی دوم آپ کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ فرمایا:

﴿ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ (٤٢/ الشوریٰ: ٥٢)

④ یہ ہدایت کی چوتھی قسم، تیسری قسم کی اصل غرض و غایت ہے۔ یعنی قیامت کے روز جنت اور جہنم کی طرف ہدایت، جب کہ مومن وکافر، ثواب و عذاب کی طرف ہنکائے جائیں گے، ذیل کی آیت میں ہدایت اسی معنی میں مستعمل ہے۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ﴾

(١٠/ یونس: ٩)

''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے، ان کا رب ان کو ہدایت کرے گا ان کے ایمان کی وجہ سے۔''

اہل جنت، جنت میں داخل ہو کر کہیں گے:

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ﴾ (٧/ الاعراف: ٤٣)

''تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے جس نے اس (نعمت) کی طرف ہمیں ہدایت فرمائی۔''

اہل جہنم کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

﴿ اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ .... فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴾ (٣٧/ الصافات: ٢٢۔ ٢٣)

''ظالموں اور ان کے اہل کو جمع کرو...... پھر ان کو دوزخ کی راہ بتلا دو۔''

سورہ الفاتحہ میں ہدایت کے چار مراتب میں سے دوسرا اور تیسرا مراد ہے۔

سوال ایک مسلمان کے لیے سیدھی راہ کی طلب فضول ہے، وہ تو پہلے سے صراطِ مستقیم پر ہے اسی طرح توفیق والہام کا سوال بھی بے معنی سا ہے؟

جواب بعض علما نے جواب میں کہا کہ یہاں ہدایت سے ثابت قدمی اور ہمیشگی مراد ہے، لیکن یہ کوئی ٹھوس جواب نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بندہ ہدایت پا ہی نہیں سکتا تاوقتیکہ مندرجہ ذیل چھ امور حاصل نہ ہو جائیں۔ یہ امور وہ ہیں جن سے کوئی بندہ بھی بے نیاز نہیں ہوسکتا:

① ان تمام باتوں کا علم جن سے اللہ ناراض یا خوش ہوتا ہے، تاکہ مرضیات الٰہی کی طلب اور ممنوعات سے پرہیز ہوسکے۔

② ان تمام کاموں کے کرنے کا پورا عزم رکھے جن سے اللہ خوش ہوتا ہے اور ان تمام باتوں سے بچنے کا پختہ ارادہ کرلے، جن سے اللہ نے روکا ہے۔

③ اس عزم و ارادہ کو عملاً جاری رکھے اور اس سلسلہ میں کسی قسم کی کوتاہی نہ ہونے پائے۔

ان تینوں امور میں جس قدر کوتاہی ہوگی۔ اسی قدر ہدایت کاملہ میں کمی ہوگی۔ یہ امور بطور اصول کے ہیں، باقی تین امور گویا تکملہ اور تتمہ ہیں۔

④ جن باتوں کا علم سرسری طور پر حاصل ہوا ہے، بندہ ان کی تفصیلی معرفت کا محتاج ہے۔

⑤ کچھ امور ایسے ہوتے ہیں جن کے بعض پہلو روشن ہوتے ہیں اور بعض پہلو تاریک، بندہ اس بات کا سخت محتاج ہے کہ اس کے سامنے تمام پہلو بے نقاب ہو جائیں۔

⑥ جن مسائل و اعمال کے تمام گوشے تفصیل و وضاحت سے معلوم ہوچکے ہیں، ان پر ثابت قدم اور پابند رہنے کا بندہ محتاج ہے۔

یہ چھ امور وہ ہیں جن کا تعلق آیندہ زمانہ سے ہے۔ ایک ساتواں امر بھی

ہے جس کا تعلق گزشتہ زمانہ سے ہے، یعنی پہلی غلطیوں اور گناہوں سے توبہ۔

اس تفصیل کے جان لینے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ بالفعل ہدایت موجود ہے۔ اس کے مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس اعتراض کا یہ جواب کیسے کافی ہوسکتا ہے کہ یہاں ہدایت سے مراد ثابت قدمی اور مداومت ہے۔ ہاں اگر یہ مذکورہ چھ امور حاصل ہوں تب ہدایت کے سوال کو ثابت قدمی اور دوام کا سوال قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہاں یہ حال ہے کہ انسان جتنی باتیں جانتا ہے ان سے کہیں زیادہ ایسی باتیں ہیں جن سے وہ واقف نہیں ہے۔ جن اعمال کا وہ ارادہ کرتا ہے ان سے کہیں زیادہ ایسے اعمال ہیں جن کا وہ نہ ارادہ کرسکتا ہے اور نہ ان کے انجام دینے کا راستہ پا سکتا ہے۔ الّا یہ کہ اللہ تعالیٰ بندے میں قوتِ فاعلیہ پیدا کردے۔ معلوم ہوا کہ اس آیت میں سوال ہمیشہ کے لیے اصل ہدایت ہی کا ہے نہ کہ محض ثابت قدمی کا۔

حقیقت یہ ہے کہ بندہ ان تمام کاموں میں جن کو وہ انجام دیتا ہے یا چھوڑتا ہے، ہدایت کا محتاج ہے اور برابر اسے مزید علم کی ضرورت رہتی ہے اور رہے گی۔ اسی لیے بندہ کے لیے طلب ہدایت سے بڑھ کر کوئی چیز نفع بخش نہیں ہوسکتی۔

سوال "اھدنا" میں ضمیر جمع لائی گئی ہے،اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب بعض لوگوں نے یہ جواب دیا ہے کہ یہاں انسان کے ہر ہر عضو کے لحاظ سے صیغہ جمع لایا گیا ہے۔ گویا ہر عضو ہدایت و فلاح کا طالب ہے، لیکن یہ جواب درست نہیں ہے۔ انسان پورے مجموعہ کا نام ہے نہ کہ الگ الگ ہر عضو اور جزو کا۔ جب بندہ "اللھم اغفرلی وارحمنی" کہتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی پوری ذات کے لیے مغفرت و رحمت کا طالب ہے۔ اس وقت اسے اس بات کا خیال ہی نہیں ہوتا کہ میں نے اپنے ہر عضو کے لیے علیحدہ طور پر مغفرت و رحمت طلب کی ہے۔

اصل جواب یہ ہے کہ "اهدنا" میں جمع کا صیغہ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ سے مطابقت کے لیے لایا گیا ہے۔ دونوں جگہ جمع کا استعمال خاص حسن وعظمت کو ظاہر کر رہا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں بندہ اپنی بندگی، غلامی اور محتاجی کا اقرار کر رہا ہے اور اپنے مالک سے مدد و ہدایت کا طالب ہے۔ گویا یوں کہہ رہا ہے'' ہم سب تیرے غلام ہیں اور تیری بندگی کا اعتراف کرتے ہیں۔''

اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی غلام اپنے پر ہیبت باعظمت بادشاہ کے دربار میں عرض کرتا ہے کہ ہم تیرے غلام ہیں، تیرے مملوک ہیں، تیرے تابعدار ہیں۔ تیرے حکم سے کبھی ہم سرتابی نہ کریں گے۔ بادشاہ کے نزدیک یہ اندازِ درخواست جو اثر اور وقعت رکھتا ہے، وہ واحد صیغہ لانے کی صورت میں حاصل نہ ہوگا۔ انا عبدك ''میں تیرا غلام ہوں۔'' اور نحن عبادك ''ہم تیرے غلام ہیں۔'' میں بڑا فرق ہے اور اگر غلام یوں کہہ دے کہ'' میں تنہا تیرا غلام ہوں۔'' تو بادشاہ کے عتاب سے محفوظ نہ رہ سکے گا۔ "نحن عبيدك" فقرہ بتلا رہا ہے کہ تیرے بندے اور تیرے غلام بہت سے ہیں اور ان میں سے ایک میں بھی ہوں اور ہم سب کے سب تیری غلامی اور نصرت و ہدایت کی طلب میں یکساں شریک ہیں۔

یہاں جمع کا صیغہ رب اکبر کی عظمت اس کے بندوں کی کثرت اور طالبین ہدایت کی فراوانی کو ظاہر کر رہا ہے۔ مفرد صیغہ لانے کی صورت میں یہ فوائد حاصل نہ ہوتے، قرآن مجید کی اکثر دعائیں اسی انداز پر آئی ہیں فرمایا:

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً﴾ (۲/ البقرة: ۲۰۱)

''اے اللہ ہم کو دنیا میں اور آخرت میں نیکی دے۔''

سورۂ بقرہ کا آخری رکوع اور آل عمران کی ابتدائی اور آخری آیتوں میں دعا کا یہی طرز اختیار کیا گیا ہے۔

سوال صراطِ مستقیم کیا ہے؟

جواب صراط مستقیم کی تعریف میں مختلف اقوال و عبادات ملتی ہیں لیکن ہم نہایت مختصر مگر جامع بات کہہ دینا چاہتے ہیں۔

صراط مستقیم وہ راستہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کے ذریعہ سے اپنے بندوں کے لیے مقرر فرمایا ہے اور اس کو اس انداز سے بنایا ہے کہ اس پر چلنے والا ضرور اپنے مالک و خالق کی رضا حاصل کرلے گا۔ اللہ تک پہنچنے کا اور کوئی راستہ ہو ہی نہیں سکتا، سوائے اس کے تمام راہیں بند ہیں۔ یہ راستہ نام ہے توحید فی عبادۃ اللہ اور تفرید فی اطاعۃ الرسولﷺ کا۔ یعنی رب کی عبادت اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت میں کسی دوسرے کو شریک نہ کیا جائے۔ عبادت و اطاعت خالصاً اللہ اور رسول ﷺ کے لیے انجام دی جائیں۔ بعض عارفین کا قول بھی اس کے ہم معنی ہے کہ ''سعادت (خوش نصیبی) اور فلاح (نجات) دونوں اللہ سے سچی محبت اور اس سے اچھا تعلق و معاملہ برتنے میں سمٹی ہوئی ہیں۔''

گویا یہ قول کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تفسیر ہے۔ آپ ''الصراط'' کی جو بھی تفسیر کریں گے وہ مذکورہ بالا دو بنیادوں سے باہر نہیں ہوسکتی۔ کلمہ طیبہ کے اقرار کے معنی یہی ہیں کہ پورا دل رب کی محبت میں ڈوب جائے اور ساری کوششیں اس کی خوشنودی کی طلب میں صرف ہو جائیں۔ دل کا کوئی گوشہ ایسا باقی نہ رہ جائے جو اس کی محبت سے آباد نہ ہو۔ کوئی ارادہ ایسا نہ ہو جو اس کی رضا سے وابستہ نہ ہو۔ پہلی صورت لا الہ الا اللہ کی شہادت کے دل میں جمنے سے حاصل ہوتی ہے اور دوسری صورت محمد رسول اللہ ﷺ کو پوری طرح قبول کرنے سے، اسی کا نام الہدیٰ اور دین الحق ہے۔ حق کی معرفت انبیائے کرام کے لائے ہوئے پیغام کا علم اور پھر اس کے مطابق عمل اور پابندی، اسی کو الصراط کہتے ہیں آپ کچھ بھی تفسیر کرلیں لیکن اصل مرکز وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا۔ الصراط کی مندرجہ ذیل تفسیریں اس تفسیر کے ہم معنی ہیں جو اوپر ذکر

ہو چکی ہے:

① "الصراط" نام ہے مشکوٰۃ نبوت سے حاصل شدہ ظاہری اور باطنی علوم اور اعمال کا۔

② علمی اور عملی طور پر ظاہر و باطن میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع۔

③ توحید کا اقرار اور پھر اس پر ثابت قدم رہنا۔

④ پانچ وقت کی نمازیں۔

⑤ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی محبت۔

⑥ اسلام کے پانچ ارکان، جن پر اسلام کی بنیاد ہے۔

یہ تمام اقوال صراطِ مستقیم کی چند صورتوں، شکلوں اور قسموں کو بیان کرتے ہیں۔ اصل جامع حقیقت وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکی ہے۔ [1]

قرآنی کلمات کی حکیمانہ ترتیب

﴿الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (۲/ البقرة: ۱۲۹)

"وہ غالب حکمت والا ہے۔"

① عزیز کو حکیم پر مقدم رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ عزیز کا مأخذ عزت ہے، جو کمال قدرت کا نام ہے۔ حکیم کا مادہ حکمت ہے جو کمال علم کا مفہوم اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ کیونکہ صفتِ قدرت کے آثار و مناظر مخلوق کے مشاہدہ میں زیادہ آتے ہیں، اس لیے اس کو پہلے لایا گیا ہے۔ لیکن حکمت کا تعلق نظر و فکر سے ہے (اس لیے حکمت کی نشانیوں پر کم نگاہ پڑتی ہے۔)

② اللہ کی حکمت میں انسان بعد میں غور کرتا ہے۔ پہلے اس کے آثارِ قدرت اور کائنات کو دیکھتا ہے اور اس کے ذریعہ سے حکمتِ الٰہی کی باریکیاں اور مصلحتیں سمجھتا ہے۔

③ یہاں ذریعہ و وسیلہ کو مقصد پر مقدم کیا گیا ہے۔ کیونکہ قدرت کا تعلق تو

[1] بدائع الفوائد ۲/ ۱۱-۱۴۔

پیدائش سے ہے اور حکمت فعل کی اصل غرض ہے۔جس طرح دنیا میں عملاً وسائل کو مقصد سے پہلے استعمال کیا جاتا ہے، اسی طرح بیان میں بھی اسی ترتیب کالحاظ رکھا گیا ہے۔

﴿ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴾ (۲/ البقرة:۲۲۲)

''اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

﴿تَوَّابِينَ﴾ کو ﴿الْمُتَطَهِّرِينَ﴾ سے اس لیے مقدم رکھا گیا ہے کہ طہر (پاکی) کی دو قسمیں ہیں۔

① پانی کے ذریعے حدث،نجاست اور گندگی سے پاک ہونا۔

② توبہ کے ذریعے شرک اور گناہوں سے صاف ہونا۔

دوسری قسم پہلی نوع کے لیے اصل اور بنیاد ہے۔اس کے بغیر پانی کے ذریعے پاکی حاصل کرنا بے کار ہے۔طہارت ماء(پانی)طہارت توبہ کو درجہ کمال تک پہنچاتی ہے،خود مقصود بالذات نہیں۔اسی لیے توابین کو پہلے ذکر کیا گیا۔جب کوئی شخص حلقہ بگوش اسلام ہوتا ہے تو پہلے توبہ کے ذریعے دل کو پاک کرتا ہے پھر پانی کے ذریعے ظاہری بدن کو۔

﴿ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ﴾ (۴۵/ الجاثية:۷)

"افك"کے معنی ہیں جھوٹ،اس کا تعلق زبان سے ہے اور أثیم کے معنی ہیں فجور (بدکاری)اس کا تعلق عمل سے ہے۔یہی جھوٹ فجور کا ذریعہ بنتا ہے اور واقع میں پہلے ہوتا ہے، اس لیے اس کو مقدم کیا گیا۔یہی معنی اس حدیث کے ہیں:

((ان الكذب يهدى الى الفجور وان الفجور يهدى الى النار)) [1]

[1] صحيح البخارى ۵/ ۲۲۶۱ (۵۷۴۳) الأدب: باب قول الله تعالى(يا أيها الذين آمنوا......)؛صحيح مسلم ۴/ ۲۰۱۲ (۲۶۰۷) البروالصلة و الأدب: باب قبح الكذب و حسن الصدق وفضله۔

''جھوٹ، فسق وفجور پر آمادہ کرتا ہے اور فجور، دوزخ میں جھونکتا ہے۔''

﴿مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ﴾ (٦٨/ القلم:١٢)

یہاں معتدٍ کو اثیم پر مقدم چند وجوہ کی بنا پر کیا گیا ہے۔

① اعتداء حد سے بڑھنا، یہ گناہ کا ذریعہ اور سبب ہے اور سبب اپنے مسبب اور نتیجے پر مقدم ہوتا ہے۔

② اعتداء یا عدوان کے معنی ہیں، مقرر کردہ حد سے بڑھ جانا۔ یہ ایسا ظلم ہے جس سے اصل شے کی مقدار اور کیفیت میں تغیر آ جاتا ہے اور اس طرح ظالم اثم (گناہ) کی سرحد میں پہنچ جاتا ہے۔

③ معتدی وہ ہے جو سرکشی کی راہ سے اللہ کے بندوں کو ستاتا ہے۔ اثیم وہ ہے جو بدکاری کی وجہ سے بندوں پر ظلم کرتا ہے۔ معتد کی تقدیم ترتیب کلام کے بالکل مناسب ہے یعنی جو اللہ کے بندوں پر ظلم کرنے والا ہو، وہ اس بات کے زیادہ لائق ہے کہ اس سے پرہیز کیا جائے اور اس کی اطاعت نہ کی جائے۔ اس معنی پر زور دینے کے لیے معتد کو پہلے لایا گیا۔

④ اس سے پہلے ﴿مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ﴾ (٦٨/ القلم:١٢) کہا گیا ہے، یعنی یہ کافر بھلائی سے روکتا ہے۔ اس کا دل لوگوں کی ہمدردی اور خیر خواہی سے خالی ہے۔ بلکہ مزید شر اس کا یہ ہے کہ لوگوں پر ظلم کرتا ہے۔ پہلے خیر سے روکتا ہے پھر ان پر ستم ڈھاتا ہے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے منّاع کے بعد متصلاً معتدٍ ذکر کیا گیا ہے۔ ایسا انسان بدترین لوگوں میں سے ہے۔ بہترین شخص وہ ہے جو دوسروں کو نفع پہنچائے اور ان کو تکالیف سے محفوظ رکھے۔ تصوف کی اصل حقیقت یہی ہے۔

﴿هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ﴾ (٦٨/ القلم:١١)

عیب جو چغل خور پر ہماز کو دو وجوہ کی بنا پر مقدم کیا گیا ہے:

① عیب جو حرکت اور چلنے پھرنے کا زیادہ خواہاں نہیں ہوتا بخلاف چغل خور کے کہ اس کے فعل کا سارا دارومدار نقل وحرکت پر ہوتا ہے۔ هَمَّازٍ معنی کے لحاظ سے قاعد (یعنی بیٹھے والے) اور چغل خور ماشی (چلنے والے) کے حکم میں ہوا۔ رتبۃً

قعود (بیٹھنے) کو مشی (چلنے) پر تقدم ہے۔ (یہ امام سہیلی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔)

② هَمَّاز کا نقصان اسی شخص تک محدود رہتا ہے، جس کی عیب جوئی کی جا رہی ہے۔لیکن چغل خور کا نقصان دوسروں تک پھیلتا ہے۔ظاہر بات ہے کہ محدود ضرر کے سمجھ لینے کے بعد متعدی نقصان کا سمجھنا آسان ہے۔

﴿وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ﴾ (۲۲/ حج:۲۷)

”(اے ابراہیم!) لوگوں میں اعلان کر دے (حج کے لیے) لوگ آئیں گے پیدل اور سوار ہو کر اونٹوں پر۔“

یہاں پیدل کو سوار پر مقدم رکھنے کی دو وجہیں ہیں:

① نزدیک کے مقامات سے لوگ عام طور پر پیدل ہی آ جاتے ہیں اور دور سے آنے والے سواریوں پر۔گویا قریب سے آنے والے رتبۃً تقدم رکھتے ہیں۔اسی لیے پیدل آنے والوں کو سواروں پر مقدم کیا ہے۔

② اللہ تعالیٰ نے حج کے لیے استطاعت (طاقت) کو شرط قرار دیا ہے۔جبکہ اکثر لوگ بغیر سفر کے اس کو ادا نہیں کر سکتے تو مناسب ہوا کہ حاجیوں کی دو قسمیں (پیدل اور سوار) صراحتاً بیان کر دی جائیں اور اس غلط وہم کو ختم کر دیا جائے کہ حج صرف سواری رکھنے والوں پر ہی فرض ہے۔اس بنا پر پیدل کو سوار سے پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ [1]

السماءُ کی تقدیم الارض پر

قرآن مجید میں عام طور پر آسمان کا ذکر زمین سے پہلے کیا گیا ہے، کیونکہ آسمان کے عجائبات فائدے اور منافع زمین سے کہیں زیادہ ہیں۔زمین کی حیثیت اس کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے قطرہ سمندر کے سامنے،اس لیے قرآن مجید میں آسمان کے مناظر میں بار بار غور کرنے کے لیے ابھارا گیا ہے۔

﴿ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ﴾ (۶۷/ الملك: ٤)

[1] بدائع ۱/ ٦٨، ٦٩۔

''پھر لوٹا نگاہ کو بار بار۔''

سورۂ یونس میں السماء (آسمان) پر الارض (زمین) کو مقدم کیا گیا ہے۔اس میں دوسری حکمت ہے۔فرمایا:

﴿ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ﴾

(۱۰/ یونس:۶۱)

''تیرے رب سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز چھپ نہیں سکتی۔ نہ زمین میں نہ آسمان میں۔''

اس آیت میں بندوں کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ہر چھوٹے بڑے عمل سے واقف ہے،اس کی نافرمانی سے بچیں۔یہاں اس مضمون کی مناسبت سے زمین کا ذکر پہلے ہی موزوں تھا۔یہی زمین ان کی جائے قیام اور قرار گاہ ہے، اس مضمون کو سورۂ سباء میں بھی بیان کیا گیا ہے۔لیکن وہاں الارض کو بعد میں لایا گیا ہے۔ پوری آیت میں غور کرنے سے اس کی حکمت بھی پوشیدہ نہیں رہتی۔ فرمایا:

﴿ لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ ۖ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ عَالِمِ الْغَيْبِ ۖ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ﴾ (۳۴/ سبا:۳)

''کافروں نے کہا قیامت نہیں آئے گی۔آپ کہہ دیجیے کیوں نہیں ضرور ہی آئے گی۔وہ ربّ غیب کا جاننے والا ہے اس سے ایک ذرہ بھی مخفی نہیں رہ سکتا نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔''

اس آیت میں ابتداءً قیامت کا ذکر موجود ہے اور قیامت کی اکثر نشانیوں کا ظہور آسمان ہی سے ہوگا۔ اس لیے السمٰوات کو مقدم کرنا ہی مناسب تھا۔

قرآن مجید میں بعض الفاظ کو بعض پر مقدم کرنے کی حکمت

اموال واولاد:

﴿ وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ بِالَّتِي تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفَىٰ ﴾ (۳۴/ سبا:۳۷)

''تمہارے مال اوراولاد تم کواللہ سے نزدیک کرنے والے نہیں۔''

﴿ لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ ﴾ (٦٣/ منافقون:٩)

''تمہارے مال اوراولاد تم کواللہ کی یاد سے غافل نہ کردیں۔''

﴿ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ ﴾ (٦٤/ التغابن:١٥)

''پس تمہارے مال اوراولاد آزمائش ہیں۔''

ان تینوں آیات میں مال کو مقدم کرکے مسلمانوں کو ان میں الجھ کراللہ کی یاد سے غافل ہونے سے ڈرایا گیا ہے۔کہیں ایسا نہ ہوکہ مال کی حرص میں اللہ کی رضا اورجنت کی ابدی نعمتوں سے محروم ہوجائیں۔اصل مشغولیت اورانہماک ایمان اوراعمال صالحہ میں ہونا چاہیے نہ کہ کسب زر میں۔عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ انسان پر مال کی محبت اوراس کو سمیٹنے کی دھن اس طرح سوار ہوتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت واصلاح سے بھی غافل ہوجاتا ہے۔اس لیے مال کو پہلے لاکراس حرص اور طمع کو روکا گیا ہے۔حسب ذیل دوآیتوں میں اولاد کومال سے پہلے بیان کیا گیا ہے، اس میں بھی عجیب حکمت ہے۔فرمایا:

﴿ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اِقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ ﴾ (٩/ توبہ:٢٤)

''کہہ دو کہ اگرتمہارے باپ دادا،تمہارے بیٹے،تمہارے بھائی،تمہاری بیویاں،تمہارا کنبہ اوروہ مال جوتم نے جمع کیا ہے،اوروہ تجارت جس کے مندے ہونے کا تمہیں ڈر ہے،اوروہ مکانات جن کوتم پسند کرتے ہو،تمہیں اللہ،اس کے رسول اوراس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں،تو منتظر رہو۔یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لے آئے۔''

یہاں جہاد کا بیان ہے۔ایک مجاہد کے لیے اہل وعیال اورگھر بار کی جدائی

بہ نسبت مال کے زیادہ دشوار ہے،ان تعلقات سے علیحدگی کا خیال اُسے جہاد کے لیے نکلنے سے روکتا ہے۔یہ تصور تو اس کے لیے اور بھی سوہانِ روح ہوتا ہے، کہ وہ قتل ہوکر ہمیشہ کے لیے ان سے جدا ہوجائے گا۔اس موقع پر مال سے جدائی کا خیال رکاوٹ نہیں ڈالے گا۔اس لیے اولاد اوراقربا کا ذکر پہلے ہی لانا مناسب تھا۔

اس آیت میں غور کریں کہ کس طرح تمام اشیاء کو بہترین ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔آباء کا ذکر سب سے پہلے لایا گیا ہے۔کیونکہ طبعًا ورتبۃً اور بلحاظ شرف ان کو تقدم وفوقیت حاصل ہے۔اس بنا پرانسان اپنے آباء واجداد پر فخر کرتا ہے اوران کے ناموس کی حفاظت میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھتا ہے۔اس حمایت اور عصبیت میں نہ جان کی پروا رہتی ہے اورنہ اولاد کا خیال۔ان کے طریق سے ہٹنا ایک لمحہ کے لیے بھی اسے گوارا نہیں ہوتا۔ان کے بعد ابناء(بیٹوں)کو بیان کیا گیا ہے۔محبت اوردلی تعلق کے لحاظ سے آباء کے بعد انہی کا درجہ ہے۔ان سے جو وابستگی اورمحبت ہوتی ہے،وہ بھائیوں سے نہیں ہوسکتی۔اس لیے اخوان کا ذکران کے بعد ہے۔

اب ترتیب یوں ٹھہری،اولاً اصل(جڑ) پھر فروع(شاخ)اوراس کے بعد ہم مرتبہ رشتہ دار بھائی پھر بیویاں۔بیوی کو چوتھے درجہ میں رکھنے میں یہ حکمت ہے کہ اس سے کوئی خونی رشتہ نہیں ہوتا، اس کی حیثیت اجنبی کی سی ہے۔اس کی جگہ دوسری بھی کی جاسکتی ہے۔اس سے تعلق تو نسل انسانی میں اضافہ کے لیے ہوتا ہے،بخلاف آباء، ابناءاوراخوان کے کہ ان کا بدل کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ان سے تعلق حمایت و نصرت کے لیے ہوتا ہے کہ یہ گرے پڑے وقت میں کام آتے ہیں۔ظاہر بات ہے کہ مدافعت وحمایت کا فائدہ خواہش نفس کی تسکین کے فائدے سے کہیں زیادہ وزنی ہے۔پانچویں درجے میں قرابت بعیدہ کو رکھا گیا ہے۔یعنی چچا، پھوپھی وغیرہ کی اولاد (اپنے تعلق کے لحاظ سے برادری کے یہ افراد اسی درجہ

کے مستحق ہیں چھٹا نمبر مال کا ہے، جس کی صفت کمایا ہوا،محنت سے حاصل کیا ہوا بھی کی گئی ہے۔محنت ومشقت سے حاصل کیا ہوا مال بہت ہی مرغوب ومحبوب ہوتا ہے اس کی قدر بھی زیادہ ہوتی ہے۔اس کے برعکس میراث، ہبہ یا وصیت کے ذریعہ جو مال ملتا ہے،اس کی حفاظت میں زیادہ توجہ اوراہتمام نہیں ہوتا۔ساتواں نمبر تجارت کا ہے۔انسان کی اصل محبت مال سے ہوتی ہے۔ اس کی حیثیت مقصود ومطلوب کی سی ہے اورتجارت اس کے حصول کے لیے صرف ایک ذریعہ ہے۔ یہاں مقصد کوذریعہ اوروسیلہ پرمقدم رکھا گیا ہے۔آٹھواں نمبر وطن کا ہے،اس سے بھی انسان کاتعلق ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں کہ جیسا آباء ابناء سے ہوتا ہے، وطن بدل سکتا ہے اور ہر دوسرا وطن پہلے سے بہتر ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ عوض معاوضہ اورتبدیلی کا معاملہ باپ دادا اوراولاد میں نہیں چل سکتا۔ ہوسکتا ہے کہ بعض حالات میں وہ تعلقات جن کو یہاں مؤخر بیان کیا گیا ہے،زیادہ وزن دار ہوجائیں لیکن یہ ایک جزئی اوراتفاقی صورت ہوگی۔اصل عام قانونِ فطرت وہی ہے جس کالحاظ آیت کی ترتیب میں رکھا گیا ہے:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ﴾ (۳/ آل عمران:۱۴)

”لوگوں کے لیے ذیل کی اشیاء سے محبت آراستہ کردی گئی ہے عورتوں کی طرف میلان، بیٹے،سونے چاندی کے ڈھیر،پلے ہوئے گھوڑے، چوپائے اورکھیتیاں یہ دنیاوی زندگی کا سامان ہے۔“

یہ آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اولاد کاذکر مال سے پہلے کیا ہے۔یہاں چونکہ ان چیزوں کابیان ہے جن کوکافروں نے اپنے لیے پسند کرلیا ہے اورجن سے وہ اپنی خواہشِ لذت اورراحت کے جذبات کوتسکین دیتے ہیں اس لیے یہاں پہلے ان چیزوں کوبیان کیا جن سے ان کی شہوت کاتعلق زیادہ قوی ہے۔اس سلسلہ

کی پہلی کڑی عورتوں کی ہے ان کا فتنہ دنیا کے تمام فتنوں سے بڑھ کر ہے۔یہی وہ بیڑیاں ہیں جو بندوں کو اللہ کی طرف قدم اٹھانے سے روک دیتی ہیں۔ان کے بعد اولاد کو ذکر کیا جو کہ ان سے پیدا ہوتی ہے اور عورتوں کی طرف میلان کا سبب حصولِ لذت کے ساتھ حصولِ اولاد بھی ہے۔یہ دونوں (عورت واولاد) انسان کے براہِ راست مطلوب ومقصود ہیں۔مال کی یہ حیثیت نہیں ہے وہ تو اصل مقصود کے لیے بمنزلہ وسیلہ اور ذریعہ کے ہے۔ظاہر بات ہے کہ مقصد باعتبار شرف ومرتبہ کے وسیلہ سے برتر ہے۔اس لیے یہاں مال کو بعد میں بیان کیا اور مال کی بہترین قسم سونا، چاندی کو یہاں ذکر کیا۔جن کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔اس کے بعد اس محبت کا ذکر ہے جو انسان کو حیوانات سے ہوتی ہے۔اس محبت کا وہ درجہ نہیں جو مذکورہ بالا اشیاء کا ہے اس لیے چوتھے نمبر پر اس کا بیان ہوا ہے۔حیوانات میں سے گھوڑے کا ذکر پہلے کیا کیونکہ یہ فوج کے لیے قلعوں اور پناہ گاہوں کا کام دیتے ہیں۔قومی شرف وعزت کا بقا وقیام ان پر موقوف ہے۔اس کے بعد مویشیوں کا بیان، پھر کھیتی کا ذکر ہے کیونکہ جانوروں کے منافع کھیتی سے کہیں زیادہ ہیں۔

﴿وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ﴾

(١٦/ النحل:٦)

”تمہارے لیے اس میں جمال وخوشنمائی ہے جبکہ تم ان کو شام کے وقت گھر لے جاتے ہو اور (چراگاہوں میں) چراتے ہو۔“

سواری (باربرداری) دودھ، گھی، لباس، ہتھیار، دوا اور اس قسم کے بہت سے فائدے ان سے حاصل ہوتے ہیں۔

آیات جہاد میں مال کا ذکر جان سے پہلے

اللہ تعالیٰ نے آیات جہاد میں مال کو نفس پر مقدم کیا ہے۔صرف ایک آیت ایسی ہے جہاں نفس کا مال سے پہلے بیان فرمایا ہے۔ارشاد ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ

الْجَنَّةَ﴾ (۹/ التوبہ:۱۱۱)

''بے شک اللہ نے خرید لیے ہیں مومنوں سے ان کے نفس اور مال،اس عوض میں کہ ان کے لیے جنت ہے۔''

پہلی صورت کی مثال ان آیات میں ملتی ہے:

﴿وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ﴾

(٦١/ الصف:١١)

﴿وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ﴾ (۹/ التوبہ:۲۰)

ان آیات میں مال کو پہلے لانے کی چند وجوہ ہیں:

① اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جہاد بالنفس کی طرح جہاد بالمال بھی فرض ہے۔جب دشمن سر پرآ دھمکے تو طاقت والے کے لیے ضروری ہے کہ میدان مقابلہ میں نکل آئے ورنہ اپنے بدلے میں کسی دوسرے کو مال دے کر بھیج دے۔اس اندازِ بیان سے اس وہم کا ازالہ مقصود ہے کہ جو شخص جہاد بالنفس کی قدرت نہ رکھتا ہو اس سے جہاد بالمال بھی ساقط ہے۔

② مال انسان کی محبوب ترین چیزوں میں سے ہے۔اس کی طلب میں وہ بڑے سے بڑے خطرے مول لے لیتا ہے،بلکہ بعض اوقات اس راہ میں جان تک کی بازی لگا دیتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو اس قیمتی محبوب شے کو اپنی راہ میں لٹانے کے لیے پہلے دعوت دی۔پھر اس سے کامل اور اعلیٰ درجہ کی طرف ان کو بلایا یعنی اللہ کی راہ میں جان جیسی پیاری چیز بھی قربان کرنے سے دریغ نہ کریں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ جان سے بڑھ کر محبوب شے اور کیا ہو سکتی ہے۔انسان اپنے اہل وعیال،مال ومتاع کی حمایت ومدافعت میں پورا زور صرف کرتا ہے۔لیکن جب اس راہ میں خود اس کی جان پر آبنتی ہے تو سب کو چھوڑ چھاڑ کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔اللہ نے اسی پر بس نہیں کی کہ صرف مال طلب کرتا،بلکہ انسان کی سب سے پیاری چیز بھی طلب فرمائی۔

③ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے کہ پہلے انسان مال خرچ کر کے نفس کو بچانے کی کوشش کرتا ہے لیکن جب مال پاس نہیں رہتا تو پھر جان کی بازی لگا دیتا ہے اس ترتیب کا لحاظ قرآن میں بھی رکھا گیا ہے۔

سورۂ توبہ کی آیت ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى﴾ (۹/ التوبة:۱۱۱) میں نفس کو مال سے پہلے لانے میں ایک خاص حکمت ہے۔ یہاں اصل میں نفس ہی خریدا گیا ہے۔ بیع وشراء اسی پر واقع ہوئی ہے۔ اسی کے بدلے میں رضائے الٰہی اور جنت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ مال کی حیثیت تو تابع اور مملوک سے زیادہ نہیں ہوتی۔ جب نفس ہی خرید لیا گیا ہو تو نفس کی ہر چیز اسی اللہ کی ہوگی۔ اس مقصد کے پیش نظر یہاں نفس کو مقدم کرنا ہی مناسب تھا۔

﴿غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (۱۲/ یوسف:۵۳)

قرآن مجید میں سوائے سورۂ سبا کی ایک آیت کے سب جگہ الغفور کو الرحیم پر مقدم کیا گیا ہے، یہ بھی حکمت سے خالی نہیں طبعی طور پر مغفرت کی طلب، رحمت سے پہلے ہوتی ہے مغفرت نام ہے گناہ سے سلامتی اور نجات پانے کا اور رحمت سے مزید عنایت وغنیمت مراد ہوتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ غنیمت سے پہلے انسان فطرتاً سلامتی کا خواہش مند ہوتا ہے۔

باقی رہی سورۂ سبا کی آیت تو اس میں الرحیم الغفور فرمانے میں دوسرا نکتہ ملحوظ ہے۔ پہلے پوری آیت اور سیاق وسباق پر نظر ڈالیے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاۗءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۭ وَهُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ ۝﴾ (۳۴/ سبا:۱۔۲)

''سب تعریف اس اللہ کے لیے ہے۔ جس کے لیے وہ چیزیں ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور اسی کے لیے حمد ہے

آخرت میں۔وہ حکمت والا خبردار ہے، جانتا ہے جو داخل ہوتا ہے
زمین میں اور جو نکلتا ہے اس سے اور جو اترتا ہے آسمان سے اور جو
چڑھتا ہے اس میں اور وہ مہربان بخشش والا ہے۔"

سورۂ کو حمد کے ساتھ شروع کیا گیا ہے۔یہ حمد اللہ کی تمام صفات کمال وجمال کو شامل ہے۔اس میں تمام علوم ومعارف سمٹ آئے ہیں۔وہ ہر حال میں محمود اور قابل ستائش ہے۔اس کا کوئی فعل،حکم اور قانون حکمت ومصلحت سے خالی نہیں۔حمد کے بعد"مافی السمٰوٰت ومافی الارض" کہہ کر اس کے ملک و بادشاہت کی وسعت اور پھیلاؤ کو بتلایا گیا ہے اور پھر یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ اس کی حمد دائمی ہے کبھی ختم نہیں ہوگی۔اس کی حمد آخرت میں بھی اسی طرح جاری رہے گی جس طرح یہاں جاری ہے۔کیونکہ وہ اپنی ذات وصفات کے لحاظ سے حمد کا مستحق ہے۔جب اس کی ذات کے لیے فنا نہیں تو اس کی حمد کب ختم ہوسکتی ہے۔ یہاں حمد اور ملک کو یکجا بیان کیا گیا ہے،یہ قرآن کا عام انداز ہے۔حمد اور ملک جب الگ الگ بیان ہوتے ہیں تب بھی اس کے کمال کو ظاہر کرتے ہیں اور جب دونوں ایک ساتھ ذکر کیے جاتے ہیں تب تو مزید کمال کی وضاحت ہوتی ہے۔ حمد بلا اقتدار وسطوت کمزوری کی علامت ہے اور حاکمیت بلا حمد عاجزی اور غیر مقبولیت کی نشانی ہے۔حمد مع اقتدار وحاکمیت انتہائی کمال کی نشانی ہے۔اسی طرح عزت، رحمت کے ساتھ،معافی،قدرت کے ساتھ اور تونگری سخاوت کے ساتھ اعلیٰ کمال کی علامت ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ کی بادشاہت کے ذکر سے پہلے بھی حمد کا ذکر ہے اور بعد میں بھی۔آخر میں اس کی دو صفتیں حکیم وخبیر مذکور ہیں۔صفت حکیم ارادہ کے کمال کو بتلاتی ہے اور یہ کہ اس ارادہ کا تعلق مقصود سے نہایت گہری حکمت ومصلحت کی بنا پر ہے اور صفت خبیر اس کے کمالِ علم کو ظاہر کرتی ہے۔جس طرح وہ ظاہری حالات جانتا ہے،اسی طرح باطنی اور اندرونی احوال سے بھی باخبر ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی حمد، بادشاہت، حکمت اور علم کو نہایت مناسب انداز سے آیت کی لڑی میں پرودیا گیا ہے۔بعد والی آیت میں اس کے علم کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، کہ اس کے علم سے آسمان وزمین کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔پھر آیت کو ایسی دوصفتوں کے ساتھ ختم کیا گیا ہے جو مخلوق پر اس کی انتہائی شفقت ومہربانی کو ظاہر کرتی ہیں۔یعنی الرحیم الغفور صفت رحمت کا تقاضا ہے کہ کامل طور بندوں کو نفع پہنچایا جائے اور صفت مغفرت کا تقاضا ہے کہ ان کے گناہوں کو معاف کیا جائے۔یہ آیت اس کی رحمت، علم، حاکیت اور مغفرت کی وسعت کو بتلا رہی ہے قرآن نے بارہا علم ورحمت کی وسعت کو یکجا بیان کیا ہے۔ فرمایا:

﴿ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا ﴾ (٤٠/ المؤمن:٧)

''اے ہمارے رب تو ہر چیز پر علم ورحمت سے چھا گیا ہے۔''

اسی طرح علم وحلم کو ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ان صفات کا حسن معانی یکجا ہونے سے اور بھی دوبالا ہو جاتا ہے۔ حاملان عرش فرشتوں میں سے دو کی دعا یہ ہے:

((اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ لَكَ الْحَمْدُ عَلٰى حِلْمِكَ بَعْدَ عِلْمِكَ))

اور دو فرشتوں کی دعا یہ ہے:

((لَكَ الْعَفْوُ بَعْدَ قُدْرَتِكَ)) [1]

معافی کے ساتھ قدرت کا ذکر وہی حسن رکھتا ہے جو علم ورحمت کے ساتھ علم کے بیان سے نمایاں ہوتا ہے۔قدرت کے ہوتے ہوئے معاف کرنا اصل کمال ہے۔اسی طرح علم کے ساتھ نرمی اور بردباری برتنا اعلیٰ خوبی ہے۔

یہاں "الرحیم" کو اس لیے مقدم کیا گیا ہے کہ پہلے صفتِ علم کا ذکر ہے۔ اس ترتیب سے علم ورحمت دونوں کا بیان ایک ساتھ ہوگیا، جیسا کہ اس آیت میں

[1] سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں تخریج گزر چکی ہے۔

ہے:

﴿ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا ﴾ (٤٠/ المؤمن:٧)

پھر آیت کو صفت مغفرت پر ختم کیا یہ صفت ازالہ شر پر مشتمل ہے، جس طرح کہ رحمت حصول خیر کو شامل ہے۔ عام طور پر شر ومصیبت کا ازالہ (دور کرنا) حصول خیر سے پہلے مطلوب ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن میں اکثر جگہ "الغفور کو الرحیم" سے پہلے لایا گیا ہے۔ یہاں ماقبل کی مناسبت سے "الرحیم" کو پہلے ذکر کرنا ہی موزوں تھا۔ ❶

﴿ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ ﴾ ❷

(٦/ الانعام:١٥١)

''اور اپنی اولاد کو فقرو فاقہ کی بنا پر قتل مت کرو، ہم تم کو بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی۔''

سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ ﴾

(١٧/ بنی اسرائیل:٣١)

پہلی آیت میں ضمیر مخاطب (کُم) پہلے اور ضمیر غائب (ھُم) بعد میں مذکور ہے لیکن دوسری آیت میں اس کے برعکس ہے۔ یہ فرق کیوں! اصل یہ ہے کہ دو مسئلہ الگ الگ ہیں۔ ایک چیز تو ہے نفس افلاس یا اس کا وقوع، یعنی والدین واقعتاً اور فی الحال افلاس میں مبتلا ہیں اور اس لیے بچوں کی زندگی ختم کیے دیتے ہیں۔ دوسری چیز ہے خوفِ افلاس، یعنی والدین فی الحال تو افلاس میں مبتلا نہیں۔ لیکن اندیشہ یہ کررہے ہیں کہ اگر اولاد پیدا ہونی شروع ہوگئی تو موجودہ آمدنی کفایت نہ کرے گی۔ قرآن مجید نے ان دونوں فتنوں کے درمیان فرق ملحوظ رکھا ہے۔ اول الذکر

---

❶ بدائع ١/ ٧٤-٨٠۔ ❷ یہ اضافہ مترجم کی طرف سے کیا گیا ہے۔ یہ نکات تفسیر ابن کثیر مصری (ج ٢ صفحہ ١٨٨) اور تفسیر ماجدی (ج ١ صفحہ ٥٨٤) سے ماخوذ ہیں۔

کے موقع پر محض "من املاق" لایا گیا ہے اور آخرالذکر کے موقع پر "خشیۃ املاق" بیان کیا گیا ہے۔حرام اگرچہ دونوں صورتوں میں قتل اولاد ٹھہرایا ہے،لیکن جہاں "من املاق" ہے (یعنی افلاس فی الحال موجود ہے۔) وہاں خطاب براہ راست ہے۔ یعنی اے گروہ والدین! تمھیں تو رزق بہرحال پہنچا ہی رہے ہیں۔ اسی طرح تمہاری اولاد کو بھی پہنچاتے رہیں گے اور جہاں "خشیۃ املاق" یعنی افلاس سردست موجود نہیں ہے بلکہ صرف اس اندیشہ لگا ہوا ہے،وہاں خطاب میں ایک ذرا سا لطیف ونازک فرق کردیا ہے۔

﴿نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل:۳۱)

''ہم انہیں بھی رزق پہنچاتے رہیں گے جیسا کہ تمھیں پہنچاتے رہے ہیں۔''

اس موقع پر مندرجہ بالا آیت کی تفسیر وتشریح غیر موزوں نہ ہوگی۔یہاں یہ اشارہ فرمایا گیا ہے کہ وہ معاشی نظریہ بہت ہی غلط قسم کا ہے جو نسل گھٹانے اور محدود کرنے کی طرف لے جاتا ہے۔معاشیات کے صحیح قوانین ہی دوسرے ہیں۔

﴿وَلَا تَقْتُلُوٓا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل:۳۱)

یہ قتل اولاد کی ملعون رسم دختر کشی کے دستور کے علاوہ ہے۔مقصود اس سے تمام تر (افزائش نسل) کو روکنا ہے،افلاس کا ذکر اس لیے فرمایا کہ فلاسفہ،مادیین اور منکرین جاہلیت اپنے نظریہ کی عقلی توجیہ عموماً یہی کرتے ہیں۔چنانچہ آج جاہلیت فرنگ کے زیر سایہ جو شاندار تحریک قتل اولاد کی،خفی وباریک صورت کی ''منع حمل'' کے نام سے جاری ہے،اس کا محرک بھی یہی خوفِ افلاس ہے۔

مالتھس نامی ایک ماہر معاشیات جو برطانیہ میں انیسویں صدی کی ابتدا میں ہوا ہے،قتل اولاد یا ''منع حمل'' کی تحریک اصلاً اسی کی چلائی ہوئی ہے۔اس کے سارے نظریہ کی بنیاد یہی خوف افلاس ملک ہے۔

بعض علمائے سلف نے آیت کے ان الفاظ سے عزل یعنی ''منع حمل،

بلاآلاتِ منع حمل'' کے عدم جواز پر استدلال کیا ہے۔

"وقد يستدل بهذا من يمنع العزل ، لان الوأد يرفع الموجود والنسل ، والعزل منع أصل النسل فتشابها ، الاان قتل النفس اعظم وزرا واقبح فعلا۔" [1]

﴿ يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ﴾ (٤/ النساء:١٣٦)

''یعنی اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے ہو جاؤ۔ خواہ وہ تمہارے یا تمہارے والدین اور قرابت داروں کے خلاف ہی ہو۔''

سورۂ مائدہ میں ارشاد ہے:

﴿ يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ﴾

(٥/ المائدة:٨)

''اے ایمان والو! اللہ کے لیے پوری پابندی کرنے والے اور عدل کے ساتھ شہادت دینے والے بن جاؤ کسی قوم کی دشمنی تم کو انصاف کا دامن چھوڑنے پر آمادہ نہ کرے، انصاف کرو انصاف تقویٰ سے بہت زیادہ قریب ہے۔''

پہلی آیت میں "قوامين بالقسط شهداء لله" فرمایا گیا ہے اور دوسری آیت میں ترتیب بدلی ہوئی ہے "قوامين لله شهداء بالقسط" معمولی غور و فکر سے اس فرق کی حکمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ دوستی ہو یا دشمنی یہ دونوں چیزیں انسان کو جادۂ انصاف سے ہٹا دیتی ہیں۔ سورۂ نساء میں دوستی اور محبت میں غلو کی بنا پر انصاف کا دامن چھوڑنے سے روکا گیا ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ عدل وانصاف

---

[1] قرطبی جلد ۷ صفحہ ۱۳۲؛ تفسیر ماجدی جلد ۱ صفحہ ۳۱۹۔

کے تقاضے انسان کی نگاہ سے اوجھل ہوجائیں، یہاں "بالقسط" ہی پہلے لانا موزوں تھا۔سورۂ مائدہ میں دشمنی اورنفرت میں انتہا پسندی کی بنا پرناانصافی کی راہ پر چلنے کی ممانعت کی گئی ہے۔اس موقع پر جب کسی فرد یاقوم کا جذبہ انتقام بھڑکتا ہے تو جان ومال اورناموس کی تباہی اوربربادی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔حساس انسانیت اس صورت حال کودیکھ کر چیخ اٹھتی ہے۔اس کاایک نمونہ تقسیم ہند کے موقع پر ۱۹۴۷ء میں دنیا دیکھ چکی ہے۔یہاں "للّٰہ" پہلے لایا گیاہے،تاکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کاواسطہ دے کرظالموں کوظلم وسفاکی سے روکاجائے اوراس کی پکڑ سے ڈرایاجائے۔اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا:

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (۵/ المائدۃ:۸)

"اللہ سے ڈرتے رہو بیشک اللہ تعالیٰ کوپوری طرح خبر ہے کہ تم کیاکرتے رہتے ہو۔"

سورۂ نساء میں بھی یہی صفت خبیر آخرمیں بیان کی گئی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ صفت خبیر انسان کے پیش نظر رہے توظلم وبے انصافی کی ایک مثال ہی دنیانہ دیکھ سکے۔

(ھذا ماخطر فی بالی واللہ اعلم وعلمہ أتم)

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

قرآنی ترتیب کلمات کے مصالح وحکم

علامہ سہیلی رحمۃ اللہ علیہ کا قول

تقدم کی پانچ قسمیں ہیں:

① زمانی ② طبعی ③ رتبی ④ سببی ⑤ بلحاظ فضل وکمال

ان اسباب خمسہ کی بنا پر جب کوئی معنی مقدم ہوتا ہے تو اس معنی پر دلالت کرنے والا لفظ بھی مقدم ہوگا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صرف لفظی خفت وثقل کالحاظ کرتے ہوئے عبارت کی ترتیب رکھی جاتی ہے، معنی کالحاظ نہیں ہوتا۔ جیسے ربیعہ اور مضر، فضیلت کے لحاظ سے مضر کو مقدم ہونا چاہیے تھا، لیکن یہاں لفظی خفت کو پسند کیا گیا ہے۔ مضر کی تقدیم کی صورت میں پے در پے حرکات کثرت کے ساتھ ہوجائیں گی، اس کو مؤخر کرنے کی صورت میں وقف پڑھا جائے گا اور پے در پے بہت سی حرکات کا بوجھ رہے گا۔

علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد

اسی بنا پر قرآن میں انس پر جن کو مقدم کیا گیا ہے۔ کلمہ انس، نون خفیفہ اور سین مہموسہ کی وجہ سے خفیف ہے۔ اثقل کو پہلے لانا زیادہ موزوں تھا کیونکہ ابتداءً متکلم خوشی اور راحت سے ہمکنار رہتا ہے اور معنوی طور پر اس کی وجہ اور بھی ہے جو آیندہ بیان کریں گے۔

علامہ سہیلی رحمۃ اللہ علیہ کی تصریح

تقدم زمانی، جیسے محسوسات میں عاد کا تقدم ثمود پر اور ظلمت کا تقدم نور پر۔ عقلاً ظلمت عقلیہ نور سے سابق ہے، یعنی جہالت علم سے پہلے ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ (١٦/ النحل: ٧٨)

دوسرے مقام پر ہے:

﴿ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ﴾ (۳۹/ الزمر:٦)

محسوس ظلمات تین ہیں:

① ظلمة الرحم ② ظلمة البطن ③ ظلمة المشيمه

اور عقلی ظلمتیں ادراکات ثلاثہ (عقل، سمع، بصر) کے فقدان کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں اس لیے کہ ہر آیت کا ایک ظاہری پہلو ہوتا ہے اور ایک معنوی، باطنی اور ہر انتہا پر علم وبصیرت کی دوسری راہیں کھلتی ہیں۔ حدیث میں ہے:

((ان الله خلق عباده في ظلمة ثم القى عليهم من نوره)) [1]

تقدم طبعی کی مثال:

﴿ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ﴾ (۳۵/ فاطر:۱)

﴿ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ ﴾

(۵۸/ المجادلة: ۷)

اعداد کا تقدم وتاخر طبعی لحاظ سے ہوتا ہے جیسے حیوان کا تقدم انسان پر اور جسم کا حیوان پر۔ اور اسی قبیل سے "العزیز الحکیم" طبعی طور پر پہلے عزت پھر حکمت، اور اس کو تقدم سببی بھی قرار دے سکتے ہیں۔ اس قسم کی مثالیں قرآن میں بہت ہیں:

﴿ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴾ (۲/ البقرة:۲۲۲)

توبہ طہارت کا سبب ہے۔

﴿ كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴾ (۲٦/ الشعراء:۲۲۲)

افک گناہ کا سبب ہے۔

اسی طرح "معتداثیم" ہے لیکن "همّاز" کا تقدم "مشاء بنميم" پر تقدمِ رتبی ہے۔ "همّاز" عیب چین، حرکت اور نقل مکانی کا محتاج نہیں، بخلاف "نمّام"

[1] مسند احمد ۲/ ۱۷٦، ۱۹۷۔ مسند احمد میں "عباده" کی جگہ "خلقه" کا لفظ ہے۔ علامہ البانی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، الصحیحة (۱۰۷٦)

چغل خور کے۔ اسی طرح "مناع لخیر" کا تقدم "معتد" پر بھی رتبۃً ہے۔ "مناع" (روکنے والا) خود اپنے نفس سے خیر کو روکتا ہے اور معتدی، غیر پر اور غیر سے پہلے خود اپنے اوپر زیادتی کرتا ہے۔

تقدم رتبی کی تیسری مثال: ﴿يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ﴾ (۲۲/ الحج: ۲۷) ہے اس لیے کہ جو پیدل آتا ہے وہ نزدیک جگہ سے آتا ہے اور" ضامر" پر سوار ہو کر آنے والا دُور مقام سے آتا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''میں نے تمنا کی کہ میں پیدل حج کرتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پیادوں کو سواروں پر مقدم کیا ہے۔'' [1] یہاں ابن عباس رضی اللہ عنہما نے تقدم افضلیت مانا ہے۔ تقدم رتبی اور تقدم افضلیت دونوں ہوسکتے ہیں۔ ایک معنی کا تقدم کئی کئی وجوہ کی بنا پر ہوسکتا ہے اور کبھی ایک ہی وجہ کی بنا پر۔

فضل وشرف کے لحاظ سے تقدم

مثلاً:

﴿فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ﴾ (۵/ المائدۃ: ٦)

اور ﴿النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ﴾ (٤/ النساء: ٦٩)

﴿سَمِيعٌ بَصِيرٌ﴾ (۲۲/ الحج: ٦١)

اسی بنا پر جن کا تقدم ہے انس پر کیونکہ لفظ جن اُن مخلوقات کو بھی شامل ہیں جو نظروں سے اوجھل ہیں، جیسے ملائکہ۔

﴿وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا﴾ (۳۷/ الصافات: ۱۵۸)

وقال الاعشی:

وسخر من جن الملائك شیعة   قیاما لدیه یعملون بلااجر

ایک شبہ کا ازالہ

باقی رہا مندرجہ ذیل آیات:

[1] تفسیر الطبری، سورۃ الحج (آیت: ۲۸) ۱۸/ ۲۰۸۔

﴿ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ﴾ (۵۵/ الرحمن:۷٤)

اور﴿ لَا يُسْأَلُ عَنْ ذَنْبِهِ إِنْسٌ وَلَا جَانٌّ ﴾ (۵۵/ الرحمن:۳۹)

اور﴿ وَأَنَّا ظَنَنَّا أَنْ لَنْ تَقُولَ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ﴾

(۷۲/ الجن:۵)

میں لفظ جن ملائکہ کو شامل نہیں کیونکہ وہ عیوب سے پاک ہیں اور نہ ان کے بارے میں کذب بیانی کا گمان ہوسکتا ہے اور نہ دوسرے گناہوں کا احتمال ہے۔ تو ایسی صورت میں انس کو شرف وکمال کی بنا پر جن سے پہلے لایا گیا۔

آسمان کا تقدم زمین پر رتبۃً بھی ہے اور شرف فضل کے لحاظ سے بھی۔ آیت ﴿ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ﴾ (۱۰/ یونس: ٦١) میں ”أرض“ (زمین) کا تقدم رتبۃً ہے اور انسان زمین ہی کے باشندے ہیں۔اس لیے اس مناسبت سے نظم قرآنی میں ”ارض“ کو ”سماء“ پر مقدم رکھا گیا۔لیکن سورۂ سبا میں ”سموات“ کا تقدم ارض پر اس لیے ہے کہ وہاں سابق جملہ میں عالم الغیب کا ذکر ہے۔

مال کا تقدم اولاد پر

مال کی موجودگی میں اولاد کی بخشش ایک نعمت ہے اور باعث مسرت ہے اور تنگ حالی کے زمانہ میں فکروغم کا سبب۔ مال کی وجہ سے نعمت اولاد تکمیل کو پہنچ جاتی ہے گویا مال اولاد کے لیے سبب ہے۔

﴿ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ ﴾

(۳/ آل عمران : ١٤)

یہاں ”نساء“ (عورتوں) کا تقدم ”بنین“ (بیٹوں) پر سببی ہے۔(اور ”اموال“ کا تقدم ”بنین“ پر رتبۃً ہے۔) [1]

---

[1] بدائع ۱/ ٦١-٦٣۔

قرآن میں بعض الفاظ کو جمع اور بعض کو مفرد لانے کی وجہ

سوال: "سموات" کو جمع اور "ارض" کو واحد کیوں لایا گیا اور اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب یہاں لفظی اور معنوی دولحاظ سے فرق ہے۔"سماء" کی جمع "سموات" ذوق پرگراں نہیں گزرتی۔ "ارض" کی جمع "آرض، آراض، اروض" سب غیر فصیح ہیں۔اس لیے قرآن نے "ارض" کے تعدّد کو "ومن الأرض مثلهن" سے ظاہر کیا ہے۔

فرق معنوی

① اگر "سماء" سے یہ ظاہری نیلگوں چھت مراد ہے تو ایسی صورت میں جمع سالم ہی لانا مناسب ہے۔کیونکہ یہاں قلیل تعداد ہے اور قلت کی صورت میں جمع سالم لانازیادہ موزوں ہے، یہ جمع تثنیہ سے قریب ہے اوراس تثنیہ کا واحد سے قریبی تعلق ہے۔اگر "سماء" سے وصفی بلندی مراد لی جائے تو پھر مصدر کے حکم میں ہوگا، جیسے کہا کرتے ہیں "قوم عدولٌ"۔"ارض" کا استعمال اکثر "تحت" اور "اسفل" (نیچے) کے معنی میں آیا ہے، ذات اورعدد کم مراد لیے گئے ہیں۔جہاں کہیں ذات اورعدد کا اظہار مقصود ہے وہاں پر "ومن الارض مثلهن" سے اس مدعا کو پورا کیا گیا ہے۔

② آسمان کو وسعت وکشادگی کے مقابلہ میں زمین ایسی ہے جیسے کھلے میدان میں ایک کنکری۔ ویسے چاہے بذاتِ خود کتنی بڑی کیوں نہ ہو۔"سماء" کے مقابلہ میں واحد اور قلیل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اسی لیے اس کے لیے اسم جنس استعمال کیا گیا ہے۔ (جو کہ قلیل وکثیر سب پر بولا جاتا ہے۔)

③ "ارض" (زمین) کا تعلق دنیا سے ہے جو آخرت کے مقابلہ میں ایسی ہے

جیسے سمندر کے مقابلہ میں قطرہ۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو اسی لیے معمولی الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ باقی رہا آسمان کا تعلق تو بجائے دنیا کے آخرت سے ہے۔ یہ "سموات" فرشتوں کی قرار گاہ، جزا کی جگہ اوروحی الٰہی اورفرشتوں کی آمدورفت کے مرکز ہیں۔جب تعداد اور ذات کا اظہار مقصود ہوا، توجمع کا صیغہ استعمال کیا گیا اورصرف وصف (بلندی) مراد لینے کی صورت میں واحد کی صورت اختیار کی گئی۔

ان آیات میں غور کریں:

① ﴿ءَاَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ اَنۡ یَّخۡسِفَ بِکُمُ الۡاَرۡضَ فَاِذَا ہِیَ تَمُوۡرُ ﴿۱۶﴾ اَمۡ اَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ اَنۡ یُّرۡسِلَ عَلَیۡکُمۡ حَاصِبًا﴾

(٦٧/ الملك:١٦_١٧)

"کیا تم نڈرہوگئے ہواس سے جو آسمان میں ہے کہ دھنسا دے تم کو زمین میں پھراچانک وہ چکر کھانے لگے۔کیاتم بے خوف ہوگئے ہو اس سے جو آسمان میں ہے کہ برسائے تم پر پتھر۔"

یہاں "سماء" سے بلندی مراد ہے، معین آسمان نہیں۔

② ﴿وَمَا یَعۡزُبُ عَنۡ رَّبِّکَ مِنۡ مِّثۡقَالِ ذَرَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ﴾

(١٠/ يونس:٦١)

"اورنہیں غائب ہے تیرے رب سے ذرہ برابر کوئی چیز زمین میں اورنہ آسمان میں۔"

یہاں صرف جنس آسمان مقصود ہے، تعداد بتلانا مطلوب نہیں۔اس لیے "سماء" واحدلایا گیا۔

بخلاف سورۂ سبا کی آیت کے وہاں جمع اس لیے لایا گیا ہے کہ اس سے قبل اللہ تعالیٰ کے ملک وسلطنت کی وسعت وعظمت کا بیان ہے۔

فرمایا:

③ ﴿عٰلِمِ الۡغَیۡبِ ۚ لَا یَعۡزُبُ عَنۡہُ مِثۡقَالُ ذَرَّۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی

الْاَرْضِ﴾ (۳۴/ سباء:۳)

’’غیب کا جاننے والا نہیں پوشیدہ ہے اس سے ذرہ برابر آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔‘‘

غور کریں ذیل کی آیت میں صیغہ جمع کیا حسن پیدا کررہا ہے۔

④ ﴿وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ۭ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ﴾ (۶/ الانعام:۳)

’’اور وہ اللہ آسمانوں میں اور زمین میں جانتا ہے تمہارے کھلے اور چھپے کو۔‘‘

یہاں جمع لانے میں یہ حکمت ہے کہ اس کی اُلوہیت ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے اس کی خدائی ہر آسمان میں ہے، کوئی گوشہ بھی اس سے خالی نہیں۔

⑤ ﴿فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ﴾ (۵۱/ الذاریات: ۲۳)

’’اور قسم ہے آسمان وزمین کے رب کی بے شک وہ حق ہے جیسا کہ تم گفتگو کرتے ہو۔‘‘

یعنی جو کچھ بھی اوپر ہے اور جو کچھ نیچے ہے اس کا رب وہی ہے۔ یہاں پر اس کی ربوبیت و پروردگاری کا عموم ووسعت مقصود ہے۔ اس لیے ایسا لفظ لایا گیا ہے جو ہر بلند وپست پر بولا جاسکے۔ اصل آسمان وزمین میں تغیر ہوسکتا ہے لیکن بلندی وپستی کی حقیقت میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ (۶۲/ الجمعة :۱)

’’پاکی بیان کرتے ہیں اللہ کے لیے جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں۔‘‘

اس آیت میں تدبر کریں، یہاں اس بات کی خبر دینی مقصود ہے کہ آسمان وزمین کے تمام باشندے اپنی کثرت اور مختلف درجوں کے باوجود اللہ کی حمدوثنا

کرتے ہیں۔اس لحاظ سے "سموات" جمع کی صورت میں لانا مناسب تھا۔اس کی نظیر یہ آیت ہے:

﴿ وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ۚ ﴾ (۲۱/ الانبیاء: ۱۹)

"اوراسی کے لیے ہیں جوآسمانوں اور زمین میں ہیں اورجواس کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے سرتابی نہیں کرتے اور نہ تھکتے ہیں۔"

اسی کے مثل یہ آیت ہے:

﴿ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ ﴾ (۱۷/ الاسراء: ٤٤)

"اسی کے لیے تسبیح بیان کرتے ہیں ساتوں آسمان۔"

یعنی خودان کی ذات اللہ کی حمدوثنا میں سرشار ہے۔صرف 'سمٰوات' پر بس نہیں کیا۔ ساتھ "سبع" (سات) بھی لایا گیا، تاکہ اس معنی کی پوری طرح تاکید ہوجائے کہ ہرآسمان اس تسبیح میں مشغول ہے۔

﴿ وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ﴾ (۵۱/ الذاریات: ۲۲)

"اورآسمان میں تمہارا رزق ہے اورجس کاتم وعدہ دیئے جاتے ہو۔"

یہاں رزق سے بارش اورجس کا ہم سے وعدہ کیا گیا ہے اس سے مراد جنت ہے، دونوں بلندی کی جانب ہیں۔یہ معنی نہیں ہیں کہ ہرآسمان میں بارش اور جنت موجود ہے اس لیے مفردلانا زیادہ موزوں ہوا۔

ذیل کی آیت میں غورکریں یہاں جمع کا صیغہ کس قدرموزوں ہے۔فرمایا:

﴿ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ ﴾

(۲۷/ النمل: ٦۵)

"کہہ دو جوآسمانوں اورزمین میں ہے ان میں سے کوئی بھی غیب

نہیں جانتا سوائے اللہ تعالیٰ کے۔"

یہاں ہر آسمان کی مخلوق سے علم غیب کی نفی کرنا مقصود ہے اس لیے جمع لایا گیا۔ قرآن کا اندازِ بیان کامل غور وفکر کو چاہتا ہے۔ جہاں کہیں بارش کے برسنے کی خبر دی ہے وہاں "السماء" واحد ہی لایا گیا ہے۔ کیونکہ بارش آسمان سے نہیں برستی بلکہ بلندی سے اُترتی ہے، اس جگہ وصف مراد ہے ذات نہیں۔

سوال ذیل کی دو آیتوں میں سے ایک میں سمٰوات جمع اور دوسری میں واحد لایا گیا ہے۔ اس میں کیا حکمت ہے؟

① ﴿قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ﴾ (۱۰/ یونس:۳۱)

"کہہ دو کون رزق دیتا ہے تم کو بلندی سے اور زمین سے اور کون مالک ہے آنکھوں اور کانوں کا۔"

② ﴿قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ﴾

(۳٤/ سباء:۲٤)

"کہہ دو کون تم کو رزق دیتا ہے آسمانوں سے اور زمین سے کہہ دو اللہ۔"

جواب یہاں نہایت باریک فرق ہے۔ دونوں آیتوں کا سیاق وسباق اور نظم کلام مختلف ہے۔ سورۂ یونس میں آثارِ ربوبیت (پروردگاری) کو بیان کر کے مشرکین کو الزام دیا گیا ہے اور ان پر ایسے دلائل کے ساتھ حجت قائم کی گئی ہے جس کا وہ انکار کر ہی نہیں سکتے۔ ان کو خود اس امر کا اقرار تھا کہ وہی صرف معبود ہے۔ قوت بینائی وشنوائی کا مالک، روزی دینے والا، زندہ کو مردہ اور مردہ کو زندہ کرنے والا، کاموں کی تدبیر کرنے والا وہی ہے۔ جب حال یہ ہے تو معبود حقیقی کے ساتھ عبادت میں دوسروں کو شریک کیسے ٹھہراتے ہیں جو کسی نفع ونقصان کے مالک نہیں ہو سکتے۔ قرآن نے ان کا اقرار خود ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

﴿فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ﴾ (۱۰/ یونس:۳۱)

''پھر وہ ضرور کہیں گے اللہ۔''

احتجاج والزام کے موقعہ پر صرف وہی امور بیان ہوسکتے ہیں جن کو مخاطب تسلیم کرتا ہے۔ بلندی سے پانی برسنے کا انہیں اقرار تھا اور جس آسمان کو وہ آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے تھے اسی سمت سے پانی کا اُترنا ان کے نزدیک مسلّم تھا۔ باقی رہا ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک رزق کا منتقل ہونا تو اس کا ان کو اقرار تھا اور نہ علم۔

اسی لیے لفظ ''سماء'' واحد لایا گیا۔ یہاں بادل کو ''سماء'' کہا گیا ہے بادل کو بلندی کی وجہ سے سماء کہا جاتا ہے۔ اس مفہوم کی تائید ذیل کی آیت کرتی ہے:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ ﴾ (۳۰/ الروم: ٤٨)

''اللہ ہی وہ ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے پھر وہ بادلوں کو حرکت دیتی ہیں پھر اللہ بلندی پر جس طرح چاہتا ہے ان کو پھیلا دیتا ہے۔''

ظاہر بات ہے کہ بادل بلندی کی سمت میں پھیلے ہوئے ہیں نہ کہ آسمان میں، یہ چیز تو مشاہدہ سے معلوم ہورہی ہے اس کا انکار کیسے ہوسکتا ہے۔ ہاں جو چیز آسمانوں سے اُترتی ہے وہ وحی الٰہی ہے۔ دل ودماغ اور روح اس سے غذا حاصل کرتے ہیں، یہ غذا رزق کہلانے کی زیادہ مستحق ہے۔ بارش سے تو صرف ناپائیدار زندگی ہی حاصل ہوتی ہے۔ بخلاف اس رزق کے کہ یہ دائمی ابدی قوت بخشتا ہے، زمین وآسمان کی زندگی کا مدار اسی پر ہے۔ رزق کی تمام اقسام میں سے یہ قسم سب سے ممتاز اور اہمیت رکھتی ہے۔ قرآن کے مخاطبین اس کے قائل نہ تھے۔ اس لیے الزام کے موقعہ پر اس کو پیش نہیں کیا گیا اور ''سماء'' بجائے جمع کے واحد لایا گیا۔

لیکن سورۂ سبا کا مفہوم دوسرا ہے وہاں مشرکین کے اقرار کا ذکر نہیں ہے بلکہ سوال کا جواب رسول اللہ ﷺ کی زبان سے ہی دیا گیا ہے۔

فرمایا:

﴿قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ﴾ (۳۴/ سبا:۲۴)

”کہہ دو اے محمد (ﷺ)! کون تم کو آسمانوں اور زمین سے روزی دیتا ہے کہہ دو اللہ۔“

یعنی اللہ تعالیٰ ہی قسم قسم کے رزق اور فائدے آسمانوں اور زمین سے عطا فرماتا ہے۔(بارش بھی اسی میں داخل ہے اور وحی الٰہی بھی اس سے مراد ہے۔) زمین کو جمع لانے کے لیے ترتیب کلام کا تقاضا نہ تھا اس لیے کہ اس سے حصول رزق کا کسی کو انکار نہیں۔اس بنا پر ”الارض“ کو دونوں جگہ واحد لایا گیا۔

ریح اور ریاح

قرآن میں ریح کو کبھی جمع اور کبھی مفرد ذکر کیا گیا ہے اس میں بھی حکمت ہے۔ عذاب کے بیان میں ریح اور رحمت کے مقام پر ریاح مذکور ہے۔اس فرق میں راز یہ ہے کہ رحمت کی ہواؤں کے سرچشمے، فائدے اور صفتیں مختلف ہیں۔جب ان میں سے ایک ہوا چلنے لگتی ہے تو اس کی تیزی اور گرمی کو توڑنے کے لیے مقابل سمت سے دوسری ہوا جاری ہو جاتی ہے تو پھر ان دونوں کے درمیان سے ایک نہایت لطیف اور خوشگوار ہوا نمودار ہوتی ہے جو حیوانات، نباتات سب کو نفع بخشتی ہے۔اس طرح ان میں سے ہر ہوا رحمت کا سبب بن جاتی ہے۔

لیکن عذاب کے موقع پر ایک ہی سمت سے ہوا چلتی ہے۔اس کی شدت اور تیزی کو توڑنے کے لیے دوسری سمت سے کوئی ہوا ظاہر نہیں ہوتی، جیسے چلتی ہے ویسے ہی گزر جاتی ہے۔رب کے حکم کے مطابق جس قوم کو تباہ کرنا ہوتا ہے اُسے تباہ کر دیتی ہے۔اس لیے قوم عاد پر بھیجی ہوئی ہوا کو ”عقیم“ (بانجھ) کہا گیا ہے۔

﴿اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ۚ﴾ (۵۱/ الذاریات:۴۱)

یعنی ایسی ہوا جو ہر قسم کی خیر و برکت سے خالی ہو اور جس پر سے گزرے اس

کو بھی "عقیم" بنا کر چھوڑے۔

ریح اور ریاح کا یہ فرق سارے قرآن میں اسی اسلوب کے ماتحت جاری ہے صرف ایک جگہ رحمت کے مقام پر ریح واحد بولا گیا ہے، فرمایا

﴿هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا كُنتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ﴾

(۱۰/ یونس:۲۲)

"اللہ وہ ذات ہے جو تم کو چلاتا ہے خشکی اور تری میں یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور وہ خوشگوار ہوا کے ساتھ تم کو لے چلتی ہے اور پھر وہ اترا جاتے ہیں تو تیز ہوا آ پہنچتی ہے۔"

یہاں رحمت کے مقام پر ریح کو واحد اسی لیے لایا گیا ہے کہ کشتی کے لیے ایک ہی سمت کی ہوا مفید ہوتی ہے۔ مختلف سمت کی ٹکرانے والی ہوائیں باعث تباہی و بربادی ہیں، یہاں ایک ہی ہوا مطلوب ہے نہ کہ بہت سی ہوائیں۔ ممکن تھا کہ یہاں کوئی ریح سے تیز و تندمراد لے لیتا اس لیے صفت "طیبہ" ساتھ ہی بیان فرما دی۔ یعنی یہ ہوا خوشی اور مسرت کا پیام لے کر آتی ہے تباہی و بربادی کا پیش خیمہ نہیں بنتی۔

ظلمات، نور، یمین شمائل

اسی باب سے ظلمات و نور، یمین اور شمائل جیسے الفاظ بھی ہیں۔ ظلمت کو جمع اور نور کو واحد، سبیل حق کو مفرد اور سبیل باطل کو جمع لایا گیا ہے۔ یہی حال یمین و شمائل کا ہے۔ حسب ذیل آیات میں غور کیجیے:

① ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّورَ﴾ (٦/ الانعام:١)

"سب تعریف اس اللہ کے لیے جس نے زمین و آسمان پیدا کیے اور روشنی و تاریکیاں بنائیں۔"

② ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ﴾ (٦/ الانعام: ١٥٣)

''یہ میرا سیدھا راستہ ہے اس کی پیروی کرو۔(دوسری)راہوں کی پیروی مت کرو، وہ تمہیں اللہ کی راہ سے دُور کردیں گے۔''

③ ﴿يَتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَاۗىِٕلِ﴾ (١٦/ النحل:٤٨)

''اس کے سائے جھکتے ہیں دائیں اور بائیں۔''

ان سب آیات کا حل ایک ہے۔حق کی راہ ایک ہی ہے اورایک ہی کے لیے ہے اورایک ہی تک اس کی انتہا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ﴾ (١٥/ الحجر:٤١)

''یہ سیدھی راہ مجھ پر ہے۔''

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: راہ حق اللہ پر ہے اسی کی طرف اس کا مرجع ہے۔

عربی کا محاورہ ہے:

"طريقك على" ''تیراراستہ مجھ پرہے۔''

اس کی نظیر یہ آیت ہے:

﴿وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ﴾ (١٦/ النحل: ٩)

السبيل القصد ''یعنی وہ راستہ جواللہ تک پہنچادے۔''

ایک شاعر کاقول ہے:

فهن المنايااى وادسلكنه عليها طريقي اوعلى طريقها

''وہ(محبوبات)موت ہیں جس وادی میں بھی چلیں ان پرمیراراستہ ہے یامجھ پران کاراستہ ہے۔''

یہاں مقصود یہ ہے کہ حق کی راہ ایک ہی ہے اس لیے کہ اس کا مرجع اور مرکز صرف ایک ذات ہے یعنی الملک الحق۔ لیکن باطل کی راہیں مختلف اورمتعدد ہیں ان کا کوئی مرکز اورمقصد نہیں۔سیدھی راہ اپنے انواع واقسام کے لحاظ سے

متعدد ہو جائے تب بھی اس کی اصل ایک ہی قرار دی جائے گی۔ جب کہ ظلمت بمنزلہ باطل اور نور بمنزلہ حق کے ہے اس لیے ظلمات کو جمع اور نور کو واحد لایا گیا۔
اسی انداز پر یہ آیت ہے:

﴿ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڛ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔــھُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَھُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ ﴾

(۲/ البقرۃ: ۲۵۷)

"اللہ تعالیٰ دوست ہے اُن کا جو ایمان لے آئے، نکالتا ہے ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف، جن لوگوں نے کفر کیا ان کے ولی طاغوت ہیں جو ان کو روشنی سے اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں۔"

ایمان داروں کا ولی، مددگار اور کارساز ایک اللہ ہی ہے، اس لیے ولی مفرد لایا گیا۔ کفار کے ولی بہت سے ہیں، اس لیے اولیا جمع استعمال کیا گیا۔ اسی طرح ظلمات کو جمع اور نور کو واحد بیان کیا گیا۔ کیونکہ گمراہی کی راہیں بہت سی ہیں اور حق وفلاح کی راہ ایک اور صرف ایک ہے۔

اسی طرح یمین کو واحد اور شمائل کو جمع ذکر کیا گیا کیونکہ یمین دایاں جانب خیر و برکت اور سعادت کو بتلاتا ہے۔ دائیں والے اللہ کے ہاں نجات وفلاح پانے والے ہیں اور بایاں جانب باطل پرستوں کے لیے خاص ہے۔ فرمایا:

﴿ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ ﴾ (۱۶/ النحل: ۹)

سورۂ واقعہ میں واصحاب الشمال واحد اس بنا پر مذکور ہے کہ باطل کی مختلف راہیں ہونے کے باوجود تمام اہل باطل کا داخلہ صرف جہنم میں ہوگا جو کہ بائیں جانب ہے۔ اس لیے واحد لانا ہی مناسب تھا۔ اسی طرح سورۂ ق میں ہے:

﴿ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ﴾ (۵۰/ ق: ۱۷)

یہاں صرف مقصود یہ ہے کہ بندہ کے دونوں جانب دو فرشتے نگران بیٹھے

رہتے ہیں جو ہر خیر و شر کو لکھتے رہتے ہیں۔ یہاں جمع لانے کی کوئی وجہ نہ تھی، اس کے برعکس یہ آیت ہے:

﴿ثُمَّ لَآتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ﴾ (۷/ الأعراف: ۱۷)

یہ ابلیس کا قول نقل کیا جا رہا ہے کہ میں انسانوں کو گمراہ کرنے کے لیے ان کے پاس پہنچوں گا۔ یہاں چونکہ ان لوگوں کی کثرت مراد ہے جن کو وہ گمراہ کرنا چاہتا ہے اس لیے جمع کے مقابلہ میں جمع ہی لانا مناسب تھا۔ گویا اس نے یوں کہا کہ میں ہر ایک انسان پر اس کی ہر سمت سے حملہ آور ہوں گا۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے:

﴿فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ﴾ (۵/ المائدۃ: ۶)

''دھو ڈالو اپنے چہرے اور ہاتھ کہنیوں تک۔''

شمائل کو جمع لانے کی وجہ بعض علما نے یہ بیان کی ہے کہ اس آیت میں ظلال (سایہ) کا بیان ہے۔ ابتدائی دن میں سایہ انتہائی لمبائی لیے ہوئے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ہی سایہ نظر آتا ہے اور ایسا دائیں جانب ہوتا ہے، پھر آہستہ آہستہ یہ سایہ کم ہونے لگتا ہے۔ لیکن جب سایہ کا رخ بائیں جانب پھرتا ہے تو آہستہ آہستہ بڑھنے لگتا ہے۔ گویا یہ اضافہ پہلے سایہ سے الگ کوئی دوسری چیز ہے۔ اس طرح تمام سائے کا ہر جزو مستقل ایک ظل (سایہ) ہے، اس لیے شمائل جمع لانا مناسب ہوا۔

اسی طرح قرآن میں مشرق و مغرب کو کبھی مفرد، کبھی تثنیہ، کبھی جمع لایا گیا ہے اور یہ فرق مقام کی مناسبت ہی سے ملحوظ رکھا گیا ہے۔

جمع کی مثال

﴿فَلَآ أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ﴾ (۷۰/ المعارج: ۴۰)

''میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے رب کی۔''

تثنیہ کی مثال

﴿ رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ۚ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴾

(۵۵/ الرحمن: ۱۷-۱۸)

''دو مشرق اور دو مغرب کا رب پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔''

واحد کی مثال

﴿ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ﴾

(۷۳/ المزمل: ۹)

''مشرق و مغرب کا رب ہے، نہیں کوئی الٰہ مگر وہی پس اسی کو بنالے کارساز۔''

ان آیات میں غور وفکر کریں کس قدر حکمت و لطافت سے پُر ہیں۔ اندازِ بیان کا یہ فرق قرآن کی عظمت اور جلالتِ شان اور ربانی کلام ہونے کو ظاہر کر رہا ہے۔ اس کا نازل کرنے والا الحکیم وحمید کے سوا اور کون نہیں ہوسکتا ہے۔ مشارق کو جمع اس لحاظ سے لایا گیا ہے کہ ہر دن کا مشرق و مغرب دوسرے دن سے الگ ہوتا ہے۔ سال کے ایام بہت سے ہیں اس لیے جمع مناسب ہوا۔ مشرق و مغرب کو واحد لانے کی وجہ ظاہر ہے، پورب و پچھم کے دونوں افق مراد ہیں اور تثنیہ کی صورت میں ایک مشرق سے مرادِ مشرقِ ارتفاع (بلندی) ہے اور دوسرے سے مشرقِ انحطاط (پستی) مقصود ہے۔ یہی صورت مغرب کی بھی ہے۔

اس اندازِ بیان کو ہر مقام سے خاص مناسبت ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ سورۂ رحمٰن میں اللہ تعالیٰ نے کائنات کی مختلف چیزیں دو دو بیان کی ہیں۔ مثلاً ایجاد کی دو قسمیں، خلق اور تعظیم بیان کیں۔ دنیا جہان کے دو بڑے چراغ سورج و چاند کا ذکر کیا، نباتات کی دو قسمیں بیان کیں:

① وہ جو زمین پر پھیل جاتی ہے اور اس کا تنا نہیں ہوتا، اس کو عربی میں نجم

کہتے ہیں۔

② وہ جو تنا رکھتی ہے، اس کو شجر کہتے ہیں۔

پھر بلند آسمان اور ہموار زمین کی طرف توجہ دلائی اور اس کی خبر دی کہ اس نے ایک کو بلند کیا اور دوسری کو پست کیا۔ پھر اس میزان کے ساتھ انصاف کی تعلیم دی اور ظلم سے روکا۔اس کے بعد زمین کی دو قسم کی پیداوار بیان کیں، یعنی غلہ اور پھل۔ مکلفین کی دو انواع کا تذکرہ کیا جن اور انسان۔ پھر دو قسمیں مشرق کی اور دو قسمیں مغرب کی بیان کیں اور دو قسم کے سمندروں کا حال بیان کیا، ایک میٹھا دوسرا کھاری۔یہاں تثنیہ (دو) لانا ہی موزوں تھا، واحد یا جمع لانا ذوق کے کسی طرح مناسب نہ ہوتا۔

سورۂ مزمل میں غور کریں، یہاں سیاق وسباق (یعنی اگلی پچھلی عبارت) کے واحد ہی مناسب ہے۔ پہلے رات دن کا ذکر کیا اور رسول ﷺ کو رات کے قیام کا حکم دیا اور یہ بتلایا کہ دن میں تمہارے مشاغل زیادہ ہیں۔ اس کے بعد فرمایا:

﴿ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ ﴾ (۷۳/ المزمل:۹)

''مشرق دن کا مظہر ہے اور مغرب رات کی نشانی۔''

یہ دونوں الگ الگ واحد ہیں اس لیے ان کے مظاہر و آثار کو بھی واحد لایا گیا۔ اس سے کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ دن کا ظہور ہمیشہ مشرق ہی سے ہوتا ہے اور رات کا مغرب سے۔سورۂ معارج میں مشارق و مغارب جمع لایا گیا ہے، یہ بھی لطافت و حکمت سے خالی نہیں۔ فرمایا:

﴿ فَلَآ أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ إِنَّا لَقٰدِرُونَ ۝ عَلٰٓى أَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ۝ ﴾ (۷۰/ المعارج:۴۰، ۴۱)

''میں قسم کھاتا ہوں مشارق و مغارب کے رب کی بے شک ہم قادر ہیں کہ ان کو بہتر سے بدل ڈالیں اور ہم (اس معاملہ میں) عاجز نہیں ہیں۔''

یہاں جبکہ سیاق و سباق ربوبیت (پروردگاری) کی وسعت اور اس کی قدرت کی ہمہ گیری کو بتلا رہا ہے اور یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مشرکین کے معبودانِ باطل کو فنا کر کے ان سے بہتر مخلوق کو دنیا میں آباد کر سکتا ہے۔ یہی مناسب تھا کہ مشارق و مغارب کو جمع لایا جائے۔سورج اللہ کی بڑی نشانیوں میں سے ہے اس کی مشرق و مغرب کی روزانہ گردش رب العالمین کی عظمت و جلال کی بڑی دلیل ہے۔ پس جو رب اتنی بڑی مخلوق کو روزانہ چکر دے سکتا ہو اور اس کے طلوع و غروب کی جگہوں کو ہر دن بدل سکتا ہو، کیا وہ انسانوں کے بدلنے اور اُن سے بہتر لانے پر قادر نہیں ہو سکتا؟ نیز یہ بھی واضح رہے کہ سورج اپنے مختلف طلوع و غروب کے لحاظ سے حیوانات اور نباتات میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کرتا ہے اور ایک حال سے دوسرے حال میں ڈالتا ہے۔ گرمی، بارش، ہوائیں اور اولے یہ سب گونا گوں تغیرات اسی کے طفیل ہیں۔ دنیا میں بڑے بڑے حوادث کا ظہور سورج ہی کے اتار چڑھاؤ کے اختلاف سے ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ عزیز (زبردست) علیم (جاننے والے) کی تقدیر (اندازہ) کا نتیجہ ہے، ان روشن دلائل اور کھلے ہوئے مشاہدات کے ہوتے ہوئے موجودہ مخلوق سے بہتر لانے سے اللہ کیسے عاجز رہ سکتا ہے؟ اسی معنی کی تاکید "وما نحن بمسبوقین" سے کی گئی ہے۔ یہاں جمع کے صیغہ کے علاوہ کوئی دوسرا لفظ مناسب ہو ہی نہیں سکتا ہے۔

سورۂ صافات میں بھی مشارق جمع لایا گیا ہے، فرمایا:

﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ﴾

(۳۷/ الصّٰفّٰت: ۵)

"آسمانوں اور زمین اور جو اُن کے درمیان ہیں اور مشارق کا رب۔"

اس سے قبل بہت سی مخلوقات کا ذکر ہے، اس لیے مشارق کو جمع لانا ہی سیاق کے لحاظ مناسب تھا۔ کثرت کے ساتھ جمع کے ذکر نے خاص حسن و جمال

پیدا کر دیا ہے۔

یہاں صرف مشارق کا ذکر کیا گیا ہے اس میں بھی خوبی ہے، آیت کا مضمون صرف مشارق کے بیان ہی کو چاہتا ہے۔ مشارق روشنی کے مرکز ہیں، حیوانی زندگی، معاش، آمدورفت اور خوشی کے اسباب سب اسی سے وابستہ ہیں۔ یہ سورج کا طلوع اور اس کے اثرات ایسے مشاہدہ میں آنے والے دلائل ہیں جن کا انکار کوئی نہیں کر سکتا۔ اسی لیے قیامت کے ذکر سے پہلے اس کو بیان کیا گیا۔ بعد میں کفار کی تکذیب (جھٹلانا) اور قیامت کے انکار اور نبی ﷺ کا ان کی باتوں سے تعجب، ان سب امور کو نہایت مناسبت سے لایا گیا ہے۔ پس یہاں صرف مشارق کا ذکر اصل مقصود کے نہایت مناسب ہے۔ [1]

[1] بدائع الفوائد ۱/ ۱۱۵-۱۲۲۔

فصل عظیم النفع

ایسے بارہ گناہ جن سے توبہ کیے بغیر چارہ نہیں۔

قرآن مجید میں بارہ محرمات ایسے بیان ہوئے ہیں۔جن سے باز رہے بغیر کسی انسان پر لفظ تائب کا اطلاق نہیں ہوسکتا:

① کفر ② شرک
③ نفاق ④ فسوق
⑤ عصیان ⑥ اِثم
⑦ عدوان ⑧ فحشاء
⑨ منکر ⑩ بغی
⑪ قول علی اللہ بلاعلم
⑫ مؤمنوں کی راہ کے علاوہ کسی دوسری راہ کی پیروی کرنا۔

تمام محرمات شرعیہ کا دارومدار انہی بارہ پر ہے۔توبۃ النصوح (خالص) اسی صورت میں ہوسکتی ہے جبکہ انسان ان بارہ گناہوں سے پرہیز کرنے کا پورا ارادہ کرے۔ان سب کی معرفت (پہچان) ضروری ہے،تاکہ پرہیز کرنے میں آسانی ہو۔

کفر کی حقیقت اور قسمیں

کفر کی دو قسمیں ہیں:

① کفر اکبر ② کفر اصغر

بڑا کفر وہ ہے جس کی وجہ سے انسان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنمی بن جاتا ہے، چھوٹا کفر وہ ہے جس کی بنا پر وعید کا مستحق بن جاتا ہے، لیکن دائمی طور پر وہ عذاب جہنم کا سزاوار نہیں ہوتا، کفر اصغر کی تشریح چند احادیث سے ہو سکتی ہے:

① ((لا ترغبوا عن آبائکم فانه کفر بکم)) [1]

"اپنے باپوں سے نفرت واعراض مت کرو یہ کفر ہے۔"

② "دو باتیں میری امت میں کفر ہیں:

نسب میں طعن اور نکتہ چینی، ماتم اور نوحہ خوانی۔" [2]

③ سنن الترمذی کی روایت ہے:

"جس نے عورت سے غیر فطری فعل کیا، اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری ہوئی وحی سے کفر کیا۔" [3]

④ "جو کاہن کے پاس آیا اور تصدیق کی اس نے وحی محمدی سے کفر وانکار کیا۔" [4]

⑤ ((لاترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض)) [5]

"میرے بعد کافر بن کر مت پلٹنا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنی شروع کر دو۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہی معنی:

---

[1] مسند احمد ٢/ ٥٢٦۔ [2] صحیح مسلم ١/ ٨٢ (١٢١) الإیمان: باب اطلاق اسم الکفر علی الطعن فی النسب والنیاحة۔

[3] سنن الترمذی ١/ ٢٤٣ (١٣٥) الطهارة: باب ماجاء فی کراهیة إتیان الحائض۔

[4] سنن ابوداود ٤/ ٢٢٥ (٣٩٠٤) الطب: باب فی الکاهن۔

[5] صحیح مسلم ١/ ٨٢ (١١٨-١١٩) الإیمان: باب یضرب بعضکم رقاب بعض۔

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾

(٥/ المائدة:٤٤)

''اور جواللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔''

کے کیے ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے :

یہ ایسا کفر نہیں ہے کہ انسان ملتِ اسلامیہ سے نکل کر دوسری ملت میں شامل ہوجائے۔ بلکہ جب وہ ایسا کرتا ہے تو اس کے ساتھ کفر کی آلودگی چسپاں ہوجاتی ہے،اس کو کفر باللہ اور کفر بالیوم الآخر کے ہم پلہ نہیں قرار دے سکتے، طاوس وعطاء رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک اس کا نام کفر دون کفر اور فسق دون فسق اور ظلم دون ظلم ہے۔

بعض نے اس آیت کی تاویل دوسری طرح کی ہے:

یعنی جس نے وحی الٰہی کا انکار کرتے ہوئے حکم سرتابی کی ،لیکن یہ تاویل مرجوح ہے۔دراصل حکم بغیر ماانزل اللہ، کفر اکبر اور کفر اصغر دونوں کو شامل ہے۔اگر کوئی اس بات پر اعتقاد رکھتا ہے کہ اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ کرنا واجب ہے لیکن پھر کسی واقعہ میں اپنے گناہ کا اقرار کرتے ہوئے اس راہ سے ہٹ جاتا ہے تو اسے کفر اصغر کا مرتکب مانا جائے گا۔لیکن اگر یہ خیال کرتا ہے کہ مجھے اس بارے میں کامل اختیار ہے اور میں کسی قانون کا پابند نہیں ہوں۔ حالانکہ اسے یقین ہے کہ اس معاملہ میں اللہ کا فیصلہ یہ ہے تو ایسی صورت میں اسے کفرِ اکبر کا مجرم قرار دیا جائے گا اور اگر نادانی اور خطا سے ایسا ہوا ہے تو اس کو خطا کاروں کے زمرہ میں شمار کیا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ گناہوں کا تعلق کفرِ اصغر سے ہے، یہ کفرِ شکر (اطاعت) کی ضد ہے۔اسی لیے انسانی کوشش کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

① شکر ② کفر ③ دونوں سے خالی، نہ کفر نہ شکر۔

کفرِ اکبر کی اقسام

کفرِ اکبر کی پانچ قسمیں ہیں:

① کفرِ تکذیب (جھٹلانا)

② کفرِ استکبار وانکار مع التصدیق (غرور اور گھمنڈ کے ساتھ) سچا جانتے ہوئے انکار کرنا۔ ③ کفرِ اعراض ④ کفرِ شک ⑤ کفرِ نفاق

1 کفرِ تکذیب

اس کے معنی ہیں انبیائے کرام کو جھوٹا قرار دینا، اس قسم کے کفار کم پائے جاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کی رسالت اور سچائی پر اس قدر دلائل قائم کردیئے کہ اب انکار وتکذیب کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔قومِ فرعون کے بارے میں فرمایا:

﴿ وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا ﴾ (۲۷/ النمل:۱٤)

''اور انہوں نے نشانیوں کا انکار کیا ظلم اور خودپسندی کی بنا پر، حالانکہ ان کے دلوں نے یقین کر لیا تھا۔''

آنحضور ﷺ کے لیے ارشاد فرمایا:

﴿ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴾

(٦/ الأنعام:۳۳)

''بیشک وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے اور لیکن ظالم اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔''

یقین ومعرفت کے باوجود کفر کو بھی کفرِ تکذیب کہا جاسکتا ہے۔کیونکہ اس میں زبانی تکذیب ہوتی ہے۔

2 کفرِ استکبار

اس کا نمونہ ابلیس کے واقعہ میں ملتا ہے۔اس نے اللہ کے حکم کا انکار نہیں

کیا بلکہ تکبر وغرور کی راہ سے سرکشی اور مخالفت پر آمادہ ہوگیا۔اس نوع میں وہ تمام کفار شامل ہیں، جو حق کو پہچان کر غرور سرکشی کی وجہ سے اسے قبول نہیں کرتے۔جیسا کہ فرعون اور اس کی قوم کی روش کو قرآن نے بیان کیا ہے:

﴿ اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴾ (٢٣/ المؤمنون:٤٧)

''کیا ہم اپنے جیسے دو انسانوں پر ایمان لے آئیں حالانکہ ان دونوں کی قوم ہماری غلام ہے۔''

اسی طرح دوسری قوموں نے کہا:

﴿ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ (١٤/ ابراهيم:١٠)

''نہیں ہو تم مگر ہمارے جیسے انسان۔''

اسی طرح یہود کے بارے میں فرمایا:

﴿ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ﴾ (٦/ الأنعام:٢٠)

''اُس (حضرت محمد ﷺ) کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد کو۔''

ابوطالب کا کفر بھی اسی قسم کا تھا اسے قومی غیرت اور نسلی عار نے حق سے باز رکھا، حالانکہ اسے معلوم تھا کہ بھتیجا جو کچھ کہہ رہا ہے وہ حق ہے۔اسے یہ ناپسند تھا کہ اسلام لا کر اپنے آباء پر کفر کا الزام لگائے۔

3 کفرِ اعراض

کفرِ اعراض کی صورت یہ ہے کہ اپنے دل اور کانوں کو حق کی آواز سے پھیر لے نہ تصدیق کرے نہ تکذیب، نہ دوستی رکھے نہ دشمنی بلکہ بے توجہی اور لاپرواہی کی راہ اختیار کرے، جیسا کہ بنی عبد یالیل کے ایک فرد نے کہا تھا:

''بخدا میں تم سے (اے محمد ﷺ) ایک بات کہتا ہوں اگر تم سچے ہو تو میری نگاہ میں نہایت محترم ہو، تمہاری بات کیسے لوٹا سکتا ہوں اور اگر تم جھوٹے ہو تو میں تمہیں منہ لگانا بھی برا سمجھتا ہوں۔'' [1]

4 کفرِ شک

کفرِ شک کی صورت یہ ہے کہ نبی کی سچائی یا جھوٹ دونوں سے کسی پر یقین نہ ہو بلکہ ایک ڈانواں ڈول (اِدھر اُدھر کی) صورت رہے۔

یہ حالت ہمیشہ اُسی وقت رہ سکتی ہے جبکہ اللہ کی آیتوں اور نشانیوں سے اعراض ہوتا ہے اور اپنی نگاہیں اور کان ان کے دیکھنے اور سننے سے بند کرلے۔ لیکن جو اللہ کی نشانیوں میں غور کرے گا تو اس کے لیے سوائے ایمان کے اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ آیات کائنات کی دلالت ایمان باللہ پر ایسی ہی ہے جیسے سورج کی دلالت دن کے وجود پر۔

5 کفرِ نفاق

زبان سے ایمان کا مظاہرہ ہو اور دل کفر کی آلائشوں میں مبتلا ہو، یہ حقیقت میں نفاق اکبر ہے۔

کفر جحود کی دو قسمیں

① کفر مطلق عام: جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے اس کا بالکلیہ انکار۔

② جحود (مقید خاص): اسلامی فرائض میں سے کسی فرض یا محرّمات میں سے کسی حرام یا اللہ کی صفات ثابتہ میں سے کسی صفت یا اللہ کی دی ہوئی چیزوں میں سے کسی چیز کا قصداً یا کسی غرض کی بنا پر شخصی رائے کو مقدم کرتے ہوئے انکار۔

لیکن اگر انکار ناواقفیت یا عدمِ دلیل کی بنا پر ہو تو ایسی صورت میں تکفیر نہیں کی جائے گی اور ایسا کرنے والا معذور سمجھا جائے گا۔ جیسا کہ روایت میں ہے:

> ''ایک شخص نے اپنے گھر والوں کو حکم دیا تھا کہ مرنے کے بعد اُسے جلادیں اور راکھ ہوا میں اڑادیں، کہ اللہ نے مجھ پر قدرت پالی تو سخت عذاب دے گا۔'' [2]

---

[1] سیرة ابن ہشام ۲/ ۴۱۸۔ [2] صحیح البخاری ۳/ ۱۲۸۲ (۳۲۹۱) الأنبیاء: باب حدیث الغار۔

اس شخص نے دوبارہ زندہ کرنے پراللہ کی قدرت سے انکار کیا تھا لیکن یہ انکار قدرت الٰہیہ کی وسعتوں سے ناواقفیت کی بنا پر ہوا تھا۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اُسے بخش دیا اوراس پر رحم فرمایا،عناد و سرکشی اورتکذیب کی بنا پر نہیں۔

شرک کی قسمیں

شرک کی دوقسمیں ہیں:

① شرک اکبر،اس کی بخشش بغیر توبہ کے نہیں ہوسکتی۔شرک اکبر کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں کسی دوسری ہستی کواس کا شریک اورہم پلہ ٹھہرالے اوراس طرح اس سے محبت رکھے جس طرح اللہ سے رکھنی چاہیے۔

یہی وہ شرک ہے جس میں معبودانِ باطل کومعبودِ حقیقی کے برابر قرار دیا جاتا ہے۔اسی شرک کی وجہ سے مشرکین جہنم میں کہیں گے:

﴿ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍۙ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾

(۲۶/ الشعراء:۹۷۔۹۸)

”اللہ کی قسم بیشک ہم کھلی گمراہی میں تھے۔جبکہ ہم تم کو جہانوں کے رب کے برابر ٹھہراتے تھے۔“

حالانکہ وہ یہ مانتے تھے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی مالک، رازق اورخالق ہے اوران کے معبودانِ باطل روزی دینے،مارنے اور جلانے پرقدرت نہیں رکھتے ہیں۔بس بات صرف اتنی ہے کہ انہوں نے معبودانِ باطل کومحبت،تعظیم اورعبادت میں اللہ کا ہمسر مان لیا تھا۔بلکہ بہت سے توان میں سے ایسے تھے جو اللہ سے بڑھ کران کااحترام وتعظیم کرتے تھے۔اللہ کی توہین پران کواتنا غصہ نہیں آتا تھاجتنا اپنے معبودانِ باطل کی توہین پرچراغ پاہوتے تھے۔[1]

ہلاکت اقوام

﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي

[1] مدارج ۱/ ۳۳۵-۳۳۹۔

السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ۝ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ﴾

(۳۴/ سبا:۲۲۔۲۳)

''اے محمد ﷺ کہہ دیجیے(اے کافرو!)ان کو پکارو جن کو تم اللہ کے سوا(معبود)ٹھہراتے ہو۔آسمان وزمین میں ایک ذرہ بھر کے بھی مالک نہیں ہیں اور نہ ان کے لیے ان دونوں میں کوئی شرکت ہے اور نہ اس کے لیے ان کی طرف سے کوئی مددگار ہے۔اللہ کے ہاں کسی کی شفاعت مفید نہ ہوگی۔سوائے اس کے جسے اللہ کی طرف سے اجازت مل جائے۔''

مشرک کسی ہستی کو اسی لیے معبود مانتا ہے کہ اس سے نفع کی توقع رکھتا ہے۔ نفع کا حصول اسی شخص سے ہوسکتا ہے جس میں ان چار باتوں میں سے کوئی بات پائی جائے:

① عابد جس نفع کا اُمیدوار ہے۔معبود اُسی کا مالک ہو۔

② مالک کے نفع میں حصہ دار اور شریک ہو۔

③ اصل مالک کا مددگار اور معاون ہو۔

④ مالک کے حضور میں اتنا اثر ورسوخ رکھتا ہو کہ سفارش کرسکے۔

قرآن نے یہاں چاروں باتوں کی نفی کردی ہے یہ نفی ترتیب وار اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف منتقل ہوتی آئی ہے۔ملکیت،شرکت،اعانت اور وہ شفاعت جس کا مشرکین عقیدہ رکھتے ہیں سب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور ایسی شفاعت کو پیش کیا جس میں شرک کے لیے کوئی حصہ ہی نہیں ہوسکتا،یعنی اللہ کے حکم سے شفاعت۔ [1]

﴿ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ۝ ﴾

(۱۱/ ہود:۱۱۷)

[1] مدارج ۱/ ۳۴۳۔

’’اور تمہارا رب ظلم کی بنا پر بستیوں کو ہلاک نہیں کرتا، بحالیکہ اس کے باشندے اصلاح پسند ہوں۔‘‘

اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

① ماكان ليهلكهم بظلم منهم۔
’’یعنی ان کے گزشتہ ظلم کی وجہ سے ہلاک نہیں کرتا جبکہ انہوں نے توبہ اور اصلاح کر لی ہو۔‘‘

② ماكان ليهلكها بظلم منه۔
’’اللہ تعالیٰ بستیوں کے ہلاک کرنے میں ظالم نہیں ہے۔‘‘

کیونکہ وہ اصلاح کی حالت میں نہیں، بلکہ ظلم کی حالت ہی میں ہلاک کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کسی ظالم کو ہلاک کرنا یہ عین عدل ہے۔

﴿ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ۝ ﴾

(٦/ الأنعام:١٣١)

’’یہ اس وجہ سے کہ آپ کا رب کسی بستی والوں کو کفر کے سبب ایسی حالت میں ہلاک نہیں کرتا کہ اس بستی کے رہنے والے بے خبر ہوں۔‘‘

اس آیت کے بھی دو مطلب ہیں:

① اللہ تعالیٰ کسی بستی کے باشندوں کو ان کے ظلم وشرک کی بنا پر ہلاک نہیں کرتا، تاوقتیکہ ان کے پاس رسول نہ آجائیں، اور ان کو غفلت سے بیدار وہوشیار نہ کر دیا جائے۔

② رسول کے بھیجنے سے پہلے کسی قوم کو عذاب نہیں دیتا۔ اگر وہ ایسا کرے تو یہ ظلم ہوگا اس کا قانون تو یہ ہے کہ کسی کو بغیر گناہ کے نہیں پکڑتا اور گناہ گار انسان اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ اس کے امر یا نہی کی مخالفت کرے، اور امر ونہی کا علم بغیر رسولوں کے ہو ہی نہیں سکتا۔

اس آیت سے دواصول معلوم ہوتے ہیں:

① بعثت سے قبل بھی مشرکین کا ظلم وشرک قبیح ہے، یعنی رسولوں کے بتانے سے ان دونوں میں قباحت اور برائی نہیں آتی ہے بلکہ شروع سے ہر صحیح عقل کا تقاضا یہی ہے کہ ان دونوں کو حرام قرار دیا جائے۔

② اللہ تعالیٰ رسولوں کے بھیجنے سے پہلے کسی مشرک وظالم کو سزا کا مستحق نہیں ٹھہرائے گا۔

اسی مضمون کو سورۂ قصص میں ادا کیا گیا ہے:

﴿وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾

(۲۸/ القصص:٤٧)

’’اگر یہ بات نہ ہوتی کہ انہیں ان کے اپنے ہاتھوں آگے بھیجے ہوئے اعمال کی وجہ سے کوئی مصیبت پہنچتی تو یہ کہہ اُٹھتے کہ اے ہمارے رب! تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا؟ کہ ہم تیری آیتوں کی تابعداری کرتے اور ایمان والوں میں سے ہو جاتے۔‘‘ [1]

اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ ان پر مصیبت ان کے گزشتہ اعمال کی بنا پر ہی اتری ہے، اگر یہ اعمال فی نفسہٖ برے نہ ہوتے تو نزولِ مصیبت کے لیے سبب نہ بنتے، ہاں صرف اتنا ہوا کہ رسولوں کا نہ آنا نزول مصیبت کے لیے مانع رہا۔ لیکن جب رسول آگئے اور پھر بھی وہ اپنے انکار پر جمے رہے تو ان کو گزشتہ اور موجود، تمام اعمال کی سزا دی گئی اور جڑ سے ہلاک کر دیئے گئے۔

﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ﴾

[1] مدارج ١/ ٢١٨، ٢١٩، ٢٣٢۔

لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۝﴾

(۳۶/ یٰسین:۶۹۔۷۰)

''اور ہم نے اسے شعر نہیں سکھایا اور نہ اس کے لائق ہے،نہیں ہے وہ مگر ذکر اور روشن قرآن،تا کہ ڈرائے اُسے جو زندہ ہے اور کافروں پر قول ثابت ہو جائے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ لوگ دو قسم کے ہیں:

① زندہ،جن کے وجود سے فائدہ پہنچتا ہے۔ایسے انسان نصیحت کو قبول کر لیتے ہیں اور ہر قسم کا نفع حاصل کر لیتے ہیں۔

② مردہ،جو نہ نصیحت کو قبول کرتے ہیں اور نہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ان کے دل کی زمین بنجر ہوتی ہے۔اس میں خیر وصلاح کے قبول کرنے کی استعداد ہی نہیں ہوتی۔ایسے لوگوں پر اللہ کے عذاب کا فیصلہ پورا ہوتا ہے۔لیکن یہ عذاب رسولوں کے ذریعہ حجت قائم کرنے کے بعد نازل ہوتا ہے،تا کہ پھر کسی کو کوئی عذر پیش کرنے کی گنجائش باقی نہ رہے۔

کافر،رسول کی نافرمانی اس لیے کرتا ہے کہ وہ ہدایت کے قابل نہیں ہوتا اور اس پر عذاب اس لیے آتا ہے کہ اس نے نبی کی اطاعت نہیں کی۔اللہ کی یہ بات بھی پوری ہوتی ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔اگرچہ اس کے پاس رسول بھی آجائے،جیسا کہ فرمایا:

﴿كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۝﴾

(۱۰/ یونس:۳۳)

''اور اسی طرح ثابت ہوا تیرے رب کا حکم ان لوگوں پر جو اطاعت نہیں کرتے،کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔''

اور اللہ کا یہ فیصلہ بھی صادق آتا ہے کہ وہ عذاب کے سزاوار ہیں،فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ۝﴾

(٤٠/ المؤمن :٦)

''اور اسی طرح پوری ہو گئی تیرے رب کی بات ان لوگوں پر جنھوں نے کفر کیا کہ وہ آگ والے ہیں۔''

دوسری آیت میں ہے:

﴿وَلَٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكَافِرِينَ﴾ (٣٩/ الزمر:٧١)

''لیکن عذاب کا کلمہ ثابت ہو گیا کافروں پر۔''

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ثابت کلمے دو ہیں:

① کلمة الاضلال، گمراہ ٹھہرانے کا فیصلہ۔

② کلمة العذاب، عذاب کا فیصلہ۔

مسئلہ تقدیر میں اصولی قانون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اس کی مراد اور مرضی کے مطابق کام کریں، اپنی خواہش پر نہ چلیں۔ تو فرمانبرداروں نے اپنی مرضی پر اس کی مرضی کو مقدم رکھا اور انعام کے مستحق ہوئے اور نافرمانوں نے اپنی خواہش کو آگے رکھا اور اللہ کی مرضی کو فراموش کر بیٹھے۔ اللہ نے بھی ان کی اس روش کو پہلے سے جان لیا۔

انبیائے کرام کی تبلیغ سے اللہ تعالیٰ کا یہ اندازہ سب پر ظاہر ہو گیا۔ اب ان کے ظلم پر سزا دینے میں عادل ہو گا، ظالم نہ ہو گا۔ [1]

فسوق

فسق کا بیان قرآن میں دو معنوں میں ہوا ہے:

① مطلق، یعنی علیحدہ طور پر معصیت کے بغیر۔

② معصیت کے ساتھ۔

مطلق فسوق کی دو قسمیں ہیں:

[1] مدارج ١/ ٢١٨، ٢١٩، ٢٣٢۔

① فسوق کفر، جو اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔

② وہ فسوق جو اسلام سے خارج نہیں کرتا۔

معصیت کے ساتھ فسق کا بیان حسب ذیل آیت میں ہے:

﴿ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ ﴾ (٤٩/ الحجرات:٧)

''اور تم کو نفرت وکراہت دلا دی ہے۔کفر، فسق اور نافرمانی سے۔''

فسوق کفر کا بیان حسب ذیل آیات میں ہے:

﴿ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ﴾

(٢/ البقرۃ:٢٦)

''گمراہ کرتا ہے اس کے ساتھ بہتوں کو اور ہدایت دیتا ہے اس کے ساتھ بہتوں کو اور نہیں گمراہ کرتا اس کے ساتھ مگر فاسقوں کو۔''

﴿ وَلَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ ﴾

(٢/ البقرۃ: ٩٩)

''اور بیشک ہم نے اتاری آپ کی طرف روشن آیتیں اور ان کا انکار نہیں کرتے مگر فاسق۔''

﴿ وَأَمَّا الَّذِينَ فَسَقُوا فَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ﴾ (٣٢/ السجدۃ:٢٠)

''اور جن لوگوں نے فسق کیا تو ان کا ٹھکانا آگ ہے۔''

باقی رہا وہ فسق جس کی بنا پر ایک مسلمان اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔اس کا ذکر ذیل کی آیات میں ہے:

﴿ وَإِن تَفْعَلُوا فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ ﴾ (٢/ البقرۃ:٢٨٢)

''اور اگر تم ایسا کرو تو یہ تمہارے ساتھ فسق ہے۔''

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا ﴾

(٤٩/ الحجرات:٦)

''اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو اس کی

تحقیق کرلو۔"

آیت کا شانِ نزول

یہ آیت ولید بن عقبہ بن ابی معیط کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔جبکہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو بنی مصطلق کے پاس صدقہ لینے کے لیے بھیجا تھا۔ولید اوراس قبیلہ کے درمیان پرانی عداوت چلی آ رہی تھی۔ [1]

"ان جاء کم فاسق" سے یہ نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فاسق کی خبر کو بالکل جھٹلانے اوررد کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ تحقیق کا حکم دیا ہے۔اگر خارجی اوربیرونی قرائن اوردلائل سے فاسق کی سچائی ہوگئی تواس پرعمل کیاجائے گا۔اگر بالکل رد کردیا گیا توبہت سے حقوق ومعاملات معطل ہوکررہ جائیں گے۔ [2]

تشریح"اثم و عدوان"

اثم اور عدوان دونوں ہم معنی ہیں۔قرآن میں ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ﴾

(۵/ المائدۃ:۲)

"نیکی اورتقوی پرآپس میں ایک دوسرے کی مدد کرواورگناہ اورزیادتی پرتعاون نہ کرو۔"

اِثم وعدوان میں سے ہرایک کاذکر الگ الگ ہوتوایسی صورت میں ہرایک دوسرے کے معنی کوشامل ہوگا اس لیے ہراثم ، عدوان ہے۔اثم کہتے ہیں کہ جن باتوں سے اللہ نے روکا ہے ان کوکرنااورجن کاموں کاحکم دیاہے انہیں چھوڑ دینا اوراس کو عدوان اس لیے کہتے ہیں اس میں اللہ کے امراورنہی پرزیادتی اوردست درازی ہوتی ہے اور عدوان ، اثم ہے کیونکہ عدوان کی وجہ سے انسان آثم (گناہ گار) بن جاتا ہے۔لیکن جس وقت اثم ، عدوان دونوں یکجا بیان ہوں تواپنے

[1] ابن کثیر ٤/ ٢٠٨۔ [2] مدارج ١/ ٣٥٩-٣٦١۔

اوصاف اور متعلقات کے اعتبار سے ان کے معنی جدا جدا ہوں گے۔اِثم وہ ہے جو اپنی اصل جنس کے لحاظ سے حرام ہو جیسے زنا، جھوٹ، شراب خوری وغیرہ۔ عدوان کا مطلب یہ ہے کہ اصل جنس حرام نہیں ہے بلکہ اس کی خاص معین مقدار اور حد سے زیادتی حرام ہے۔مثلاً کسی سے اپنا حق لینے میں اس کے مال، بدن یا آبرو پر زیادتی کرنا، کسی نے اگر ایک لکڑی چھین لی ہے تو اس کے عوض میں اس کے سارے مکان پر قبضہ جمالینا۔اگر کسی نے تھوڑی سی چیز تلف کردی ہے تو اس کے بدلے میں اس سے کئی گنا زیادہ چیز برباد کردینا ہے۔اگر کسی نے ایک گالی دی ہے تو اس کے جواب میں سینکڑوں گالیاں جھاڑ دینا۔یہ تمام صورتیں عدوان اور تعدّی کی ہیں، ان کا انصاف و عدل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

عدوان دو قسم کا ہوتا ہے:

① اللہ کے حق میں عدوان ② بندے کے حق میں عدوان

پہلی صورت کی مثال: جیسے اللہ تعالیٰ نے بیوی اور لونڈی سے صنفی تعلق قائم رکھنے کو مباح قرار دیا ہے اور ان دونوں کے علاوہ تمام صورتیں حرام ہیں، فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۵۔۷)

''اور جو لوگ اپنی شرمگاہوں کے محافظ ہیں مگر اپنی بیویوں اور لونڈیوں پر تو وہ ملامت کے لائق نہیں ہیں۔پھر جس نے اس کے علاوہ راہ تلاش کی تو یہی لوگ عدوان والے (یعنی حد سے بڑھنے والے) ہیں۔''

اسی طرح بیوی یا لونڈی سے جن اوقات میں صنفی تعلق کی اجازت دی گئی ہے ان کو چھوڑ کر حیض و نفاس یا احرام یا فرض روزے کی حالت میں تعلق قائم کرنا بھی عدوان ہے۔

اسی طرح کسی کے لیے چیز معین مقدار میں مباح تھی۔اس نے اس کی پرواہ نہ کی اور حد سے بڑھ گیا تو یہ بھی عدوان ہے۔

مثلاً (اضطراب کی حالت میں) حلق میں اٹکے ہوئے لقمے کو نگلنے کے لیے شراب کا ایک گھونٹ پی لینا مباح ہے۔لیکن اگر کوئی پورا گلاس ہی ہضم کر جائے، تو اسے عدوان کہا جائے گا۔

یا مثلاً کسی اجنبی عورت یا لونڈی پر نکاح یا خرید وفروخت یا علاج کرنے کی غرض سے ایک نگاہ ڈال لینا شرعاً مباح ہے۔لیکن اس اجازت کو بہانہ بنا کر اگر کوئی شخص حسن وجمال کے میدانوں میں نگاہ کے گھوڑے دوڑائے تو عدوان سے خالی نہ ہوگا۔

اسی طرح مردار کھانا بقدر ضرورت اتنا مباح ہے کہ جان بچ جائے، یہی مسلک امام احمد، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سیر ہو کر کھانا اور ساتھ توشہ لے کر جانا بھی جائز ہے بشرطیکہ اس کی ضرورت محسوس ہو۔لیکن بلا ضرورت اپنے مال کو بچانے کے لیے اس قسم کی حرام خوری عدوان میں شمار ہوگی۔قرآن میں ہے:

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۳)

''پھر جو مضطر (مجبور) ہوا نہ چاہتے ہوئے اور نہ حد سے بڑھتے ہوئے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

قتادہ اور حسن نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

''بلا اضطرار نہ کھائے اور آسودگی سے آگے نہ بڑھے۔''

غَيْرَ بَاغٍ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے:

غیر طالبھا وھو یجد غیرھا۔

''یعنی مردار کو طلب نہ کرتے ہوئے بحالیکہ اس کے علاوہ وہ حلال

چیز پا رہا ہے۔"

وَلَا عَادٍ کے معنی ہیں جو حد مقرر کردی ہے اس سے تجاوز نہ کرے۔ اتنا نہ کھالے کہ پوری طرح شکم سیر ہو جائے، بس سدّ رمق کے لیے کھاسکتا ہے۔

مقاتل نے کہا ہے:

غیر عادٍ أی غیر مستحل ولا متزودٍ منها۔

"یعنی حلال نہ سمجھے اور نہ اس میں سے توشہ لے۔"

اور کہا گیا ہے:

"نہ تو مقررہ حد سے آگے بڑھے اور نہ جان بچانے کے لیے سدّ رمق کھانے میں کوتاہی کرے، دونوں صورتوں میں گناہ گار ہوگا۔"

مسروق کا قول ہے:

"جس شخص کو اضطراری حالت میں مردار اور خون اور سور کھانے پینے کی ضرورت پیش آ گئی۔ پھر بھی اس نے پرہیز کرکے اپنے آپ کو موت کا لقمہ بنادیا وہ جہنم میں جائے گا۔

صحیح تر تفسیر یہی ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما اور امام شافعی کا قول ہے:

غیر باغ أی علی السلطان ولا عادٍ فی سفرہ۔

"یعنی سلطان وقت کے خلاف بغاوت کرنے والا نہ ہو اور نہ اپنے سفر میں حد سے بڑھنے والا ہے۔"

اس تفسیر کے مطابق انہوں نے یہ قاعدہ بنایا ہے کہ سفر معصیت میں شرعی رخصتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا ،لیکن یہ تفسیر درست نہیں ہے۔ سیاق وسباق سے سفر اور امامِ وقت پر خروج کا یہاں کوئی پتہ ہی نہیں چلتا۔ یہ آیت مقیم ومسافر دونوں کے حق میں عام ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے:

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ﴾ (۵/ المائدة:۳)

"جو مجبور ہوا بھوک میں، نہ مائل ہوتے ہوئے گناہ کی طرف۔"

متجانفٍ لِاثم کے معنی ہیں کھانے کی جو مقدار مباح ہے اس سے بڑھ کر حرام کی طرف جھکنے والا۔اسی میلان اورزیادتی کانام عدوان اوراثم ہے۔

اِثم اوربغی کافرق

اثم وعدوان اوربغی تقریباًہم معنی ہیں فرق صرف اتناہے کہ بغی کا استعمال زیادہ تربندوں کے حقوق میں زیادتی اور دست درازی پر ہوتا ہے۔بغی فی نفسہ اپنی جنس کے لحاظ سے حرام ہے، مثلاً جھوٹ،چوری، بہتان،ایذا رسانی میں پہل کرنا۔ عدوان کامفہوم ہے کہ اپنا حق لینے میں حد سے بڑھ جانا۔ انسانی حقوق کے لحاظ سے بغی وعدوان کی وہی حیثیت ہے جوالٰہی حدود میں اِثم وعدوان کی ہے۔یہاں پرچارامور ہیں:

1. اللہ کاحق جس کی کوئی حدمقرر ہو۔
2. حدمقرر نہ ہو۔
3. بندوں کاحق جس کی کوئی حدہو۔
4. حدنہ ہو۔

بغی،عدوان اورظلم کہتے ہیں، ان مقررہ حدود سے تجاوزکرجانا یاان تک پہنچنے میں کوتاہی برتنا۔

فحشاء اورمنکر کی تشریح

فحشاءدراصل ایک موصوف محذوف کی صفت ہے۔اصل میں تھا "الخصلة الفحشاء" فحشاء نام ہے ہراس خصلت کا، جس کی برائی ہرایک کے لیے ظاہر ہوگئی ہو اورجسے ہرصاحب عقل سلیم براسمجھتا ہو۔اس لیے اس کی تفسیر زنا اورلواطت سے کی جاتی ہے اوراللہ تعالٰی نے بھی ان کو "فاحشة"کے نام سے بیان کیا ہے۔ کیونکہ ان کی برائی انتہا کوپہنچی ہوئی ہے۔اسی طرح برے اقوال، گالی

اور بہتان کو فحش کہتے ہیں ان کی برائی سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

المنکر، یہ بھی موصوف محذوف کی صفت ہے یعنی الفعل المنکر، منکروہ ہے جس کے قبول کرنے سے عقل وفطرت انکار کردے۔جس طرح کہ قوت شامہ(سونگھنے کی قوت)قوتِ ذائقہ،قوتِ سامعہ اورقوتِ باصرہ(دیکھنے کی قوت)،بدبو دارہوا،کریہہ منظر،کڑوے کھانے اور بے تکی آواز سے نفرت رکھتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس چیز کے قبول کرنے سے عقل وفطرت انکار کردے وہ فاحشہ ہے۔جیسا کہ حواس ظاہری ناموافق مددگار کے قبول کرنے سے انکار کردیتے ہیں۔اسی طرح منکروہ ہے جس سے اجنبیت اوروحشت ہو۔اسی لیے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہاہے:

”فحشاء زناہے اورمنکروہ ہے جس کا شریعت اورسنت میں کوئی ثبوت نہ ہو۔“

اب ہمیں غور کرنا پڑے گا کہ کون سی چیزیں ہیں۔جن کی خوبی معروف ومشہور نہیں ہے اور کون سی چیزیں ہیں جن کی برائی عقل وفطرت میں جاگزیں ہوچکی ہے۔

تفسیر ﴿وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (۲/البقرۃ:۱۶۹)

”اور یہ کہ تم کہواللہ پر جوتم نہیں جانتے۔“

جو اللہ نے نہیں فرمایاوہ اس کی طرف منسوب کرنا یہ بہت ہی بڑا جرم ہے؛ اس کی حرمت نہایت شدید ہے۔ اسی لیے قرآن میں اس کو چوتھے نمبر پررکھ کراُن محرمات میں سے شمار کیا ہے جن کی حرمت پرتمام شریعتوں اورادیان کا اتفاق ہے۔ یہ فعل کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہوسکتا اس کوتوصرف حرام ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

محرمات کی دو قسمیں:

① حرام ذاتی، وہ حرام کی ہوئی شے جو کسی حال میں بھی حلال نہیں ہوسکتی۔

② حرام عارضی؛ جس کی حرمت کسی وقت میں ہو اور کسی وقت نہ ہو۔

محرم ذاتی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ﴾

(۷/ الاعراف: ۳۳)

''کہہ دیجیے میرے رب نے فواحش (بے حیائی کے کاموں) کو حرام کردیا ہے۔خواہ وہ چھپے ہوں یا کھلے۔''

اس کے بعد ایسی محرم (حرام کی ہوئی) چیز کو بتلایا جو فواحش سے بھی زیادہ خطرناک ہے، یعنی:

﴿ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ﴾ ''گناہ اور ظلم ناحق طور پر۔''

پھر اس سے بھی زیادہ محرّم شدید کا تذکرہ کیا:

﴿ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ﴾ (۷/ الاعراف: ۳۳)

''اور یہ کہ تم شریک ٹھہراؤ اللہ کے ساتھ ایسی چیز کو جس پر اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری ہے۔''

اس کے بعد اس سے بھی بڑھ کر حرام کام کو بیان فرمایا ہے:

﴿ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (۷/ الأعراف:۳۳)

''اور یہ کہ تم اللہ تعالیٰ پر ایسی بات کہو جو تم نہیں جانتے۔''

محرمات میں اس کا درجہ سب سے بڑھا ہوا ہے اس کا گناہ بھی سب سے زیادہ ہے۔ یہ ایک گناہ نہیں بلکہ چند گناہوں کا مجموعہ ہے۔

① اللہ پر جھوٹ باندھنا اور اس کی طرف ایسی بات منسوب کرنا جو اسے زیب نہیں دیتی۔

② اس کے دین کو بدل ڈالنا۔

③ جو اس نے ثابت کیا ہے اس کی نفی، اور جس کی نفی کی ہے اس کا اثبات۔

④ باطل کو حق اور حق کو باطل قرار دینا۔

⑤ اس کے دوستوں سے دشمنی اور دشمنوں سے دوستی۔

⑥ جو اس کو ناپسند ہے، اس سے محبت اور جو اسے محبوب ہے اس سے نفرت۔

⑦ اس کے اقوال، افعال، صفات اور ذات کے بارے میں ایسی باتیں کہنا جو اس کی شان سے فروتر ہیں۔

اس سے بڑھ کر اور کون سی چیز حرام ہوسکتی ہے، یہ کفر و شرک کی اصل جڑ ہے۔ تمام گمراہیوں اور بدعتوں کی بنیاد ہی اسی پر رکھی جاتی ہے۔ ہر گمراہ کن عبادت کا سرچشمہ بھی قول علی اللہ بلا علم ہے۔ اسی لیے سلف نے اس سے نہایت شدت اور سختی سے روکا ہے۔ اور اسی لیے بلا برہان و دلیل کے کسی چیز کو حلال و حرام ٹھہرانے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے:

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ﴾ (١٦/ النحل: ١١٦)

”جن چیزوں کو تمھاری زبانیں جھوٹ موٹ بیان کرتی ہیں ان کو مت کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے، تاکہ تم اللہ پر جھوٹ باندھو۔“

شرک و کفر قول بلا علم کی ایک شاخ ہے۔ ہر مشرک و کافر قول بلا علم کا مرتکب ہوگا۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر قائل بلا علم (اللہ پر بلا علم بولنے والا) مشرک اور کافر بھی ہو۔ کیونکہ بعض مرتبہ قول بلا علم بدعت اور تعطیلِ (انکار) صفات تک محدود رہتا ہے۔ گویا شرک و کفر قول بلا علم کا ایک فرد ہے۔ [1]

---

[1] مدارج ١/ ٣٦٨-٣٧٣۔

رسول اللہ ﷺ پر اعتراضات

﴿ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ﴾ (٦/ الأنعام: ٨)

''یعنی کیوں نہیں نبی پر فرشتہ اترتا۔''

جس کو دیکھ کر ایمان لائیں۔

کفار کا مطالبہ صرف یہ نہ تھا کہ مَلَكٌ (فرشتہ) نازل ہو بلکہ یہ تھا کہ ایسا فرشتہ جس کو اپنی نگاہوں سے دیکھ سکیں، ورنہ حکم الٰہی لے کر فرشتہ تو آتا ہی رہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا:

﴿ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ﴾ (٦/ الأنعام:٨)

''ہم ان کے مطالبہ کے مطابق فرشتہ رسول بنا کر اس لیے نہیں بھیجتے کہ اس مطالبہ کے پورا ہونے کے بعد پھر ان کو مہلت نہیں مل سکتی۔''

اس آیت کی نظیر سورۂ حجر میں ملتی ہے:

﴿ وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ (١٥/ الحجر:٦۔٧)

''کہا انہوں نے اے وہ شخص جس پر ذکر اتارا گیا ہے تو مجنون ہے کیوں نہیں لاتا ہمارے پاس فرشتوں کو اگر سچا ہے۔''

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ﴾

(١٥/ الحجر:٨)

''ہم نہیں اتارتے فرشتوں کو مگر حق کے ساتھ اور تب ہم مہلت دینے والے نہیں ہیں۔''

یہاں حق سے مراد عذاب ہے۔

﴿ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا ﴾ (٦/ الأنعام: ٩)

''یعنی اگر ہم ان پر فرشتہ بھی اتارتے تو وہ بھی آدمی کی صورت میں آتا۔''

کیونکہ فرشتہ کی اصل شکل میں ان کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا ممکن ہی نہیں ہے۔اس صورت میں پھر ان پر اشتباہ پڑ جاتا کہ یہ آنے والا رسول فرشتہ ہے یا انسان۔

﴿ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝ ﴾ (٦/ الأنعام:٩)

''ہم ان پر مشتبہ (خلط ملط) کر دیتے ہیں جو وہ مشتبہ کر رہے ہیں۔''

"مایلبسون"

اس کے دو مطلب ہیں:

① انہوں نے اپنے ضعفا (کمزوروں) پر معاملہ مشتبہ بنا ڈالا ہے اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے۔ اس لیے اس کی سزا میں ہم فرشتے کو آدمی کی شکل میں بھیج کر اصل حقیقت ان پر مشتبہ کر دیں گے۔

② رسولوں کا انکار کر کے انہوں نے اپنے اوپر حق کو مشتبہ کر ڈالا ہے اور حق کو پہچاننے کے باوجود ایسے فرشتہ رسول کا طلب کر رہے ہیں جو ان کو نظر آ سکے۔اس سے بڑھ کر اپنی جان پر تلبیس واشتباہ اور کیا ہوگا؟ اگر ہم ان کا مطالبہ مان بھی لیں تب بھی وہ ایمان نہ لائیں گے اور ہم ان کو شبہ میں ڈال دیں گے۔جس طرح انہوں نے اپنے آپ کو شبہ میں گرفتار کیا ہے۔[1]

﴿ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَھُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَھُمْ

[1] مدارج ١/ ٢٤٥، ٢٤٦۔

عَذَابًا اَلِيْمًا﴿۱۸﴾ (٤/ النساء:١٧۔١٨)

''بس توبہ اللہ پر انہی لوگوں کے لیے ہے جو جہالت ونادانی سے برے کام کرتے ہیں۔پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔پس یہی لوگ ہیں جن پر اللہ متوجہ ہوگا۔اور اللہ علم والا حکمت والا ہے۔توبہ ان کے لیے نہیں ہے جو برائیاں کرتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی ایک کو موت آتی ہے تو کہتا ہے میں نے اب توبہ کر لی اور نہ وہ لوگ جو کفر کی حالت میں مر جاتے ہیں۔یہی لوگ ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے دردناک عذاب تیار کیا ہے۔''

یہاں جہالت سے عمل کی جہالت مراد ہے خواہ گناہ کرنے والا اصل جرم کی حرمت سے واقف ہو۔قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس پر اتفاق ہے کہ جو بھی قصداً یا بلا قصد اللہ کی نافرمانی کرتا ہے وہ جاہل ہے۔''

''یتوبون من قریب'' کی تفسیر میں چند اقوال ہیں:

① توبہ معائنہ سے پہلے،یعنی موت کے آثار اور علامات دیکھنے سے پہلے توبہ کر لی جائے، جمہور مفسرین اسی طرف گئے ہیں۔

② موت سے قبل،یہ عکرمہ کا قول ہے۔

③ ملک الموت کے مشاہدہ سے پہلے، یہ ضحاک کا خیال ہے۔

④ مرض الموت سے پہلے صحت کی حالت میں توبہ کی جائے، یہ سدی اور کلبی کی تفسیر ہے۔

مسند احمد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول کرتا ہے جب تک کہ غرغرہ (جان کنی) کی حالت پیدا نہ ہو۔''[1]

[1] سنن الترمذی ٥/ ٥٤٧(٣٥٣٧) الدعوات: باب فضل التوبة والاستغفار؛مسند احمد ٢/ ١٣٢

علامات موت (جانکنی وغیرہ) دیکھ کر توبہ کرنا، اضطراری توبہ ہے اختیاری نہیں۔ جیسا کہ سورج کے مغرب سے نکلنے یا اللہ کے عذاب کو دیکھ لینے کے بعد توبہ کرنا، اس قسم کی توبہ اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہے۔ کیونکہ توبہ کے معنی ہیں کہ اپنے آپ کو ایسے کام سے باز رکھنا جو شریعت میں ناجائز ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ باز رکھنا اسی فعل سے ہوسکتا ہے جس پر بندہ قدرت رکھتا ہو، جس کام پر قدرت ہی نہیں ہے اس سے باز رہنے کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔ [1]

سورۃ الفرقان کی ایک آیت

﴿ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ (۲۵/ الفرقان: ۷۰)

''مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک اعمال کیے پس یہی لوگ ہیں کہ اللہ ان کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل ڈالے گا کیے اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔''

اس آیت میں تائبین کے لیے بہت بڑی بشارت ہے جبکہ توبہ کے ساتھ ساتھ ایمان اور عمل صالح بھی ہو، توبہ کی حقیقت بھی یہی ہے۔ ہاں برائیوں کو نیکیوں سے بدل ڈالنے میں اختلاف ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے:

برائیوں کی جگہ نیکیوں سے رغبت ہو جاتی ہے۔ شرک کی بجائے ایمان، زنا کے بدلے عفت و پاکدامنی، جھوٹ اور خیانت کی جگہ سچائی اور امانت نشوونما پانے لگتی ہے۔ گندی عادتوں اور برے کاموں کے بدلہ میں پاکیزہ صفات اور نیک اعمال سے انسان آراستہ ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ مریض مرض کی جگہ تندرستی اور مصیبت زدہ آفت کے عوض راحت وعافیت پاتا ہے۔

سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے:

---

[1] مدارج ۱/ ۲۸۳-۲۸۵۔

''یہ تبدیلی قیامت کے دن ہوگی۔اللہ تعالیٰ ہر گناہ کے بدلے ایک نیکی کا ثواب عطا فرمائے گا۔'' [1]

اس قول پر ترمذی کی ایک روایت بھی شاہد ہے جس کا تقریباً یہی مفہوم ہے۔ [2]

"یبدل الله سیاتھم حسنات" میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ تائب کے حال کے مطابق اللہ تعالیٰ ایک گناہ کی جگہ کئی نیکیاں دے سکتا ہے اسی لیے یہ نہیں فرمایا، ایک برائی کی جگہ ایک نیکی۔ [3]

تقویٰ

یہ لفظ اگر کسی ایسے فعل کے ساتھ بولا جائے، جس کا حکم دیا گیا ہے تو اس کے معنی ہوں گے: ''حرام کام سے بچنا۔'' اور اگر تنہا اس کا استعمال ہو تو پھر اس کے مفہوم میں ''احکامِ الٰہی کا بجالانا'' اور ''ممنوعات سے پرہیز'' دونوں مراد ہوں گے۔ توبہ کی حقیقت بھی یہی ہے۔ [4]

استغفار کا استعمال

قرآن میں استغفار کا ذکر دو طرح آیا ہے:

① توبہ کے ساتھ ② توبہ کے بغیر

دوسری صورت کی مثال کئی آیات میں ملتی ہے۔نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا:

﴿ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ﴾ (۷۱/ نوح: ۱۰)

''بخشش چاہو اپنے رب سے بیشک وہ بخشنے والا ہے۔''

استغفار جب مفرد (تنہا) ذکر کیا جائے تو اس میں طلب مغفرت کے ساتھ

[1] تفسیر الطبری ، سورۃ الفرقان: آیت ۷۰۔

[2] سنن الترمذی ٤/ ۷۱۳ (۲۵۹٦) صفة جهنم: باب منه۔

[3] مدارج ۱/ ۳۰۱، ۳۰۲۔ [4] مدارج ۱/ ۳۰۵۔

توبہ کا مفہوم بھی شامل ہوتا ہے۔مغفرت کے معنی ہیں،گناہ اوراس کے اثر کو مٹانا اوراس کے شر سے بچانا۔ اس کے معنی پردہ پوشی کے لینا درست نہیں ہیں کیونکہ پردہ پوشی اس پر بھی ہوتی ہے جس کی مغفرت اورمعافی ہوچکی ہے اوراس کی بھی ہوتی ہے جس کے ساتھ ایسا نہیں ہواہے،ہاں یہ کہاجاسکتاہے کہ مغفرت کو پردہ پوشی لازم ہے اس کے حقیقی معنی گناہ کے شر سے بچانے کے ہیں۔اسی لیے عربی میں خَود کومغفر کہاجاتاہے۔کیونکہ وہ سرکودشمن کے حملہ سے بچاتاہے عمامہ کومغفر نہیں کہاجاتا۔اس میں ڈھانپنے کے معنی پائے جاتے ہیں،بچانے کے نہیں۔یہی استغفار اللہ کے عذاب سے بچاسکتاہے۔گناہ پراصرارکے باوجود مغفرت طلب کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا اس سے عذاب نہیں رک سکتا۔

جب استغفار اورتوبہ الگ الگ بولے جائیں گے توہرایک دوسرے کے معنی کوشامل ہوگا۔لیکن جب دونوں یکجا بیان ہوں گے توہرایک کے معنی جداجدامراد ہوں گے:

استغفار،جوگناہ پہلے ہوچکاہے اس کے شر سے بچاؤطلب کرنا۔

توبہ،آیندہ جن گناہوں کاخطرہ ہے ان سے محفوظ رہنے کی دعا کرنا۔

یہاں دوگناہ ہیں:گذشتہ گناہ اورآیندہ کاگناہ۔[1]

توبۃ النصوح کی حقیقت

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا عَسَى رَبُّكُمْ أَنْ يُكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ﴾

(٦٦/ التحریم:٨)

”اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کے حضور میں خالص توبہ قریب ہے کہ تمہارارب تم سے تمہارے گناہوں کومٹادے۔اورتم کوباغات میں

[1] مدارج ١/ ٣٠٧، ٣٠٨۔

داخل کر لے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔‘‘

نصوح کے معنی

نصوح فعول کے وزن پر ہے، اصل میں یہ ناصح بروزن فاعل تھا۔مبالغہ کے لیے اس وزن پرلایا گیا ہے جیسے شکور، صبور۔اس کا اصل مادہ ن، ص، ح، ہے۔ اس کے معنی ہیں، کھوٹ اور ملاوٹوں سے کسی چیز کا خالی ہونا۔توبہ، عبادت اورمشورہ میں نصح کا مطلب ہے،ان کا ہر قسم کے کھوٹ،نقص اورفساد سے پاک ہونا اوران اعمال کومکمل صورت میں ادا کرنا۔توبہ نصوح کی تفسیر میں سلف کے کئی اقوال ہیں:

① عمر بن خطاب اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کا قول ہے:

’’توبہ نصوح یہ ہے کہ انسان گناہ سے اس طرح تائب ہوکہ پھراُس کی طرف نہ پلٹے جیساکہ دودھ تھن میں سے نکل کر پھر اس میں واپس نہیں جاسکتا۔‘‘

② حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

’’گذشتہ گناہ پرندامت اوردوبارہ گناہ نہ کرنے کا عزم توبہ نصوح ہے۔‘‘

③ کلبی نے کہا ہے:

’’زبان سے استغفار،دل میں ندامت،اعضا کے گناہ سے پرہیز۔‘‘

④ محمد بن کعب قرظی نے لکھا ہے کہ توبہ نصوح چار باتوں پر مشتمل ہوتی ہے:

1. زبان سے استغفار۔
2. جسم واعضا کوگناہ سے بازرکھنا۔
3. دل میں دوبارہ گناہ نہ کرنے کا پختہ عزم کرلینا۔
4. بداخلاق دوستوں اورساتھیوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا۔ [1]

---

[1] مدارج ۱/ ۳۰۹-۳۱۲۔

مغفرت ذنوب اور تکفیرِ سیئات میں فرق

مغفرت ذنوب (گناہوں کی بخشش) تکفیرِ سیئات (گناہوں کو مٹانا) ان دونوں کا ذکر قرآن میں یکجا بھی آیا ہے اور الگ الگ بھی۔

پہلی صورت کی مثال:

﴿ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا ﴾ (۳/ آل عمران:۱۹۳)

''اے رب بخش دے ہمارے لیے ہمارے گناہ اور مٹا دے ہم سے ہماری خطائیں۔''

دوسری صورت کی مثال:

① ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ۝ ﴾

(۴۷/ محمد:۲)

''اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور ایمان لائے اس پر جو محمد ﷺ پر نازل کیا گیا۔ وہ حق ہے ان کے رب کی جانب سے اور ان کی خطائیں مٹادیں اور ان کا حال درست کر دیا۔''

اس آیت میں صرف تکفیر سیئات کا بیان ہے۔

② ﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا ﴾ (۳/ آل عمران:۱۴۷)

''اے ہمارے رب! بخش دے ہمارے لیے ہمارے گناہ اور اپنے کاموں میں حد سے بڑھ جانے کو۔''

ان آیات میں چار چیزیں بیان ہوئی ہیں، ان میں سے ہر ایک کی مختصر تشریح سن لینی ضروری ہے:

① ذنوب، اس سے مراد کبیرہ گناہ ہیں۔

② سیئات سے مراد صغیرہ (چھوٹے) گناہ ہیں، ان کے داغ دھبوں کو کفارے کے ذریعہ مٹایا جا سکتا ہے۔ اسی لیے یہ کفارات کبائر پر اثر انداز نہیں ہوتے، صحیح

تر قول یہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ قتل عمد (جان بوجھ کر قصداً کسی بے گناہ کو مارنا) میں کوئی کفارہ مفید نہیں ہوسکتا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ظاہر مذہب کی بنا پر یمین غموس پر کفارہ اثرانداز نہیں ہوسکتا۔سیئات کا صغائر اوران کے لیے کفارہ کا مخصوص ہونا،اس پر ذیل کی آیت شاہد ہے:

﴿إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُدْخَلًا كَرِيمًا﴾ (٤/ النساء:٣١)

''اگرتم اُن کبائر سے بچ جاؤ گے جن سے تم کوروکا جاتا ہے۔تو ہم تمہاری خطاؤں کومٹا ڈالیں گے اورتم کو اچھے خوشگوار مقام میں داخل کردیں گے۔''

اسی طرح صحیح مسلم کی روایت ہے:

((الصلوٰت الخمس والجمعة الی الجمعة ورمضان الی رمضان مکفرات لمابینهن اذااجتنبت الکبائر)) [1]

''پانچوں نمازیں،جمعہ،جمعہ تک اوررمضان،رمضان تک،ان کے مابین گناہوں کے لیے کفارہ ہیں جبکہ کبائر سے پرہیز کیا جائے۔''

③ مغفرت،تکفیر سے زیادہ وسیع ہے اس لیے مغفرت کا کبائر کے ساتھ اور تکفیر کا صغائر کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

④ لفظ مغفرت حفاظت اور بچاؤ کے معنی کو شامل ہے اورلفظ تکفیر پردہ پوشی اور مٹانے کے مفہوم کواپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

گناہ گاروں کے لیے دنیا میں تین بڑی نہریں ہیں جن کے ذریعہ سے وہ گناہوں سے پاکی حاصل کرتے ہیں۔ اگر ان کے ذریعہ پوری طرح پاکی حاصل نہ ہوسکی تو پھر جہنم میں ڈال کر ان کو گناہوں کے میل کچیل سے پاک کیا جائے گا۔ [2]

[1] صحیح مسلم ١/ ٢٠٩(٢٣٣) الطهارة: باب الصلوات الخمس و رمضان الی رمضان مکفرات...... [2] مدارج ١/ ٣٠٩-٣١٢۔

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾

(۳۹/ الزمر:۵۳)

"(اے محمد ﷺ) آپ کہہ دیجیے اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ بیشک اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو بخشتا ہے، بیشک وہ بخشنے والا مہربان ہے۔"

یہ آیت توبہ کرنے والے کے حق میں ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ﴾

(٤/ النساء:٤٨)

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے علاوہ جن گناہوں کو چاہے بخش دے۔"

یہ آیت غیر تائب (توبہ نہ کرنے والے) کے حق میں ہے۔ [1]

حاشیہ از رشید رضا

تکفیر اور عفو کا استعمال سیئات میں اور مغفرت کا ذنوب میں اسی طرح ہے، جیسا کہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔

لیکن یہ درست نہیں ہے کہ ذنوب کو کبائر اور سیئات کو صغائر کے ساتھ خاص کیا جائے۔ اسی طرح تکفیر صغائر کے لیے اور مغفرت کبائر کے لیے قرار دینا بھی محل نظر ہے۔ لفظ ذنب مشتق ہے ذنب الدابة (جانور کی دم) سے، ذنب کہتے ہیں ہر اس کام کو جس کا نتیجہ کرنے والے کی مصلحت، فائدہ اور غرض کے برعکس ظاہر ہو۔ بعض اوقات ایسا کسی نافرمانی اور گناہ کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ اجتہاد وفکر کی غلطی سے بھی کسی امر کا انجام اصل مقصد کے خلاف نکلتا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ کی طرف ذنب کی نسبت تو ہوئی ہے لیکن سیئہ کی نہیں ہوئی۔ اس اجتہادی غلطی کی

[1] مدارج ۱/ ۳۱۱، ۳۱۲۔

مثال غزوہ تبوک کے واقعہ میں ملتی ہے۔جبکہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ تبوک سے پہلوتہی اختیار کرنے والوں کو پیچھے رہنے کی اجازت دے دی تھی۔

قوم لوط کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَمِن قَبْلُ كَانُوا يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ ﴾ (۱۱/ ھود:۷۸)

''اوراس سے پہلے وہ سیئات کرتے تھے۔''

یہاں سیئات سے مراد کبائر ہیں:

﴿ الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّمَمَ إِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ﴾ (۵۳/ النجم:۳۲)

یہاں مغفرت کا استعمال لمم صغائر میں ہوا ہے۔سیئہ مشتق ہے سوء سے۔

وھی ما یسوء فاعلہ فی دنیاہ وآخرتہ۔

''سیئہ وہ ہے جس کا فاعل دنیا و آخرت میں رنج وغم کا شکار ہو جائے۔''

مغفرت اور تکفیر کا فرق: مغفرت کبھی محض اللہ کے فضل سے بھی ہوجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رحم وکرم سے شرک کے علاوہ بہت سے گناہ بخش دے گا اور تکفیر کفارہ کے اثر کا نام ہے۔کفارہ بندے کی طرف سے ایک ایسا عمل ہے کہ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سب یا کچھ گناہ مٹا دیتا ہے۔فرمایا:

﴿ وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ ﴾ (۶۵/ الطلاق:۵)

''جو اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اختیار کرتا ہے، اللہ اس کے گناہ مٹادیتا ہے۔''

یہی حال کفارہ یمین (قسم) کفارہ صیدِ حرم (حرم کے شکار) کفارہ ظہار اور قتل خطا کا ہے۔تکفیر خاص کا مدار اللہ تعالیٰ نے عمل خاص (کفارات وغیرہ) پر رکھا اور تکفیر عام یا مطلق کا ظہور ایمان، عمل صالح اور تقویٰ کی بنا پر ہوتا ہے۔ [1]

---

[1] مدارج ۱/ ۳۱۱، ۳۱۲۔

متعلقات توبہ

توبہ

بندے کی توبہ اللہ تعالیٰ کی دو توبہ (توجہ) کے درمیان گھری ہوئی ہے، ایک توبہ پہلے اور ایک بعد میں۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ پہلے بندے پر اذن (حکم) توفیق، الہام کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے۔ جس کی بنا پر بندہ اللہ کی طرف تائب اور متوجہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر توبہ اور توجہ حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی جانب سے دوبارہ مقبولیت وثواب کے ساتھ توبہ اور توجہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۙ﴾ (۹/ التوبة:۱۱۷)

''بیشک اللہ تعالیٰ نبی اور اُن مہاجرین وانصار پر متوجہ ہوا۔ جنھوں نے نہایت کٹھن وقت میں نبی ﷺ کی پیروی کی۔ اس کے بعد کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل کج ہونے لگے۔ پھر متوجہ ہوا ان پر، بیشک وہ ان پر شفیق مہربان ہے۔''

﴿وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۧ﴾

(۹/ التوبة:۱۱۸)

''(اللہ تعالیٰ متوجہ ہوا) ان تینوں پر جو (توبہ کی قبولیت سے) پیچھے رکھے گئے تھے۔ یہاں تک کہ سرزمین باوجود کشادہ ہونے کے، ان پر تنگ ہوگئی۔ انہوں نے گمان کیا کہ اللہ (کے عذاب) سے پناہ صرف اسی کی طرف (پناہ لینے سے) مل سکتی ہے پھر متوجہ ہوا ان پر،

تاکہ وہ توبہ کریں۔بیشک وہ توبہ قبول کرنے والامہربان ہے۔"

ان آیات سے معلوم ہواکہ اللہ تعالیٰ کی ان پرتوبہ(توجہ)بندوں کی توبہ سے پہلے ہے، اوراسی توبہ الٰہی نے ان کوتوبہ اورندامت کی توفیق بخشی ہے۔اس سے واضح ہواکہ جب تک اللہ تعالیٰ ان کی طرف متوجہ نہیں ہواوہ بھی توبہ پرآمادہ نہ ہوئے۔ یہی معاملہ ہدایت کابھی ہے۔بندہ اللہ کی ہدایت سے سیدھی راہ (ہدایت) پاتا ہے۔اس پرثواب وانعام کے لیے اللہ کی طرف سے دوسری ہدایت کاظہور ہوتا ہے۔جس طرح کہ ضلالت (گمراہی) کی سزا میں بندہ مزید ضلالت میں مبتلاکردیاجاتاہے۔فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى ﴾ (٤٧/ محمد:١٧)

"جن لوگوں نے ہدایت پائی۔اللہ تعالیٰ ان کوہدایت میں اورزیادہ بڑھاتاہے۔"

اہل زیغ (گمراہوں) کامعاملہ اس کے برعکس ہے۔

﴿ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ۭ ﴾ (٦١/ الصف:٥)

"پھرجب وہ ٹیڑھے ہوئے تو اللہ نے ان کے دلوں کوٹیڑھا کردیا۔"

یہ دوسری بار زاغ (ٹیڑھاکرنا) پہلی بارکج روی اورٹیڑھے پن کی سزا ہے۔اس سے اللہ تعالیٰ کے نام الاول اورالآخر کارازبھی معلوم ہوجاتاہے۔ وہی معدّ(اسباب بنانے والا)اوروہی ممد(اسباب کوبڑھانے اورتقویت دینے والا ہے)سبب اورمسبب سب اسی کی طرف سے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ الٰہی توبہ دوقسم کی ہے:

① اذن وتوفیق ② قبولیت اوراسباب کی فراہمی

﴿ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ۝ ﴾

(٢٥/ الفرقان:٧١)

''اور جس نے توبہ کی اور نیک اعمال کیے۔وہ اللہ کی طرف یقینی طور پر لوٹے گا۔''

اس آیت کی تفسیر میں بغوی نے لکھا ہے:

"یعود الیه بعد الموت، متابا، حسنا یفضل به علی غیره۔" [1]

''یعنی موت کے بعد اللہ کی طرف اس کی ایسی اچھی واپسی ہوگی کہ دوسروں پر فوقیت لے جائے گا۔''

"تاب"سے مراد ،شرک سے باز رہنا ہے اور "یتوب"سے مقصود اللہ تعالیٰ کی طرف بدلہ اور ثواب لینے کے لیے پلٹنا ہے۔

تفسیر دوم: جس نے توبہ کا پختہ ارادہ کرلیا ہے اسے چاہیے کہ اپنی توبہ کا رخ خالص طور پر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رکھے۔اس میں کسی دوسرے کی ذرا سی بھی ملاوٹ نہ ہو۔

تفسیر سوم: یہاں "فانه یتوب"سے اس کے لازمی معنی مراد ہیں یعنی اُسے جاننا چاہیے کہ اس کی توبہ اور توجہ کس طرف ہے۔بس وہ اللہ تعالی ہی کی طرف ہونی چاہیے،اس کے سوا اور کسی کی طرف نہیں۔اس قسم کی تفسیر ذیل کی آیت کی ہوسکتی ہے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلرَّسُولُ بَلِّغْ مَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُۥ ۚ﴾ (٥/ المائدة:٦٧)

''اے رسول! پہنچا دو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے اور اگر تم نے نہ کیا تو پھر تم نے پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔''

"ان لم تفعل"کے معنی یہ ہوئے کہ جو حکموں کو نہیں مانتا اور اس کے پیغام کو نہیں پہنچاتا اس کا انجام کیا ہوتا ہے،اس کو اچھی طرح معلوم کرلو۔

تفسیر چہارم: پہلے توبہ کا ارادہ اور مقصد ہوتا ہے، پھر جب ارادہ پختہ ہوجاتا ہے تو توبہ کا ظہور ہوتا ہے۔"من تاب"سے مراد ارادہ توبہ اور "فانه یتوب"سے مقصود

[1] تفسیر بغوی ٣/ ٣٧٨۔

فعل توبہ ہے۔ اس کی نظیر یہ حدیث ہے:

((فمن كانت هجرته الى الله ورسوله فهجرته الى الله ورسوله ومن كانت هجرته الى الدنيا يصيبها او امرأة يتزوجها فهجرته الى ماهاجر اليه)) [1]

”جس نے ہجرت کی اللہ اور رسول کی طرف تو واقعی اس کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف ہے اور جس نے ہجرت کی دنیا کمانے کے لیے یا کسی عورت سے شادی رچانے کے لیے تو اس کی ہجرت اس چیز کی طرف مانی جائے گی جس کا اس نے قصد کیا ہے۔“ [2]

کبائر

گناہ کبیرہ کی تعریف

علی بن ابی طلحہ کہتے ہیں کہ جس گناہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے نار، غضب، لعنت اورعذاب کی دھمکی دی ہے وہ کبیرہ ہے۔

ضحاک کہتے ہیں کہ جس گناہ پردنیا میں حد اورآخرت میں عذاب کی دھمکی دی ہے وہ کبیرہ ہے۔

حسین بن الفضل نے کہاہے کہ جس گناہ کوقرآن نے کبیر یاعظیم کہاہے وہ کبیرہ ہے۔مثلاً:

﴿اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا﴾ (٤/ النساء:٢)

﴿اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا﴾ (١٧/ الاسراء: ٣١)

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ وہ مظالم جن کاتعلق بندے اوررب سے ہے وہ صغائر ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کریم ہے معاف کردے گااور بندوں کے آپس کے مظالم کبائر میں داخل ہیں۔ [3]

[1] صحيح البخارى ١/ ٣٠(٥٤) الإيمان: باب ماجاء ان الاعمال بالنية والحسبة صحيح مسلم ٣/ ١٥١٥(١٩٠٧) الإمارة: باب قوله ﷺ((انما الأعمال بالنية)) [2] مدارج ١/ ٣١٢-٣١٥۔ [3] مدارج ١/ ٣٢١، ٣٢٢۔

﴿ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ﴾ (۵۳/ النجم:۳۲)

''اور جو لوگ بچتے ہیں بڑے گناہوں اور فواحش سے مگر لمم سے۔''

امام بغوی وغیرہ کا خیال ہے کہ لمم سے مراد بھی کبیرہ گناہ ہیں۔مگر''لمم'' کہنے کا منشا یہ ہے کہ کبیرہ گناہ کرے اور پھر تائب ہوجائے،معصیت میں مبتلا ہوااور پھر باز آجائے۔گناہ کو بطور عادت کے اختیار نہ کرے۔اس تفسیر کی بنا پر لمم کا استثنا ''یجتنبون'' سے ہوگا،یعنی کبائر کا ان سے صدور نہیں ہوتا مگر کبھی کبھار اتفاقیہ طور پر۔

جمہور کے نزدیک یہاں لمم سے مراد صغائر(چھوٹے گناہ) ہیں۔یعنی صالحین سے چھوٹی موٹی لغزشیں ہوجاتی ہیں لیکن کبائر کی آلائشوں سے وہ اپنا دامن بچا کر چلتے ہیں۔یہی لوگ محسنین ہیں جن کو اللہ کے عذاب سے نجات ملے گی۔یہاں الا(مگر) کے ذریعہ لمم کو مستثنیٰ (الگ) کرلینا عجب حسن پیدا کررہا ہے۔اس کو عربی گرامر میں استثنا منقطع کہا جاتا ہے،اس کا قاعدہ یہ ہے کہ مستثنیٰ (اِلَّا کے بعد والی چیز) مستثنیٰ منہ الَّا سے قبل والی چیز کی جنس میں داخل ہو،اگرچہ اس کی ذات سے خارج ہو،مثلاً لمم (چھوٹے گناہ) اگرچہ کبائر میں شامل نہیں ہیں۔لیکن کبائر کی جنس اثم (گناہ) میں اس کا شمار ہوتا ہے۔اس کے نظائر قرآن میں بہت سے ملتے ہیں:

① ﴿ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ﴾ (۱۹/ مریم:۶۲)

''وہ اس میں بیہودہ بات نہیں سنیں گے مگر سلام۔''

یہاں لغو کی جنس کلام ہے،سلام بھی اس میں داخل ہے۔

② ﴿ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ۝ اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ۝ ﴾

(۷۸/ النباء:۲۴۔۲۵)

''نہیں چکھیں گے اس میں ٹھنڈک اور نہ پینے کی چیز مگر گرم پانی اور پیپ۔''

یہاں پیپ کی جنس مذوق (جو چیز چکھی جائے) ایک ہی ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ اس میں کچھ نہیں سنیں گے مگر سلام، اور کچھ نہیں چکھیں گے مگر حمیم اور غساق۔ یہاں جنس کلام اور مذوق کے فرد (لغو اور برد و شراب) کو اس لیے بیان کر دیا ہے کہ اس کی نفی صراحتاً مکمل طور پر ہو جائے۔ اس عام طریقہ کو اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ جس سے محض ضمنی طور پر اس فرد کی تخصیص ہوتی ہے۔

③ ﴿مَا لَهُم بِهِۦ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا ٱتِّبَاعَ ٱلظَّنِّ ۚ﴾ (٤/ النساء:١٥٧)

"ان کے پاس اس کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں ہے مگر گمان کی پیروی۔"

ظن اس شعور میں داخل ہے جو ظن اور علم دونوں کی جنس ہے۔

﴿وَلَا تَنكِحُوا۟ مَا نَكَحَ ءَابَآؤُكُم مِّنَ ٱلنِّسَآءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۚ﴾ (٤/ النساء:٢٢)

"باپ کی منکوحہ سے نکاح سخت جرم ہے اور لائق سزا ہے، ہاں مگر جو پہلے گزر چکا۔"

یعنی اگر حرمت سے پہلے ایسا ہوا ہے تو وہ معاف ہے یہی مفہوم اس آیت کا بھی ہے:

﴿وَأَن تَجْمَعُوا۟ بَيْنَ ٱلْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۗ﴾ (٤/ النساء:٢٣)

"اور یہ کہ تم ایک وقت میں دو بہنیں نکاح میں رکھو مگر جو پہلے گزر چکا۔"

دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک وقت میں دو بہنوں کو نکاح میں رکھنا قبیح (برا) فعل ہے۔ قباحت (برائی) کا اشارہ تحریم سے معلوم ہوتا ہے حرام شے بری ہی ہوتی ہے۔ ہاں اگر پہلی شریعتوں میں جائز تھا تو اس کو برا نہیں کہا جاسکتا۔

﴿لَا يَذُوقُونَ فِيهَا ٱلْمَوْتَ إِلَّا ٱلْمَوْتَةَ ٱلْأُولَىٰ ۖ﴾ (٤٤/ الدخان:٥٧)

"نہیں چکھیں گے اس میں موت مگر پہلی موت۔"

یہ اندازِ بیان دائمی زندگی اور موت کے نہ آنے کو پوری تاکید کے ساتھ ثابت کرتا ہے۔یعنی موت کی کوئی صورت بھی ان پر طاری نہ ہوگی،اس بارے میں کسی قسم کا استثنا ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر واقعی موت کا کوئی فرد ہوتا تو اسے بجائے مستثنیٰ منقطع الاالموتة الاولیٰ کے ذکرضرور کیا جاتا،کسی مفہوم کے عموم کو محفوظ و برقرار رکھنے کے لیے یہ بہترین طریقہ ہے۔ [1]

﴿ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ (١٥/ الحجر:٩٩)

''اپنے رب کی عبادت کر، یہاں تک کہ تجھے یقین آ جائے۔''

یہاں یقین کے معنی بعض صوفیہ نے تکوینی حکم کا مشاہدہ کے لیے ہیں۔یعنی جو کائنات کی حقیقت سے واقف ہو جائے اس سے عبادت ساقط ہو جاتی ہے۔یہ تفسیر درست نہیں ہے۔یہاں بالاتفاق ''الیقین'' سے مراد موت ہے،جیسا کہ دوسری آیت میں ہے:

﴿ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ حَتّٰى أَتٰىنَا الْيَقِيْنُ﴾ (٧٤/ المدثر٤٦۔٤٧)

''اور ہم جھٹلاتے تھے قیامت کو یہاں تک کہ یقین آ گیا (یعنی موت آ پہنچی)۔''

حدیث میں ہے،رسول اللہ ﷺ نے عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت فرمایا:

((وأما عثمان بن مظعون فقد جاءه اليقين من ربه)) [2]

''لیکن عثمان تو اس کو رب کی طرف سے یقین (موت) نے آ گھیرا ہے۔''

عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿ إِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۖ آتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا أَيْنَ مَا

[1] مدارج ١/ ٣١٥-٣١٩۔ [2] صحیح البخاری ١/ ٤١٩(١١٨٦) الجنائز: باب الدخول علی المیت۔ صحیح البخاری ٣/ ١٤٢٩(٣٧١٤) مناقب الأنصار: باب مقدم النبی ﷺ واصحابه بالمدینة؛ مصنف عبدالرزاق ١١/ ٢٣٧ (٢٠٤٢٢)۔

كُنْتُ ۠ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ﴾ (۱۹/ مریم:۳۰۔۳۱)

"میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا اور مجھے برکت بخشی جہاں کہیں بھی میں ہوں۔اور مجھے نماز اور زکوۃ کا حکم دیا جب تک کہ میں زندہ رہوں۔"

یہ وصیت صرف حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ تمام انبیا اور ان کے متبعین کو بھی حکم دیا گیا تھا۔ [1]

لفظ "أو" کا استعمال

﴿ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ﴾

(۲/ البقرة:۷٤)

"پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس کے بعد، وہ پتھر کی طرح ہیں یا زیادہ سخت۔"

یہاں "أو" لاکر اس بات کی وضاحت کردی ہے کہ یہاں " كالحجارة" سے حقیقی معنی مراد ہیں، محض مبالغہ مقصود نہیں ہے۔یعنی دل کی سختی اگر پتھروں سے زیادہ نہیں تو ان کے برابر ضرور ہے، ان سے کم کسی حال میں نہیں ہے۔

﴿ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴾ (۳۷/ الصافات:۱٤۷)

"اور ہم نے بھیجا ان کو ایک لاکھ کی طرف یا زیادہ ہوں گے۔"

یہاں "او" لاکر یہ دکھلانا مقصود ہے کہ ان کی تعداد اگر ایک لاکھ سے زیادہ نہیں ہے تو کم بھی کسی صورت میں نہیں ہے۔گویا "مائة الف" کے بعد "او" لاکر یہ ثابت کردیا کہ یہاں مبالغہ مراد نہیں بلکہ یہی ایک لاکھ کا عدد مقصود ہے۔ [2]

حسنہ اور سیئہ

﴿ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۡ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ

[1] مدارج ۱/ ۱٦٦۔ [2] منارج ۱/ ۳۲۰۔

نَّفْسِكَ ﴾ (٤/ النساء :٧٩)

''تمہیں جو بھلائی پہنچتی ہے تو وہ اللہ کی جانب سے ہے۔ اور تمہیں جو مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے نفس سے ہے۔''

یہاں حسنہ اور سیئہ سے مراد وہ نعمت اور مصیبت ہے جو بندے کو اللہ کی طرف سے پہنچتی ہے۔ [1]

﴿ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ﴾ (٣٠/ الروم:٣٠۔٣١)

فاقم وجهك: یعنی اے محمد ﷺ! تم اپنا چہرہ اللہ کی طرف پھیر دو اور تمہاری امت بھی ایسا ہی کرے۔

منيبين اليه۔ ''اس کی طرف جھکتے ہوئے۔''

اس کے دو مطلب ہوسکتے ہیں:

① یعنی اپنا چہرہ اللہ کی طرف پھیر دو اس کی طرف جھکتے ہوئے۔ اس صورت میں اقم کی ضمیر پوشیدہ سے حال ہوگا۔

② اللہ نے ہر ایک کی فطرت میں انابت جھکنا اور متوجہ الی اللہ ہونا رکھا ہے۔ لیکن بعد میں وہ اس فطرت صالحہ سے ہٹ گئے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے:

((مامن مولودالايولدعلى الفطرة، فأبواه يهوّدانه أو ينصرانه أويمجسانه)) [2]

''نہیں کوئی بچہ مگر وہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، بعد میں اس کے ماں باپ اُسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا چھوڑتے ہیں۔''

اس صورت میں منيبين، فطرالناس میں الناس (لوگوں) کی حالت بیان کررہا ہے۔

[1] مدارج ١/ ٤٢٤۔ [2] صحیح البخاری ١/ ٤٥٦(١٢٩٢) الجنائز: باب اذا اسلم الصبی فمات؛ صحیح مسلم ٤/ ٢٠٤٧(٢٦٥٨) القدر: باب معنی ((کل مولود یولد علی الفطرة......))

انابت: لفظ انابت میں تیز روی، واپسی اور پیش قدمی کا مفہوم شامل ہے۔ منیب الی اللہ وہ ہے جو اس کی خوشنودی کی طرف دوڑنے والا، ہر وقت اس کی طرف رجوع اور توجہ کرنے والا، اور اس کے محبوب پسندیدہ احکام کو انجام دینے والا ہو۔

انابت کی دو قسمیں ہیں:

① اللہ کی صفت ربوبیت (پالنا) کے لیے جھکنا، یہ انابت تمام مخلوقات میں پائی جاتی ہے۔ مؤمن، مشرک اور نیک وبد اس میں شریک ہیں۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿ وَإِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُم مُّنِيبِينَ إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا أَذَاقَهُم مِّنْهُ رَحْمَةً إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ۝ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ﴾

(۳۰/ الروم: ۳۳، ۳٤)

”اور جب لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہے تو انابت کرتے ہوئے اپنے رب کو پکارتے ہیں پھر جب ان کو اپنے پاس سے رحمت کا مزا چکھاتا ہے تو اچانک ایک گروہ ان میں سے اپنے رب کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے، تاکہ جو ہم نے ان کو دیا ہے اس کا انکار کر دیں۔“

یہ آیت ہر اس داعی (دعا کرنے والے) کے حق میں ہے جو مصیبت میں گھر جاتا ہے۔ اس قسم کی انابت کے لیے مسلمان ہونا ضروری نہیں۔ مشرک و کافر بھی ایسا کر لیتے ہیں۔

② دوسری انابت اللہ کے صرف اولیا اور صالحین بندوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ اللہ کی صفت الوہیت کے لیے انابت ہے۔ اس کو انابت عبودیت (بندگی) اور محبت کہتے ہیں۔ یہ انابت چار باتوں پر مشتمل ہوتی ہے:

❶ اللہ کی محبت ❷ اس کے لیے عاجزی اور فرمانبرداری

❸ اس کی طرف توجہ ❹ اس کے ماسوا سے اعراض اور بے رغبتی [1]

﴿ وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّن قَرْنٍ هُمْ أَشَدُّ مِنْهُم بَطْشًا فَنَقَّبُوا فِي

[1] مدارج ۱/۴۳۳، ۴۳۴۔

الْبِلَادِ ؕ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ۝﴾ (۵۰/ ق:۳۶-۳۷)

''اورہم نے ان سے پہلے کتنی قومیں ہلاک کیں وہ زیادہ سخت تھے، اُن سے پکڑ میں۔ پھر چکر لگایا انہوں نے شہروں میں، کیا ہے کوئی پلٹنے اور پناہ لینے کی جگہ، بیشک اس میں نصیحت ہے دل والے کے لیے یا جس نے کان لگائے حاضر ہوکر۔''

لوگوں کی تین قسمیں ہیں:

① مردہ دل آدمی، اس کے لیے اس آیت میں کوئی نصیحت نہیں ہے۔

② زندہ دل انسان، لیکن آیات قرآنی کی طرف کان نہیں لگاتا، اس لیے وہ کائناتی نشانیوں میں غور کرنے سے محروم رہ جاتا ہے۔

استعداد وصلاحیت کے باوجود اس غفلت کے دو سبب ہوسکتے ہیں:

1 آیاتِ الٰہیہ کی آواز ابھی تک اس کے کانوں تک پہنچی نہیں ہے۔

2 آواز پہنچ چکی ہے لیکن دوسرے مشاغل میں اس قدر گھرا ہوا ہے کہ پیغام حق سننے کا موقعہ ہی نہیں پاتا ہے۔ یہ شخص غائب القلب (غائب دل والا) بھی کسی نصیحت سے فائدہ نہیں اٹھاسکتا۔

③ ایسا زندہ اور بیدار دل اور صلاحیت استعداد والا کہ جو آیات پڑھی جاتی ہیں۔ ان کو توجہ سے سنتا اور ان میں غور وفکر کرتا ہے اور کائنات کے عجائبات، انقلابات سے عبرت ونصیحت حاصل کرتا ہے۔ پہلے شخص کی مثال اندھے کی سی ہے جو کسی چیز کو دیکھتا ہی نہیں ہے۔ دوسرے کی مثال اس انسان کی سی ہے جو آنکھ تو رکھتا ہے لیکن بجائے مقصود کے دوسری طرف اس کی نگاہ اٹھی ہوئی ہے، یہ بھی اندھے کی طرح ہے۔ تیسرا وہ ہے جو آنکھ بھی رکھتا ہے اور پوری طرح اس کی نگاہ اصل مقصد پر جمی ہوئی ہے۔

''او القی السمع''او (یا) اپنے اصلی معنی میں ہے۔ اس کو بمعنی واؤ (اور)

لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جوانسان روشن، بیدار اور واقعات وحالات سے عبرت اورنتائج نکالنے والا دل رکھتا ہے،وہ نصیحت وعبرت کے فوائد سے محروم نہیں رہ سکتا۔آیات کے سننے سے اس کے ایمان کی روشنی دوگنی چوگنی ہوجاتی ہے۔اس قسم کے انسان ساری مخلوق سے ایمان وبصیرت کے لحاظ سے بلند اورممتاز ہوتے ہیں۔ان کے دل کی نگاہیں اس قدر تیز ہوتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی بتائی ہوئی باتیں ان کے لیے مشاہدہ میں آئی ہوئی چیزوں کے برابر ہوتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ انہیں پوری تفصیلات کا علم نہیں ہوتا۔اسی بنا پرکہا گیا کہ حضرت محمد ﷺ اورصدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی مثال ان دوشخصوں کی سی ہے جوایک گھر میں داخل ہوئے۔ایک نے تو تمام گھر کی تفصیلات اور جزئیات کومعلوم کرلیا۔دوسرے نے صرف اتنا اندازہ کیاکہ اس گھر میں بڑی بڑی چیزیں ہیں اس کوتفصیلی علم حاصل نہیں ہوا۔اب گھر سے نکلنے کے بعد دوسرا شخص پہلے سے اس کے تفصیلی حالات دریافت کرتا ہے اوراس کی سچائی کی بنا پرتصدیق بھی کرتا جاتا ہے۔ایسی بصیرت والا شخص جب آیات کوسنتا ہے تواس کے نور ایمان میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگرکسی کے پاس اس قسم کا اعلیٰ دل نہیں ہے تووہ کان لگاکراوراپنے معمولی دل کومتوجہ کرکے آیات سے نصیحت وعبرت کافائدہ حاصل کر ہی لیتا ہے۔

﴿فَإِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۶۵)

''اگر بارش نہ سہی تو شبنم ہی سہی۔'' [1]

معنی سَمِع ونظائرہ فی القرآن

فعل سَمِع کے چار معنی ہیں:

① سمع ادراک، یعنی ظاہری آواز کاسننا۔

② عقل وفہم کے لحاظ سے سننا، اس کاتعلق معانی سے ہے۔

[1] مدارج ۱/ ۴۴۲، ۴۴۳۔

③ سمع اجابت وقبولیت، یعنی اس طرح سننا کہ جو کچھ مانگا جارہا ہے اس کو عطا کر دینا۔

④ اطاعت وفرمانبرداری کا سننا۔

اب ان کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

1 ﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا﴾ (۵۸/ المجادلة:۱)

”اللہ تعالیٰ نے اس عورت کی بات سن لی جو تجھ سے اپنے شوہر کے بارے میں جھگڑا کررہی تھی۔“

﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ﴾

(۳/ آل عمران:۱۸۱)

”بے شک اللہ نے ان لوگوں کی بات سن لی جو کہتے ہیں کہ بے شک اللہ فقیر ہے اور ہم خوشحال ہیں۔“

2 ﴿تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ﴾ (۲/ البقرة:۱۰۴)

”راعنا مت کہو انظرنا کہو اور سنو۔“

یہاں محض کلام کا سننا مراد نہیں بلکہ عقل وفہم کا سننا مقصود ہے۔یہی معنی ”سمعنا واطعنا“ کے ہیں۔

3 ((سمع الله لمن حمده)) [1]

مسنون دعا میں ہے:

((اللهم اسمع واعط))

”یعنی اے اللہ! قبول کر اور جو مانگتا ہوں اسے عطا کر۔“

4 ﴿سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ﴾ (۵/ المائدة:۴۲)

”یعنی جھوٹ کے سامنے سر خم کردینے والے۔“

[1] صحيح البخارى ۱/ ۲۷۴(۷۶۲) صفة الصلوة: باب مايقول الامام ومن خلفه اذا رفع رأسه من الركوع ؛صحيح مسلم ۱/ ۲۹۳(۳۹۱) الصلوة: باب استحباب رفع اليدين حذوالمنكبين……

یہی معنی "فیکم سماعون لھم" کے ہیں، یہاں جاسوس معنی درست نہیں۔ کیونکہ جاسوس کی تو وہاں ضرورت پڑتی ہے جہاں دو گروہ الگ الگ ہوں اور منافقین تو مسلمانوں میں ملے جلے رہتے تھے۔ "سمع" بمعنی اول ودوم کا تعلق اپنے مفعول سے براہ راست ہوتا ہے۔ اور "سمع" بمعنی چہارم کا تعلق مفعول سے بواسطہ "من" اور "لام" دونوں آتا ہے۔ اگر "لام" آئے تو اطاعت اور اگر "من" آئے تو قبولیت کے معنی ہوں گے۔ اور "سمع" بمعنی سوم کا استعمال "لام" کے ذریعہ ہوتا ہے۔ [1]

زخرف القول

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا﴾ (٦/ الانعام:١١٢)

''اسی طرح بنائے ہم نے ہر نبی کے لیے دشمن انسانوں اور جنوں میں سے شیاطین ہیں جو بعض بعض کو من گھڑت ملمع کی ہوئی یا فریب دینے والی باتیں بتلاتے ہیں۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انبیا کی مخالفت میں منکرین حق کس طرح آراستہ وپیراستہ جھوٹی باتوں کا سہارا لے کر لوگوں کو دعوت اسلامی سے برگشتہ کرتے ہیں۔ گندی اور حرام چیزوں کو خوش نما نام دے کر لوگوں کو دھوکے اور فریب میں ڈالتے ہیں۔ مثلاً ام الخبائث شراب کو ام الافراح (خوشیوں کی جڑ) کے نام سے پکارتے ہیں۔ حشیشہ (بھنگ) جیسی گندی چیز کو ذکر وفکر کی چٹکی کہتے ہیں۔ فسق وفجور اور راگ گانے کی مجالس کو پاکیزہ محفلیں قرار دیتے ہیں۔ گناہوں کے چھوڑنے اور اللہ سے خوف کھانے کو رحمت الٰہی سے سوئے ظن (بدگمانی) سمجھتے ہیں۔ اس قسم کا کلام ایک شہوت بھرے دل کے لیے آگ پر تیل کا کام دیتا ہے۔ معصیت وبغاوت پر اس کی جرأت بڑھ جاتی ہے۔ اسی کو قرآن نے "زخرف القول" کہا ہے۔

[1] بدائع:٢/ ٧٥، ٧٦۔

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا۝﴾ (۱۷/ الاسراء:۴۲)

''کہہ دیجیے اگر اس کے ساتھ کئی الٰہ (معبود) ہوتے، جیسا کہ وہ کہتے ہیں تب تو وہ عرش والے کی طرف راہ تلاش کرتے۔''

جن کو یہ اللہ کے سوا معبود ٹھہراتے ہیں وہ سب یہ اقرار کرتے ہیں کہ اللہ کے بندے اور اس کے غلام ہیں اور اسی کے محتاج ہیں۔ بالفرض اگر وہ الٰہ بھی ہوتے جیسا کہ مشرکین کہتے ہیں۔ تب بھی وہ اسی کی عبادت کرتے اور اسی کا قرب تلاش کرتے اور اس کے سوا کسی دوسرے کی طرف رخ نہ کرتے۔ پھر ان مشرکین کو کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت میں مصروف ہیں۔ اس مضمون کو دوسری آیت میں یوں ادا کیا گیا ہے:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ﴾ (۱۷/ الاسراء:۵۷)

''یہی لوگ جن کو وہ پکارتے ہیں۔ اپنے رب کی طرف وسیلہ (قرب ونزدیکی) تلاش کرتے ہیں کہ کون ان میں سے زیادہ قریب ہے اور اس کی رحمت کی امید کرتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔''

﴿مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ۝﴾

(۲۳/ المؤمنون:۹۱)

''نہیں ٹھہرایا اللہ نے کوئی لڑکا اور نہیں ہے اس کے ساتھ کوئی الٰہ اگر ایسا ہوتا تو ہر الٰہ اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہو جاتا اور بعض بعض پر چڑھ دوڑتا، پاک ہے اللہ اس بات سے جسے وہ بیان کرتے ہیں۔''

توحید پر یہ نہایت ہی قوی دلیل ہے، اللہ کے سوا الٰہ ہونے کی حالت میں

تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

① ہر الٰہ اپنی مخلوق اور سلطنت کو لے کر الگ بیٹھ جائے۔

② ایک الٰہ دوسرے الٰہ پر چڑھ دوڑے۔

③ سارے خدا ایک بڑے الٰہ کے ماتحت اس کے حکم کے تابع ہوجائیں۔

اس جہان کا نظام بغیر کسی فساد اور بگاڑ کے جس حسن ترتیب کے ساتھ چل رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان کے الٰہ کئی نہیں بلکہ صرف ایک ہی ہے۔ [1]

دلائل توحید

﴿لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ﴾

(۲۱/ الأنبياء:۱۷)

''اگر ہم کھیل اختیار کرنا یا بنانا چاہتے تو اپنے پاس سے بنا سکتے تھے۔ بے شک ہم کرنے والے ہیں۔''

اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ مشرکین عرب اور نصاریٰ کا اللہ کے لیے اولاد ٹھہرانا عقل کے خلاف ہے۔ اگر اُسے ایسا کرنا بھی ہوتا تو وہ اپنی اولاد اس جنس میں سے بناتا جو اس کے پاس ہے اور ہر قسم کے عوارض بشری اور میل کچیل سے پاک ہے۔ یہ دلیل اپنی قوت کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔ اسی لیے اس کے بعد فرمایا:

﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۭ﴾

(۲۱/ الانبیاء:۱۸)

''بلکہ اللہ تعالیٰ حق کو باطل پر دے مارتا ہے تو پھر وہ اس کا بھیجا نکال کے چھوڑتا ہے۔ اس باطل کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ مٹ کے ہی رہتا ہے۔''

[1] مختصر الصواعق: ۱/ ۵۷، ۶۲، ۶۳۔

اس کی نظیر ذیل کی آیت ہے:

﴿ لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝﴾ (۳۹/ الزمر:٤)

''اگر اللہ تعالیٰ بیٹا بنانا چاہتا تو مخلوق میں سے جسے چاہتا چن لیتا، اللہ اکیلا زبردست ہے۔''

﴿ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝﴾ (۵/ المائدۃ:۷۵)

''مریم کے بیٹے مسیح (عیسیٰ) نہیں ہیں مگر رسول، بیشک اس سے پہلے بھی رسول گزر چکے اور اس کی ماں سچی تھی۔ دونوں کھانا کھایا کرتے تھے، دیکھو ہم کس طرح ان کے لیے آیتیں بیان کرتے ہیں۔ پھر دیکھو وہ کہاں بھٹکتے ہیں۔''

اس آیت میں حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کی ماں کی الوہیت (خدائی) کو دو پہلوؤں سے باطل اور غلط ٹھہرایا گیا ہے:

① یہ دونوں ماں بیٹے اپنے وجود کی بقا کے لیے غذا اور پانی کے محتاج ہیں۔ خود اپنا مستقل وجود نہیں رکھتے، جو محتاج ہوں وہ الٰہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ الٰہ تو سب سے بے نیاز اور بے پرواہوتا ہے۔

② جو غذا کھاتا اور پانی پیتا ہے اس سے فضلات (بول وبراز) کا نکلنا لازمی ہے۔ یہ چیزیں ایسی ہیں کہ ان کا نام بھی لے کر ذکر نہیں کیا جاتا، اسی لیے (واللہ اعلم) اللہ تعالیٰ نے کھانے کا ذکر کیا ہے جس کو سن کر فضلات کی طرف ذہن خود بخود منتقل ہو جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ فضلات والی مخلوق سے اللہ تعالیٰ کا بیوی اور بیٹا پسند کرنا کیسے اسے زیب دیتا ہے۔ اگر وہ اولاد بناتا تو ایسی مخلوق میں سے بناتا جو کھانے پینے اور فضلات سے پاک ہے۔

﴿ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴾ (٤٣/ الزخرف:١٧)

''اور جب ان میں سے کسی ایک کو اس چیز کی بشارت ملتی ہے جو وہ رحمٰن کے لیے بیان کرتا ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ غصہ کے مارے اپنے دانت چبانے لگتا ہے۔''

مشرکین اللہ کے لیے بیٹیاں ٹھہراتے تھے ان کے رد میں فرمایا کہ جس چیز کو خود یہ اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں۔ اسی کو اللہ کے لیے مانتے ہیں، اس سے بڑھ کر نا انصافی اور کیا ہوگی۔

اسی لیے فرمایا:

﴿ وَيَجْعَلُونَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُونَ ﴾ (١٦/ النحل:٦٢)

''اور اللہ تعالیٰ کے لیے وہ چیزیں ٹھہراتے ہیں، جنہیں وہ ناپسند کرتے ہیں۔''

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس صنف نازک (عورت) کے ضعف وکمزوری کو بیان فرمایا۔ جسے وہ اللہ کے لیے ثابت کرتے ہیں اور یہ کہ دونوں جنسوں (مرد وعورت) میں سے یہ کمزور اور ناقص ہے۔ اسی بنا پر وہ ظاہری نقصان کی تلافی زیور سے کرتی ہے۔ وہ بیان وگفتگو میں بھی کمزور ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿ أَوَمَنْ يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ ﴾

(٤٣/ الزخرف:١٨)

''اور کیا وہ جو زیور میں پرورش پاتی ہے وہ تو گفتگو اور بحث میں عاجز اور قاصر ہے۔''

اس آیت میں چار باتوں کی طرف اشارہ ہے:

1. عورتیں ناقص ہیں، کمزور ہیں اسی لیے وہ زیور کی محتاج ہیں۔
2. بحث وجدال کے موقعہ پر اپنی دلیل کو وضاحت سے نہیں پیش کرسکتی ہیں،

گفتگو میں عاجز ودرماندہ ہیں۔

③ ان کی یہ زینت وآرائش اپنے شوہر کے لیے ہے۔

④ میدان جنگ میں ان کو قرار وثبات حاصل نہیں ہوسکتا۔

زیور کو بیان کیا جو کہ کمزوری اورناتوانی کی علامت ہے۔

﴿ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۵۸)

''کیا نہیں دیکھا آپ نے اس کی طرف جو جھگڑا ابراہیم علیہ السلام سے اس کے رب کے بارے میں، کہ وہی ہے اس کو اللہ نے بادشاہت، جبکہ کہا ابراہیم نے میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ اس نے کہا میں زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ کہا ابراہیم نے کہ اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق سے لاتا ہے، تو مغرب سے لا کر دکھا۔ تو جس نے کفر کیا تھا وہ ہکا بکا ہوکر رہ گیا۔ اور اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔''

جب ابراہیم نے نمرود کو یہ جواب دیا کہ میرا اللہ زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ تو وہ مغالطہ آمیزی اور کج بحثی کی بنا پر کہنے لگا کہ میں زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جس کو چاہتا ہوں قتل کر دیتا ہوں اور جس کو چاہتا ہوں زندہ چھوڑ دیتا ہوں، بس اسی کا نام زندہ کرنا اور مارنا ہے۔ اس کج بحثی کے جواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس معارضہ کو توڑتے ہوئے فرمایا کہ سورج کی گردش کا جو اللہ نے قانون بنایا ہوا ہے اس میں تصرف کر کے دکھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ قدرت میں اللہ تعالیٰ کے ہم پلہ ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو سورج کو مغرب سے نکال کر دکھادے۔ یہاں یہ نہ سمجھا جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے مقابلہ میں ایک دلیل کو چھوڑ کر دوسری دلیل اختیار کی تھی۔ بلکہ دراصل ان الفاظ کے ذریعہ

مدعی الوہیت کی دلیل اور حجت توڑنے کے لیے اُسے الزام دینا مقصود تھا۔

﴿ وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ﴾ (٦٧/ الملك:١٣)

''اور چھپاؤ اپنی بات کو یا اس کو ظاہر کرو، بیشک وہ سینے کی باتوں کو جاننے والا ہے۔''

﴿ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۭ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴾ (٦٧/ الملك:١٤)

''کیا نہیں جانتا وہ جس نے پیدا کیا، وہ باریک بین خبردار ہے۔''

اس آیت میں اللہ کے علم کی کامل وسعت اور ہمہ گیری کو بیان کیا گیا ہے۔ ظاہر بات ہے خالق اپنی مخلوق سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ جبکہ تم جانتے ہو اللہ تعالیٰ تمہارا اور تمہارے سینوں کا اور جو کچھ اس میں ہے سب کا خالق ہے، تو پھر اس کی نگاہوں سے تم اوجھل کیسے رہ سکتے ہو۔

"الا یعلم من خلق" کے دو معنی ہو سکتے ہیں:

① کیا نہیں جانتا وہ جس نے پیدا کیا۔ اس صورت میں من، یعلم کا فاعل ہوگا۔

② کیا نہیں جانتا وہ جس کو اس نے پیدا کیا۔ اس حالت میں من، یعلم کا مفعول ہوگا۔

دونوں معنی درست ہیں۔ پھر اس دلیل کے خاتمہ پر دو ناموں کا ذکر کیا ہے۔ جن سے علم الٰہی کی حجت کو مزید تقویت پہنچتی ہے۔ فرمایا:

﴿ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴾ (٦٧/ الملك:١٤)

''وہ باریک بین خبردار ہے۔''

وہ لطیف ہے، یعنی اس کی حکمت و صنعت (کاریگری) لطافت اور باریکی سے پر ہے۔ یہاں تک کہ اس کا سمجھنا عقل سے بالاتر ہے، وہ خبیر ہے یعنی اس کا علم تمام چیزوں کی حقیقت اور تہہ تک پہنچا ہوا ہے۔ اس کی نگاہ سے ظاہر و باطن کا کوئی گوشہ بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ جس کی یہ شان ہو بھلا بتاؤ تو سہی اس سے سینوں کے راز اور دلوں کے وساوس کیسے چھپ سکتے ہیں۔

﴿ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا یُوْقِنُوْنَ ۝﴾ (۵۲/ الطور:۳۵۔۳۶)

”کیا وہ بغیر کسی چیز کے پیدا کیے گئے ہیں یا وہ خود پیدا کرنے والے ہیں۔ یا انہوں نے آسمانوں اور زمین کو بنایا ہے بلکہ وہ یقین نہیں رکھتے ہیں۔“

اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور خالقیت کے ثبوت میں نہایت واضح دلیل ہے۔

فرمایا، کہ یہ مشرکین تین حال سے خالی نہیں ہیں:

① یا توان کی پیدائش بلا خالق ہوئی ہے، ظاہر بات ہے کہ یہ ناممکن ہے۔

② اپنے خالق خود ہیں۔ یہ بھی درست نہیں، جو ہستی اپنی عمر میں ایک لمحہ بڑھانے کی قدرت نہیں رکھتی۔ اس کے لیے کیسے ممکن ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو پیدا کرلے۔

③ بس اب تیسری ہی صورت رہ گئی کہ اللہ تعالیٰ کو خالق تسلیم کرلیا جائے۔

ام خلقوا السموات والارض نے واضح کردیا کہ انہوں نے نہ اپنے آپ کو پیدا کیا ہے اور نہ آسمان وزمین کو۔ مسکن اور ساکن دونوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے اس جملہ سے دلیل میں مزید حسن پیدا ہوگیا ہے۔

جب وہی خالق ہے تو عبادت وشکر کا سزاوار بھی وہی ہے۔ اس کی عبادت میں دوسروں کو شریک ٹھہرانا ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔

﴿ قَالَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ ۝ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝﴾ (۳۶/ یٰسین: ۲۰۔۲۱)

”اے میری قوم! رسولوں کی پیروی کرو، ان کی پیروی کرو جو تم سے اجر (مزدوری) نہیں مانگتے اور وہ ہدایت پر ہیں۔“

اس آیت میں بتلایا کہ انبیا کی اتباع ضروری ہے اس لیے کہ وہ راہ یاب ہیں اور کسی سے دعوت حق پر اجرت نہیں طلب کرتے اور نہ وہ ریاست ووجاہت

کے خواہش مند ہیں۔

﴿ وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ (۳۶/ یسین: ۲۲)

''اور کیا ہے میرے لیے کہ میں نہ عبادت کروں اس کی جس نے مجھ کو پیدا کیا ہے اور اسی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔''

یہاں مشرکین کے دلوں کو مائل کرنے کے لیے داعی حق نے اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے مستحق عبادت ہونے پر دلیل پیش کی ہے۔ بتلایا کہ اپنے فاطر و خالق کی عبادت عقلاً واجب ہے۔ جس نے انسان کو وجود و پیدائش کی نعمت سے نوازا ہے اس کا شکر ادا کرنا عقلاً لازمی ہے۔ عقل، فطرت اور شریعت کا تقاضا ہے کہ منعم و محسن کا شکر ادا کیا جائے۔

اس کے بعد ناصحانہ انداز میں خوف دلایا ہے:

﴿ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ (۳۶/ یسین: ۲۲)

''اور اُسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔''

پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جن معبودوں کی عبادت کی جاتی ہے۔ سب باطل ہیں۔

﴿ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ﴾ (۳۶/ یسین: ۲۳)

''کیا وہ ٹھہراتے ہیں اس کے سوا اللہ، اگر رحمٰن مجھ کو نقصان پہنچانا چاہے تو ان (معبودان باطل) کی شفاعت کچھ کام نہ دے گی اور نہ وہ نجات دلا سکیں گے۔''

یعنی عابد یہ چاہتا ہے کہ ضرورت کے وقت معبود بنائے، نقصان کو ہٹائے اور نفع پہنچائے۔ لیکن جب اللہ ہی نقصان پہنچائے تو پھر کسی میں کیا تاب ہے کہ اللہ کے فیصلہ کو ٹال سکے۔ تو پھر ایسے محتاج معبود کب عبادت کے لائق ہو سکتے ہیں۔

اسی لیے فرمایا:

﴿ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ (٣٦/ یسین:٢٤)

''تب تو میں کھلی گمراہی میں ہوں گا۔'' ❶

❶ مختصر الصواعق: ١/ ٦٨-٧٣۔

دلائل رسالت

﴿ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون: ۶۸۔۷۰)

”کیا پھر وہ بات میں غور نہیں کرتے یا ان کے پاس ایسی چیز آئی ہے جو ان کے آباء واجداد کے پاس نہیں آئی تھی کیا انہوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا کہ وہ اس سے اجنبی ہیں، یا وہ کہتے ہیں کہ اسے جنون ہے۔ بلکہ وہ حق لے کر آیا ہے اور اکثر ان میں سے حق کو ناپسند کرنے والے ہیں۔“

ان آیات میں مخالفین کو القول (قرآن) میں تدبر اور قائل (کہنے والے) کی حالت میں غور وفکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ کسی قول کا جھوٹ ہونا چند باتوں سے معلوم ہوتا ہے:

① اس قول کے الفاظ ہی اس کے جھوٹ اور غلط ہونے کو ظاہر کر دیتے ہیں۔

② کلام میں تناقض، تعارض (ٹکراؤ) اور اختلاف ہوتا ہے، جھوٹ کی نشانیاں پوری طرح نمایاں نظر آتی ہیں۔

③ قائل کی حالت اور سیرت سے بھی قول کی غلطی کا پتہ چل جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جس شخص کی زندگی جھوٹ، فحش میں آلودہ رہی ہو اس سے کس طرح راست بازی اور حق گوئی کی امید رکھی جا سکتی ہے۔

﴿ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۡ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ ﴾ (۱۰/ یونس: ۱۶)

”کہہ دو! اگر اللہ چاہتا تو میں اس کو تم پر تلاوت نہ کرتا اور نہ میں تمہیں اس کو بتلاتا، بیشک میں تم میں اس سے پہلے ایک (لمبی)

عمر گزار چکا ہوں کیا پھر تم سمجھتے نہیں ہو۔"

اس آیت میں دو دلیلیں بیان ہوئی ہیں:

① یہ قرآن اللہ کی طرف سے ہے میری طرف سے نہیں ہے۔اس کا لانا میرے بس کی بات نہیں ہے۔اگر وہ چاہے تو میرے دل زبان کو اس کے سمجھنے اور بیان کرنے سے روک دے اور تمہارے کانوں اور عقلوں پر قفل چڑھا دے، کہ پھر نہ تم اس کو سمجھ سکو اور نہ میں بیان کرسکوں۔

② میں نے تمہارے اندر رہ کر ایک لمبی عمر گزاری ہے۔تم میری سیرت، عادت اور اخلاق سے واقف ہو، حضر وسفر میں میرے ساتھ رہے ہو۔کیا میری زندگی تمہیں ظالم، فاسق اور جھوٹے کی سی زندگی نظر آتی ہے۔اس سے بڑھ کر ظالم اور جھوٹا کون ہوگا جو اللہ پر بہتان باندھے اور دنیا میں فساد وفتنہ پھیلانے کی کوشش کرے اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ نہ میں نے کسی مکتب میں تعلیم حاصل کی ہے اور نہ کبھی ہاتھ میں قلم پکڑا ہے۔پھر مجھ پر یہ کیسے الزام لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب میں خود گھڑ کر لے آیا ہوں۔کیا اتنی صاف بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ﴾ (۳٤/ سبا: ٤٦)

"اور کہہ دو! میں بس تمہیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم اللہ کے لیے دو دو اور ایک ایک کھڑے ہو جاؤ۔پھر تم غور کرو! کیا تمہارے ساتھی کو جنون ہے وہ تو صرف تمہیں آنے والے سخت عذاب سے ڈرانے والا ہے۔"

انسان کے لیے جو حق کی معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے، دو حالتیں ہوسکتی ہیں:

① کسی دوسرے کے ساتھ مل کر حل طلب معاملہ میں غور وفکر اور تبادلہ خیال ہو۔

② خود تنہائی میں اصل حقیقت تک پہنچنے کے لیے کوئی مناسب حل تلاش کیا

جائے۔اس آیت میں دونوں طریقے بیان کردیے ہیں: [1]

﴿ وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ ﴾ (۱۳/ الرعد:۵)

''اگر تجھے تعجب ہوتو واقعی ان کا یہ کہنا عجیب ہے کہ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئی پیدائش میں ہوں گے؟ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار سے کفر کیا۔''

اس آیت کے دومطلب ہیں:

① اگر آپ ان کے اس قول (کیاہم جبکہ مٹی ہوجائیں گے نئی پیدائش پائیں گے) سے تعجب کرتے ہیں۔تو واقعی یہ تعجب کی بات ہے وہ اس کاانکار کیسے کرتے ہیں۔ان کو تو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا ہے جبکہ ان کانام ونشان بھی نہ تھا۔

② اگر آپ ان کے شرک اور نافرمانی سے تعجب کرتے ہیں تو ان کا قیامت سے انکار کچھ کم تعجب خیز نہیں ہے۔دونوں صورتوں میں انسان کا قیامت کو نہ ماننا ایک انوکھی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس کے انکار سے تو اللہ کی الوہیت، قدرت، حکمت، انصاف اورغلبہ وسلطنت کاانکار لازم آتا ہے۔اس بنا پر قیامت کے بارے میں ان کاقول نقل کرکے فرمایا:

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ ﴾ (۱۳/ الرعد:۵)

''یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کا انکار کیا۔'' [2]

---

[1] مختصر الصواعق ۱/ ۶۴-۶۶۔ [2] مدارج ۱/ ۱۲۶۔

دلائل قیامت

﴿ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّـحْيِ الْعِظَامَ وَهِىَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ۝ ﴾

(۳۶/ یسین:۷۸۔۷۹)

''اور ہمارے لیے اس (کافر) نے مثال بیان کی اوراپنی پیدائش کو بھول گیا۔اس نے کہا کون ہڈیوں کوزندہ کرسکتا ہے جب کہ وہ بوسیدہ ہوں گی۔کہہ دیجیے!زندہ کرے گی اسے وہ ذات جس نے اسے پہلی مرتبہ پیدا کیااوروہ ہر پیدائش کو جاننے والا ہے۔''

قیامت پراس سے واضح اورنمایاں دلیل اورکیاہوسکتی ہے۔جملہ'' اپنی پیدائش کو بھول گیا۔'' نے ملحد کے شبہ کوپوری طرح دور کردیاہے۔

﴿ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ ﴾ (۳۶/ یسین: ۷۹)

''کہہ دیجیے!زندہ کرے گا وہ جس نے پہلی بار پیدا کیاہے۔''

یہاں پہلی بار پیدائش کودوسری بار پیدائش کے لیے بطور دلیل پیش کیا گیا ہے۔اس سے کس عقلمند کو انکار ہوسکتاہے کہ جوپہلی بارپیدا کرے وہ دوسری بار پیدا کرنے پر بدرجہ اولیٰ قادر ہے،خلق(پیدا کرنے)کے لیے ضروری ہے کہ خالق مخلوق پر قادر ہواوراس پیدائش کی تمام تفصیلات کاعلم رکھتاہو۔اس لیے آخیر میں فرمایا:

﴿ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ۝ ﴾ (۳۶/ یسین :۷۹)

''وہ ہرپیدائش کاعلم رکھتاہے۔''

جس طرح اُسے پہلی بارپیدائش کی تمام تفاصیل،صورت اورمادہ کاعلم ہے اسی طرح دوسری پیدائش کا حال ہے۔ایک پورے علم اورکامل قدرت رکھنے والی ہستی بوسیدہ اورسڑگل جانے والی ہڈیوں کودوبارہ پیدا کرنے سے کیسے عاجزودرماندہ

رہ سکتی ہے؟

یہ سوال پیدا ہوسکتا تھا کہ گلی سڑی ہڈیوں کی طبیعت خشک اور ٹھنڈی ہوجاتی ہے اور بدن میں زندگی کا مادہ طبعی طور پر گرم ہوتا ہے تو پھر یہ خشک اور سرد چیز حرارت وگرمی والی شے میں کیسے تبدیل ہوسکتی ہے؟

اس شبہ کا جواب ذیل کی آیت میں ہے:

﴿الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ۝﴾ (۳٦/ یٰسین:۸۰)

''اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہارے لیے درخت سے آگ پیدا کی پھر تم اُس سے سلگاتے ہو۔''

یعنی جو ہستی انتہائی گرم خشک شے (آگ) کو سرد وتر چیز (ہرے درخت) سے نکال سکتی ہے۔ اسے کیا مشکل ہے کہ گلی سڑی ہڈیوں کو جیتی جاگتی صورت میں بدل دے، قیامت پر مذکورہ بالا دلیل کو پرزور بنانے کے لیے فرمایا کہ جو بڑی سے بڑی مخلوق پیدا کرسکتا ہے وہ چھوٹی سی مخلوق کے پیدا کرنے سے کیسے عاجز رہ سکتا ہے۔

﴿اَوَلَيْسَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ﴾ (۳٦/ یٰسین:۸۱)

''اور کیا وہ ہستی جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو پیدا کردے۔''

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خبر دی ہے کہ اس نے آسمان وزمین جیسی بڑی اور شاندار مخلوق کو بلا نمونہ پیدا کیا ہے، وہ گلی سڑی ہڈیوں کو اصل حالت میں لوٹانے پر زیادہ قادر ہے۔ یہی مضمون دوسری آیتوں میں ادا کیا گیا ہے:

﴿لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۝﴾ (٤٠/ المؤمن:۵۷)

''آسمان وزمین پیدا کرنا لوگوں کی پیدائش کی بہ نسبت زیادہ بڑا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

﴿ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ ۚ بَلَىٰ إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴾

(٤٦/ الاحقاف:٣٣)

''اور کیا انہوں نے نہیں دیکھا؟ کہ بیشک وہ اللہ جس نے آسمانوں اورزمین کو پیدا کیااوران کے پیدا کرنے سے عاجز نہیں ہوا،قدرت رکھتا ہے مردوں کو زندہ کرنے پر، کیوں نہیں وہ ہرچیز پر قادر ہے۔''

اس کے بعد فرمایا کہ وہ اپنے فعل مخلوقات کی طرح آلات اورذرائع کا محتاج نہیں ہے۔وہاں توبس''کن''کہنے کی دیر ہے فوراًچیز عدم سے وجود میں آجاتی ہے۔اس کی وجہ ظاہر ہے کہ تمام مخلوقات کی بادشاہت اس کے ہاتھ میں ہے وہ جس طرح چاہتا ہے اپنے افعال میں تصرف(الٹ، پھیر)کرتا ہے۔اخیر میں فرمایا:

﴿والیہ ترجعون﴾''اوراسی کی طرف تم لوٹائے جاؤگے۔''

قیامت کی ایک اوردلیل

﴿ أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا ۝ قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا ۝ أَوْ خَلْقًا مِمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ ۚ فَسَيَقُولُونَ مَنْ يُعِيدُنَا ۖ قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُونَ إِلَيْكَ رُءُوسَهُمْ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هُوَ ۖ قُلْ عَسَىٰ أَنْ يَكُونَ قَرِيبًا ۝ ﴾

(١٧/ الاسراء:٤٩-٥١)

''کیاجب ہم گل سڑجائیں گے کیا ہم نئی پیدائش میں اٹھائے جائیں گے؟ کہہ دیجیے!ہوجاؤ پتھر یالوہا یاکوئی ایسی مخلوق جوتمہارے دلوں میں بڑی معلوم ہوتی ہو۔تووہ عنقریب کہیں گے کہ کون ہمیں لوٹائے گا؟ کہہ دیجیے! جس نے تمہیں پہلی بارپیدا کیا ہے۔پھروہ اپنے

سروں کوتمہاری طرف جھکاتے ہوئے ہلائیں گے اور کہیں گے وہ کب ہے۔کہہ دیجیے عنقریب وہ برپاہونے والی ہے۔‘‘

ان آیات میں مخالفین کے ہرقسم کے شبہات کا جواب دیدیا گیاہے مثلاًاگرتم یہ کہتے ہو کہ ہماراکوئی خالق ومالک نہیں ہے۔توتم ایسی مخلوق کیوں نہ بن گئے کہ تمہیں تکلیف اورتھکان نہ پہنچتی ؟جیسے:پتھر،لوہایاان سے بھی بڑی چیز۔لیکن اگرتم یہ جانتے ہوکہ ہماراایک خالق اوررب ہے۔جس نے ہمیں ایسی صفت زندگی بخشی جو ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے توپھر دوسری زندگی کاانکار کرنے کی جرأت تمہیں کیسے ہوگئی۔

اس دلیل کو دوسرے انداز میں اس طرح بھی بیان کیاجاسکتاہے کہ اگرتم پتھر،لوہایاان سے بھی سخت مخلوق ہوتے تب بھی اللہ تعالیٰ تمہیں فنا اورایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل کرسکتاتھا۔لوہا اورپتھر اپنی سختی اورمضبوطی میں مشہور ہیں لیکن پھربھی اللہ تعالیٰ ان کے فنا کرنے اوربدل ڈالنے پرقادر ہے توگوشت پوست اورہڈیوں کے ڈھانچے کو برباد کرنے اوردوبارہ زندگی بخشنے پرکیوں نہیں قادر ہوسکتا۔

ان کاایک سوال یہ بھی تھا:

﴿مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ﴾ (۱۷/ الاسراء: ۵۱) ’’ہمیں دوبارہ کون پیدا کرے گا؟‘‘

اس کاجواب دیا:

﴿قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ﴾ (۱۷/ الاسراء: ۵۱)

’’کہہ دیجیے وہ جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا۔‘‘

جب اس کاکوئی جواب بن نہ پڑاتوبات ٹالنے کے لیے پوچھتے ہیں۔

﴿مَتٰى هُوَ ۭ﴾ (۱۷/ الاسراء: ۵۱) ’’کب ہے وہ (قیامت)۔‘‘

اس قسم کا طریق کاران لوگوں کاہوتاہے جودلیل سے لاجواب ہوکرادھراُدھر کے سوالوں سے اصل مقصد سے گریز کرناچاہتے ہیں۔

﴿ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۝ ﴾

(۷۵/ القیامۃ:۳۶۔۴۰)

''کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ وہ بے کار چھوڑ دیا جائے گا۔کیا وہ بہائی ہوئی منی میں سے ایک نطفہ نہ تھا؟پھر وہ ہوگیا لوتھڑا، پھر اسے بنایا اور برابر کیا، پھر اس سے جوڑا، نر اور مادہ پیدا کیے،تو کیا وہ مردوں کے زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی حکمت اس بات سے پاک ہے کہ انسان امر ونہی اور ثواب و عقاب کی ذمہ داریوں سے بالکل سبکدوش ہو،اس کی مصلحت وقدرت کے یہ یکسر خلاف ہے کہ جس ہستی نے حقیر قطرہ کو خون بستہ بنایا، پھر گوشت کا لوتھڑا بنایا پھر پیدا کیا اور اسے کان، آنکھ،حواس،قوی اعصاب،رباطات (رگ پٹھوں اور ریشوں) سے نوازا۔اور پائیدار ساخت اور بناوٹ بخشی اور بہترین صورت وشکل سے سجایا۔ بھلا وہ کیسے دوبارہ زندہ کرنے سے قاصر رہ سکتا ہے یا اس کی حکمت وشفقت کا یہ کیسے تقاضا ہوسکتا ہے کہ انسان کو بے کار ومعطل چھوڑ دیا جائے۔ [1]

[1] مختصر الصواعق ۱/ ۶۶-۶۹۔

دُعا کے آداب واقسام

تفسیر: ﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۚ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ﴾ (۷/ الاعراف:۵۵۔۵۶)

''اپنے رب کو عاجزی کے ساتھ اور پوشیدہ طور پر پکارو۔بے شک وہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔زمین کی اصلاح کے بعد اس میں فساد برپانہ کرواور اسے اُمیدوخوف کے ساتھ پکارو۔بے شک اللہ کی رحمت نیک کاروں سے قریب ہے۔''

دُعائے سوال اوردُعائے عبادت

یہ دونوں آیتیں دُعا کے آداب بتلارہی ہیں۔دُعا کی دوقسمیں ہیں:

دعائے عبادت اوردُعائے سوال۔قرآن میں کہیں تو یہ دونوں اقسام یکجا مراد ہوتی ہیں اورکہیں دونوں سے ایک۔ان دونوں اقسام کاباہمی تعلق لازم وملزوم کی طرح ہے۔اس لیے کہ دعائے سوال کے معنی ہیں،نافع چیز کی طلب اورمضرت رساں شے کے ازالہ کی استدعا۔اب جونفع اورنقصان کامالک ہو،وہی معبود کہلانے کاحق دار ہے اور معبود کے لیے ضروری ہے کہ وہ نفع ونقصان پہنچانے پر پوری طرح قادر ہو۔

اسی اصول کے تحت قرآن میں اُن لوگوں کو ڈانٹا گیا ہے جواللہ کے سوا ایسی ہستیوں کو پوجتے ہیں جونفع ونقصان کی مالک نہیں ہیں۔فرمایا:

﴿ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ﴾

(۱۰/ یونس:۱۸)

''اللہ کے سوااُن کی عبادت کرتے ہیں جونفع ونقصان کے مالک نہیں ہیں۔''

اس مضمون کی قرآن میں بہت سی آیتیں ہیں۔اس بیان سے صاف ظاہر ہوگیا کہ نفع ونقصان محدود ہو یا غیر محدود،ان کا مالک سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ایسے ہی معبود کو نفع ونقصان کے موقع پر پکارا جاسکتا ہے اس کا نام ہے دعائے سوال۔ایسے ہی معبود کے دربار میں اُمید وخوف کے ساتھ دعا کی جاسکتی ہے، اسی کو دعاءُ العبادۃ کہتے ہیں۔

ہر دعائے عبادت دعائے سوال کو اور ہر دعائے سوال دعائے عبادت کو شامل ہے۔ذیل کی چند آیات میں یہ دونوں اقسام مُراد ہیں:

① ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۶)

”جب اے نبی ﷺ!میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو ان سے کہہ دو کہ میں نزدیک ہوں۔پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں۔جب کہ وہ مجھے پکارتا ہے۔“

یہاں دعا کی دونوں قسمیں مراد ہیں اس لیے اس آیت کی تفسیر دو طرح کی گئی ہے:

① أُعْطِيْهِ إِذَا سَأَلَنِیْ ”میں دیتا ہوں جب کہ بندہ مجھ سے مانگتا ہے۔“

② أُثِيْبُ إِذَا عَبَدَنِیْ ”میں اُسے ثواب عطا کرتا ہوں جب وہ میری عبادت کرتا ہے۔“

یہ دونوں قول آپس میں لازم وملزوم ہیں۔یہاں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ایک لفظ مشترک دو معنوں میں مستعمل ہے یا ایک معنی حقیقی ہیں اور دوسرا مجازی۔بلکہ دونوں معنی ایک ہی حقیقت کی دو شاخیں ہیں جس طرح :

﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل:۷۸)

”نماز کو قائم کریں آفتاب کے ڈھلنے سے لے کر رات کی تاریکی تک۔“

دَلوك کے اصل معنی سورج کے ڈھلنے اورڈوبنے کے کیے گئے ہیں۔ یہ دومعنی نہیں ہیں بلکہ ایک معنی کی دوصورتیں ہیں۔دَلوك کے اصل معنی مائل ہونے کے ہیں۔ اب اس میلان کی ابتدا سورج کے ڈھلنے اورانتہا سورج کے ڈوبنے پر ہوتی ہے۔

② ﴿قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ﴾ (۲۵/ الفرقان:۷۷)

''کہہ دیجیے میرے رب کوتمہاری کیاپروا ہے اگرتمہاری دعا نہ ہو۔''

یہاں دُعائے سوال اوردُعائے عبادت دونوں مُراد ہیں۔

③ ﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (۴۰/ المؤمن:۶۰)

''اورکہا تمہارے رب نے مجھے پکارومیں قبول کروں گا۔''

یہاں بھی دونوں قسمیں مراد ہیں لیکن دعائے عبادت مراد لیناز یادہ مناسب ہے۔چونکہ اس کے بعد ہی فرمایا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ﴾

(۴۰/ المومن:۶۰)

''بے شک جولوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں وہ ذلیل ہوکرجہنم میں داخل ہوں گے۔''

نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((الدعاء هو العبادة)) ''دعائے عبادت ہی کا نام ہے۔''

پھرآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مذکورہ بالا آیت ﴿وقال ربکم ادعونی استجب لکم......﴾ تلاوت فرمائی۔ [1]

قرآن کی جن آیات میں مشرکین کی دعاؤں کاذکر ہے ان سے مراد دعائے عبادت ہے جودعائے سوال کوبھی شامل ہے۔مثلاً فرمایا:

① ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ

[1] سنن الترمذی ۵/ ۲۱۱ (۲۹۶۹) تفسیر القرآن: باب ومن سورۃ البقرۃ۔

دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ﴾ (۲۲/ الحج: ۷۳)

''اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے غور سے سنو، بے شک جن کو تم ایک اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اگرچہ وہ سارے کیوں نہ جمع ہو جائیں۔''

② ﴿ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَدْعُوْنَ مِنْ قَبْلُ ﴾ (۴۱/ حٰمٓ السجدۃ: ۴۷)

''یعنی قیامت کے روز جن کو وہ دنیا میں پکارتے تھے ذرا بھی کام نہ آئیں گے۔''

اس قسم کی آیت میں دعائے عبادت کے معنی تین وجوہ کی بنا پر زیادہ ظاہر ہیں:

① مشرکین نے اس دعا کو خود ہی عبادت قرار دیا ہے، جیسا کہ دوسری جگہ ہے:

﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ (۳۹/ الزمر: ۳)

''ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ سے قریب کریں۔''

② اللہ تعالیٰ نے اس دعا کی تفسیر عبادت کے ساتھ خود ہی فرما دی ہے:

﴿ وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ ﴾ (۲۶/ الشعراء: ۹۲-۹۳)

''اُن سے کہا جائے گا کہاں ہیں وہ جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے تھے کیا وہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں یا انتقام لے سکتے ہیں؟''

﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ﴾ (۲۱/ الانبیاء: ۹۸)

''بے شک تم اور جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو جہنم کا ایندھن ہیں۔''

﴿ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ ﴾ (۱۰۹/ الکفرون: ۱-۲)

''آپ کہہ دیجیے کہ اے کافرو! میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی

تم عبادت کرتے ہو۔"

اس نوع کی آیتیں قرآن میں بہت سی ہیں۔مشرکین کا اپنے معبودانِ باطل کو پکارنا ان کی عبادت کے ہم معنی ہے۔

③ مشرکین اپنے بتوں کو پوجا کرتے تھے اوراُن کے ذریعہ اللہ سے نزدیکی چاہتے تھے لیکن مصائب وتکالیف کے موقع پران سب کوچھوڑ چھاڑ کرایک اللہ ہی کو پکارتے تھے، لیکن اس کے باوجود اپنی کچھ ضرورتیں ان سے بھی طلب کرلیا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے یہاں دعائے عبادت کے ساتھ ساتھ دعائے سوال کا پہلو بھی نکل آیا۔

﴿ فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ (٤٠/ المومن: ١٤)

"اللہ کو پکارو!اس کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے۔"

یہاں دعائے عبادت مراد ہے یعنی اس کی عبادت کرو۔اُس میں کسی دوسرے کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول ہے:

﴿ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴾ (١٤/ ابراهيم: ٣٩)

"بے شک میرا رب دعا کو سننے والا ہے۔"

یہاں سمع سے عام سننا مرادنہیں بلکہ سننا مراد ہے، جس سے قبولیت دعا کا اثر ظاہر ہو۔کیونکہ یوں تو وہ ہرقول کو سنتا اور جانتا ہے۔پس اس بنا پر یہاں دعائے عبادت اوردعائے سوال دونوں مراد ہوں گی۔پہلی صورت میں سمع سے حمدوثنا پرثواب عطا فرمانا اوردوسری صورت میں سوال کو پورا کرنا مراد ہوگا۔

حضرت زکریا علیہ السلام کے قول:

﴿ وَلَمْ اَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ﴾ (١٩/ مريم: ٤)

"اے رب! کہیں دعا کے ساتھ ناکام وبدبخت نہ رہ جاؤں۔"

میں بعض کے نزدیک دعا سے دعائے سوال مراد ہے، معنی یہ ہوئے کہ

تو نے مجھے قبولیت دعا اور کامیابی سے باربار نواز کر اس کا عادی بنا دیا ہے۔اب میری پکار کورد کر کے مجھے ناکام و بدنصیب مت ٹھہرا۔یہاں اللہ تعالیٰ کے گزشتہ احسانات کو قبولیت دعا کے لیے وسیلہ بنایا گیا ہے۔

قرآن کا سیاق وسباق بھی اسی مفہوم کی تائید کررہا ہے۔یہ جملہ حضرت زکریاعلیہ السلام نے طلبِ اولاد کی دعا سے پہلے فرمایا ہے، تاکہ یہ ظاہر کرسکیں کہ جس طرح تو نے پہلے اپنے رحم وکرم سے مالامال کیا ہے اب بھی اولاد کی نعمت سے محروم نہ رکھ۔

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۚ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۱۱۰)

”کہہ دو! اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو جونسا نام لے کر پکارو کوئی حرج نہیں کیونکہ اس کے لیے اچھے نام ہیں۔“

یہاں دعا سے سوال مراد ہے اس آیت کے شانِ نزول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

شان نزول

رسول اللہ ﷺ ”یارحمن“”یارحیم“پکارا کرتے تھے۔مشرکین نے اعتراض کیا کہ ”محمد ﷺ! تو توحید کا اعلان کرتا ہے اور خود کئی معبودوں کو پکارتا ہے۔“ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔ [1]

زمخشری کے نزدیک یہاں دعا سے تسمیہ (نام رکھنا یا نام لینا) مراد ہے۔یعنی اس کا کوئی سانام لو،اس کے سب نام خوبی والے ہیں۔لیکن یہاں دراصل دعا سے دعائے سوال اور دعائے ثنا ہی مراد ہیں۔ضمناً تسمیہ کے معنی بھی مراد ہوسکتے ہیں۔اس طرح قرآن کے عام انداز بیان سے مطابقت باقی رہے گی۔

﴿اِنَّا کُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِیْمُ ﴾ (۵۲/ الطور: ۲۸)

---

[1] ابن کثیر ۳/ ۶۸۔

"بے شک ہم پہلے اسے پکارا کرتے تھے۔بلاشبہ وہ نہایت شفیق اور مہربان ہے۔"

یہاں دعائے عبادت مراد ہے جو دعائے سوال کو ضمناً شامل ہے۔یعنی ہم پہلے خالص طور پر اس کی عبادت کرتے تھے اوراسی وجہ سے ہم گرم لپٹ کے عذاب سے نجات پا گئے۔یہاں محض دعائے سوال مراد نہیں کیونکہ سوال نجات پانے والے اورنہ پانے والے سب ہی کرتے ہیں۔فرمایا:

﴿يَسْئَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۵۵/ الرحمن:۲۹)

"سوال کرتے ہیں جو آسمان وزمین میں ہیں۔لیکن کامیابی ونجات ان کے لیے ہے جوصرف اپنے رب کے لیے مخلص عابد بن جاتے ہیں۔"

یہی معنی اصحاب کہف کے اس قول کے ہیں۔

﴿رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا﴾

(۱۸/ الکهف:۱٤)

"ہمارا رب زمین وآسمان کا رب ہے،ہم اس کے سوا کسی اورالٰہ کو نہیں پکارتے۔"

یہاں بھی دعائے عبادت مراد ہے۔

﴿اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ﴾ (۳۷/ الصفت: ۱۲۵)

"کیا تم بعل (بت) کو پکارتے ہو اور احسن الخالقین کو چھوڑتے ہو!"

اس میں بھی دعا بمعنی عبادت ہے لیکن حسب ذیل آیت میں دعائے سوال مراد ہے:

﴿وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَرَاَوُا الْعَذَابَ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ﴾ (۲۸/ القصص:٦٤)

"اور کہا جائے گا پکارو اپنے شرکاء کو! پس وہ ان کو پکاریں گے لیکن وہ

جواب نہ دے سکیں گے اور وہ عذاب کو دیکھ لیں گے۔(اور کہیں گے) کاش وہ ہدایت پا جاتے۔"

یہاں دعائے سوال اس لیے مراد ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مشرکین کو دکھلا کر کہ تمہارے خود ساختہ معبود پکار نہیں سنتے ہیں،ان کو رسوا وذلیل کرے گا۔یہاں ادعو کے معنی اعبدوا نہیں ہوسکتے اور اسی کی نظیر یہ آیت ہے:

﴿وَيَوْمَ يَقُولُ نَادُوا شُرَكَآءِيَ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ﴾ (۱۸/ الکھف: ۵۲)

"اور جس دن وہ فرمائے گا کہ تمہارے خیال میں جو میرے شریک تھے انہیں پکارو! یہ پکاریں گے لیکن اُن میں سے کوئی بھی جواب نہ دے گا۔"

دعا کے جو کچھ معنی اُوپر بیان کیے گئے ہیں اس کی روشنی میں صلوٰۃ کے معنی بھی واضح ہوجاتے ہیں۔یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ لغت میں اس کے معنی دعا کے ہیں اور شریعت میں اس کے معنی نماز کے ہیں۔اوراب صلوٰۃ کا استعمال حقیقت شرعیہ منقولہ میں ہورہا ہے۔یایوں کہا جائے کہ دعا اس کا حقیقی مفہوم ہے اور نماز مجازی۔

سابق بیان سے ثابت ہوگیا کہ دعا کی دو قسمیں ہیں:دعائے عبادت اور دعائے سوال۔نماز کے تمام ارکان،آداب اوراذکار انہی دو پر مشتمل ہیں۔لہٰذا لفظ صلوٰۃ بمعنی نماز اپنے حقیقی مفہوم سے الگ نہیں ہے۔

ان مطالب کو ذہن نشین کرلینے کے بعد زیربحث آیت﴿ادعوا ربکم تضرعا وخفية﴾ پرغور کریں۔یہ آیت دعا کی دونوں قسموں کو شامل ہے۔اس طرح کہ بظاہر دعائے سوال اور ضمنی طور پر دعائے عبادت مراد ہے اسی بنا پر آہستہ کہنے کا حکم فرمایا ہے۔

سری دُعا کے فوائد

حسن رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ سرّی دعا اور جہری دعا کے درمیان ستر گنا فرق ہے۔اسی بنا پر مسلمان عام طور پر اس خاموشی سے دعا کیا کرتے تھے کہ سوائے اللہ کے کسی کو علم تک نہ ہوتا تھا۔حضرت زکریا علیہ السلام کی سرّی دعا کو اللہ تعالیٰ نے مقام مدح میں ذکر فرمایا ہے:

﴿ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ﴾ (۱۹/ مریم:۳)

''جب کہ پکارا اُس نے اپنے رب کو پوشیدہ پکارنا''

سرّی (پوشیدہ، آہستہ) دعا میں چند فوائد ہیں:

① دعا کا یہ طریقہ ایمان اور یقین کی پختگی کو بتلاتا ہے کیونکہ داعی یہ ایمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پوشیدہ دعا کو بھی سنتا ہے۔

② ادب و تعظیم کے زیادہ مناسب ہے۔دنیا میں بادشاہوں اور حاکموں سے گفتگو کرتے ہوئے ضرورت سے زیادہ بلند آواز کرنا گستاخی اور خلافِ ادب قرار دیا جاتا ہے۔تو پھر وہ اللہ جو ہلکی سے ہلکی آواز سن لیتا ہے اس کے حضور میں تو سری دعا اور زیادہ مناسب ہوگی۔

③ یہ صورت خشوع، عاجزی اور گریہ زاری کے زیادہ مناسب ہے۔یہی ادا دعا کی روح اور مغز ہے۔ایسے موقع پر داعی کا حال اس مسکین عاجز کا سا ہوتا ہے جس کا دل ٹوٹ چکا ہے، اعضا ڈھیلے پڑ چکے ہیں اور آواز پست ہوگئی ہے۔یہاں تک کہ عاجزی اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ زبان کو گویائی کی طاقت نہیں ہے۔اب حال یہ ہے کہ دل آہ وزاری کے ساتھ طالب وداعی ہے اور زبان اپنی انتہائی مسکینی، محتاجی اور عاجزی کی بنا پر خاموش ہے۔یہ (رقت انگیز) منظر آواز بلند کرنے کی صورت میں حاصل نہیں ہوسکتا۔

④ اس صورت میں اخلاص پوری طرح حاصل ہوتا ہے۔

⑤ یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ بندہ اپنے معبود سے راز و نیاز کا موقع پاتا ہے۔ ا

⑥ بلند آوازی سے یکسوئی اور جمعیت خاطر پراگندہ ہوجاتی ہے۔جس قدر پست ہوگی اُسی قدر اللہ کی طرف تعلق، لگاؤ اور توجہ زیادہ ہو گی۔

⑦ پست آواز میں ایک لطیف نکتہ یہ بھی ہے کہ بندہ اللہ سے نہایت قریب معلوم ہوتا ہے۔ گویا وہ اس طرح سرگوشی کر رہا ہے جس طرح ایک قریبی دوست اپنے پاس والے دوست سے کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کی مدح فرمائی ہے۔

﴿ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ﴾ (۱۹/ مریم :۳)

بندہ جس قدر حضورِ قلب کے ساتھ اللہ کو پکارے گا،اسی قدر اس کا قرب حاصل ہوگا۔جب یہ تصور دل میں جم جائے گا کہ وہ ہر قریب سے بھی زیادہ نزدیک ہے۔تو نہایت رازداری سے اپنی درخواست اس کے دربار میں پیش کرے گا اور جہر(بلند آوازی) کو ایسے موقع پر پسند نہ کرے گا۔جیسا کہ قریبی ہم نشین اگر پست آواز سن لیتا ہے تو اس سے بلند آواز سے گفتگو کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔

اسی کی تائید حدیث سے بھی ہوتی ہے جب کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک مرتبہ سفر میں بلند آواز سے تکبیریں کہنا شروع کر دیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِرْبَعُوْا عَلٰی اَنْفُسِکُمْ)) [1]

”اپنی جانوں سے نرمی برتو۔تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکار رہے ہو۔وہ سننے والا بہت ہی نزدیک ہے جتنی تمہاری سواری کی گردن تم سے قریب ہے۔اس سے کہیں زیادہ وہ تم سے قریب ہے۔“

قرآن عزیز میں ہے:

﴿ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۶)

”جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے سوال کریں تو

[1] صحیح البخاری ۳/ ۱۰۹۱ (۲۸۳۰) الجهاد: باب مایکره من رفع الصوت فی التکبیر۔

آپ کہہ دیں کہ میں بہت ہی قریب ہوں ہر پکارنے والے کی پکار کو جب بھی وہ مجھے پکارے ، قبول کرتا ہوں۔"

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا کہ ہمارا معبود قریب ہے کہ ہم اُس سے سرگوشی کریں یا دُور ہے کہ ہم اُسے زور سے پکاریں۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی [1] اس سوال وجواب سے بھی یہی ظاہر ہوا کہ سری دعا اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے۔

یہاں قریب سے ایک خاص قسم کی نزدیکی مراد ہے،عام قرب نہیں۔اللہ تعالیٰ دعا کرنے والے سے بھی قریب ہے اورعبادت کرنے والے سے بھی اور سب سے نزدیکی بندہ کو سجدہ کی حالت میں حاصل ہوتی ہے۔یہ قُرب عبادت، قرب انابت (توجہ) اورقرب اجابت (قبولیت) سے بھی زیادہ خاص ہوتا ہے۔یہ وہ قرب ہے جس کو متکلمین ثابت نہ کر سکے۔عابد سے یہ رب کا خاص قسم کا قرب ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے:

((من تقرب إلى شبرا تقربت اليه ذراعا و من تقرب إلى ذراعا تقربت إليه باعا)) [2]

"جو مجھ سے ایک بالشت نزدیک ہوتا ہے میں اُس سے ایک ہاتھ قریب ہوجاتا ہوں۔جو مجھ سے ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے میں اُس سے دوہاتھ نزدیک ہوجاتا ہوں۔"

اس روایت میں عابد سے قرب کو بیان کیا گیا ہے۔ سائل سے قرب کو ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۶) اور ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً﴾ (۷/ الاعراف:۵۵) میں ذکر کیا گیا ہے۔

⑧ سری (خاموش) دعا کی صورت میں سوال وطلب کا سلسلہ عرصہ دراز تک جاری رہ سکتا ہے۔نہ زبان تھکتی ہے اورنہ اعضا پر بوجھ پڑتا ہے۔جہراًاور بلند آواز کی

[1] ابن کثیر:۱/ ۲۱۸ [2] مسند احمد:۲/ ۴۱۳، ۳/ ۴۰

صورت میں زبان اور اعضا جلد ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔اس کی مثال اس طرح ہے جیسے کوئی شخص بلند آواز سے پڑھے اور چلاّ چلاّ کر الفاظ ادا کرے تو وہ جلد ہی تھک جاتا ہے۔بخلاف آہستہ پڑھنے والے کے وہ اپنا عمل دیر تک جاری رکھ سکتا ہے۔

⑨ پست آواز کی صورت میں شیطانی وسواس،موانع اور رکاوٹوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔کیونکہ اس طرح شیاطین اِنس وجن اس کے طرزِ عمل سے بے علم رہیں گے اور اپنے فتنے پھیلانے کا موقعہ نہ پاسکیں گے۔جن لوگوں کو اس بات کا تجربہ ہے وہ اس فائدے سے انکار نہیں کر سکتے۔

⑩ اللہ کی سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ بندہ کو اللہ کی طرف پوری یکسوئی اور کامل توجہ کا موقع حاصل ہو۔اس سے بڑھ کر نعمت اور کیا ہو سکتی ہے۔جب ہر نعمت خواہ چھوٹی ہو یا بڑی،حاسد کی نگاہ سے نہیں بچ سکتی تو اس اعلیٰ نعمت پر حاسدوں کا پیدا ہو جانا کچھ مشکل نہیں۔ایسی صورت میں حاسد کی شربار نگاہ سے محفوظ رکھنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ نعمت کو پوشیدہ رکھا جائے۔اس کا اظہار نہ کیا جائے۔

اسی بنا پر حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا تھا:

﴿لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا﴾

(۱۲/ یوسف:۵)

''اپنا خواب اپنے بھائیوں سے نہ کہنا ورنہ وہ کوئی چال چلیں گے۔''

کتنے ہی ایسے صاف دل پارسا گزرے ہیں جو اپنی اس نعمت کو ظاہر کر کے اطمینان قلب کی دولت سے محروم ہو گئے۔اس لیے صالحین کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق کی بنا پر جو حالات ان پر ظاہر ہوں انہیں پوشیدہ ہی رکھیں۔ خصوصاً مبتدی سالک کا تو ان ہدایات پر عمل کرنا نہایت ضروری ہے۔ہاں جن لوگوں میں یہ ربانی کیفیت پوری طرح راسخ اور جم جائے اور اُن کو تیز وتند ہواؤں سے اس پاکیزہ درخت کی مضبوط جڑوں کے اُکھڑنے کا اندیشہ نہ رہے تو پھر عوام کی پیروی اور اتباع کے لیے اس حالت کے ظاہر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بہر حال جب دعا طلب، ثنا، محبت اور توجہ الی اللہ جیسے عظیم الشان خزانوں پر مشتمل ہے تو حاسدوں کی نگاہوں سے بچانے کے لیے اس کو پوشیدہ طور پر ہی ادا کرنا زیادہ مناسب ہے۔

دعا اور ذکر کا تعلق

دعا کو ذکر بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں طلب وسوال کے ساتھ حمد وثنا بھی ہوتی ہے، ربانی اوصاف واسماء کا بیان بھی ہوتا ہے۔ جس طرح کہ ذکر کو دعا کہا جاتا ہے، ضمناً ذکر بھی دعا کو شامل ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے:

((اَفْضَلُ الدُّعَاءِ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ)) [1] ''بہترین دعا الحمد للہ ہے۔''

حالانکہ الحمدللہ محض حمد ہے، بظاہر سوال وطلب کی اس میں کوئی آمیزش معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن اس کو دعا اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ معنوی طور پر محبت اور ثنا کو شامل ہے اور محبت طلب محبوب کی اعلیٰ (بلند ترین) انواع میں سے ہے۔ پس حمد کرنے والا اپنے محبوب کا طالب ہوتا ہے۔ یہ ذاکر، طالبِ حاجت سائل سے اس بات کی کہیں زیادہ حق دار ہے کہ اس کو داعی کہا جائے۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ذاکر ضمناً سائل ہی ہوتا ہے اگرچہ وہ صراحتاً سوال نہیں کرتا ہے بلکہ اصل بات وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے کہ نفس حمد، سوال وطلب کو شامل ہے اور یہ طلب کوئی معمولی نہیں ہے بلکہ بڑے محبّ کی طلب ہے۔ اس لیے حمد وثنا کو دعا قرار دینا زیادہ مناسب ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ذکر ودعا دونوں آپس میں ایک دوسرے کو شامل ہیں۔

حسبِ ذیل آیت سے اس قول کی تائید ہوتی ہے، فرمایا:

﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ﴾

(۷/ الاعراف: ۲۰۵)

''اپنے رب کو یاد کر دل میں گڑگڑا کر اور ڈر کر بغیر آواز بلند کیے۔''

---

[1] سنن الترمذی ۵/ ٤٦٢ (۳۳۸۳) الدعوات: باب ماجاء أن دعوة المسلم مستجابة۔

اس آیت کے ساتھ زیر تفسیر آیت ﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ﴾ (۷/ الاعراف: ۵۵) میں بھی غور کریں۔دونوں کے انداز بیان میں جو فرق ہے وہ بھی حکمت ولطافت سے خالی نہیں۔دونوں آیتوں میں دعا وذکر کے ساتھ تضرُّع (گڑگڑانے) کا حکم دیا ہے۔ یہ تَضرُّع ذکر ودعا کی اصل روح ہے،اس کے بغیر یہ دونوں جسدِ بے جان کی حیثیت رکھتے ہیں۔دعا کے ساتھ خفیہ(پوشیدہ) کی قید اِن مصالح وفوائد کی بنا پر لگائی گئی ہے جو اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ذکر کے حکم میں خیفہ (ڈر) کو بیان کیا ہے کیونکہ ذکر بلا خوف الٰہی کچھ وزن نہیں رکھتا،ذکر محبت الٰہی کو بڑھاتا ہے۔جو جس قدر اللہ کا ذکر کرے گا،اسی قدر باغ محبت میں بہار آئے گی۔لیکن محبت کے ساتھ خوف نہ ہو تو یہ جذبہ حُب کو فائدہ کے بجائے نقصان پہنچاتا ہے۔ناز وانداز کا مادہ بڑھ جاتا ہے اور شریعت سے بے پرواہی ہو جاتی ہے۔ اکثر فریب خوردہ جاہل اس جال میں پھنس کر احکامِ الٰہیہ سے اپنے آپ کو سبکدوش سمجھنے لگتے ہیں۔شریعت کی پابندی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے یہ بہانہ پیش کردیتے ہیں کہ عبادات سے مقصد تو قلبی عبادت، توجہ الیٰ اللہ اور محبت الٰہیہ ہے۔اس مقصود کے حاصل کرنے کے بعد وسائل وذرائع میں اُلجھے رہنا کون سی عقلمندی ہے۔

یہ اعتقادِ عمل کا فساد صرف اس لیے پیدا ہوا ہے کہ محبت کی حلاوت کے ساتھ خوف کی چاشنی ملی ہوئی نہیں ہے۔اسی لیے بعض سلف کا قول ہے کہ جس نے محض محبت کی بنا پر اللہ کی عبادت کی وہ زندیق وملحد ہے اور جس نے صرف خوف کو مدنظر رکھا وہ حروری (خوارج کا ایک فرقہ) ہے اور جس نے اُمید ہی کو سہارا بنالیا وہ مرجیہ (ایک فرقہ کا نام) ہے اور جس نے محبت وخوف اور اُمید کے ساتھ اللہ کی عبادت کی وہ مومن ہے یہ تینوں باتیں اس آیت میں یکجا بیان ہوئی ہیں:

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۵۷)

”یہی لوگ ہیں جو اللہ کو پکارتے ہیں اپنے رب کی طرف وسیلہ تلاش
کرتے ہوئے کہ کون ان میں سے زیادہ (اللہ کے) قریب ہے
اوراس کی رحمت کی امید رکھتے ہوئے اوراُس کے عذاب سے
ڈرتے ہوئے۔“

وسیلہ سے مراد وہ محبت ہے جو قربِ الٰہی پر ابھارتی ہو۔اس کے بعد پھر اُمید وخوف کو بیان کیا گیا ہے اللہ کے صالحین بندوں کا طریقہ یہی رہا ہے۔بارہا ایسا ہوا ہے کہ صرف محبت کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنے والے بہت سے محرّمات کو حلال کر بیٹھے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ محبت کو گناہ نقصان نہیں پہنچا سکتا اور اس بارے میں ایک مَن گھڑت روایت بھی پیش کر دیتے ہیں:

”جب اللہ بندے کو چاہتا ہے تو اسے گناہ ضرر نہیں پہنچا سکتا۔“

یہ روایت قطعاً اسلام کے منافی ہے۔ یہ گناہ اسی طرح مضر ہے جس طرح انسان کے لیے زہر، یہ کلام کسی شیخ کا تو ہو سکتا ہے لیکن آنحضرت ﷺ کی ذات اس سے قطعا بری ہے۔

کسی شیخ یا بزرگ کا قول ماننے کی صورت میں اس کے یہ معنی ہوں گے کہ بندے میں جب اللہ کی محبت سما جاتی ہے تو پھر وہ گناہ پر اصرار نہیں کر سکتا بلکہ فوراً توبہ اور آہ وزاری کر کے معصیت کا داغ اپنے دل سے مٹا دیتا ہے۔مقصود یہ ہے کہ بلاخوف ذکر ومحبت سبب ہلاکت ہیں اور خوف کے ساتھ راہ حق پر چلنا آسان ہو جاتا ہے۔یوں سمجھنا چاہیے کہ اس دنیا کے سفر میں خوف بمنزلہ کوڑے کے ہے اور اُمید حدی خواں کی حیثیت رکھتی ہے۔اس سے سفر کی مشقتیں بآسانی برداشت ہو جاتی ہیں۔محبت راہ نما کے درجہ میں ہے جو سواری کی نکیل تھامے ہوئے ہے۔اگر سوار کے پاس سواری کے قابو رکھنے کے لیے کوڑا نہ ہو،تو سیدھی راہ سے ہٹنے اور پگڈنڈیوں پر پہنچ جانے کا اندیشہ ہے۔ اس خوف کے کوڑے کے بغیر حدود الٰہیہ کی حفاظت ناممکن اور گمراہی یقینی ہے۔خوف ورجا اور محبت سے جو دل بھی خالی ہو گا اس کی درستگی کی کبھی بھی اُمید نہیں کی جا سکتی اور جس قدر یہ صفات کمزور ہوں گی،اسی

قدر ایمان میں ضعف آئے گا۔ ان آیات میں غور کرنے سے قرآنی انداز بیان کی عجیب لطافت وحکمت معلوم ہوتی ہے۔ خوف اور ذکر کو یکجا بیان کیا ہے ساتھ ہی فی نفسك کہہ کر سری ذکر کی طرف بھی اشارہ کردیا ہے۔ اسی طرح دعا کے ساتھ "خفیة" لایا گیا ہے لیکن متصلاً ﴿وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا﴾ (۷/ الاعراف:۵٦) "پکارو اس کو اُمید وخوف کے ساتھ" فرما دیا ہے۔

غرضیکہ دونوں آیتیں خفیۃ، خوف اور تضرّع تینوں صفات کو کامل طور پر شامل ہیں۔ دعا کے موقع پر طمع واُمید کو بیان کرنا حکمت سے خالی نہیں۔ دعا میں جب تک اُمید اور لالچ کی آمیزش نہ ہو دل میں مطلوب کے لیے تڑپ اور لگن پیدا ہی نہیں ہوسکتی۔ ذکر کے ساتھ خوف ہونا ضروری ہے کیونکہ خائف (ڈرنے والا) ہی اس کا زیادہ محتاج ہوتا ہے۔

دُعا میں اعتداء کی ممانعت

﴿اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾ (۷/ الأعراف :۵۵)

"بے شک وہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

بعض کا خیال ہے کہ یہاں دعا میں حد سے بڑھنا مراد ہے۔ یعنی دعا میں ایسی چیزیں طلب کرنا جن کا داعی اہل نہیں ہے۔ مثلاً انبیائے کرام کے درجات و مراتب۔ ابوداوٗد کی روایت ہے کہ عبداللہ بن مغفل نے اپنے بیٹے کو کہتے ہوئے سنا:

"اے اللہ! میں تجھ سے جنت کے دائیں جانب سفید محل کا طالب ہوں جب میں اس میں داخل ہوں گا۔"

عبداللہ نے کہا اے بیٹے! بس اللہ سے جنت طلب کرو اور جہنم سے پناہ مانگو۔ اس لیے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔

"میری اُمت میں ایسے لوگ ہوں گے جو طہارت اور دعا میں حد سے بڑھ جائیں گے۔" [1]

---

[1] سنن ابوداود ۱/ ۷۳ (۹٦) الطهارة: باب الإسراف فی الماء؛ سنن ابن ماجه ۲/ ۴۳۹ الدعاء: باب کراهیة الإعتداء فی الدعاء؛ مسند احمد ٤/ ۸۷، علامہ البانی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، إرواء الغلیل ۱/ ۱۷۱۔

دعا میں حد سے بڑھ جانے کی چند صورتیں ہیں:

① حرام کاموں پر مدد کی خواہش۔

② اللہ سے ایسی آرزو کرنا جو وہ پوری نہیں کرتا۔مثلاً قیامت تک کی زندگی پانا، بشری ضرورت کھانے پینے سے بے نیازی حاصل ہوجانا،یا یہ سوال کرنا کہ مجھے بلاشادی بیاہ کے اولاد حاصل ہوجائے یا کہ علم غیب پر واقف ہو یا گناہوں سے محفوظ ومعصوم ہوجانا۔اس قسم کے تمام سوالات جو اللہ تعالیٰ کی حکمت،شریعت اور اس کی دی ہوئی خبروں کے خلاف ہوں ،اعتداء میں داخل ہیں۔ان سے بچنا ضروری ہے۔

③ ابن جریج نے کہا ہے کہ چلا چلا کر دعا کرنا بھی اعتداء ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ اعتداء(حد سے بڑھنا)یہاں عام ہے،خواہ دعا میں ہو یا کسی دوسرے کام میں بہر حال اللہ کو ناپسند ہے۔

④ سب سے بڑا اعتداء یہ ہے کہ بندہ دعا وعبادت میں غیر اللہ کو بھی شریک کرے۔

⑤ دعا میں تضرع اور عاجزی نہ کی جائے بلکہ نہایت بے پرواہی اور ناز وانداز اختیار کیا جائے۔دعا کا یہ طریقہ قبولیت کا دروازہ نہیں کھول سکتا۔دعا میں عاجزی، مسکینی اور فقر وحاجت کا اظہار ضروری ہے۔جس نے ایسا نہ کیا اس کے ظالم ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

⑥ اللہ کی حمد وثنا اور عبادت ایسے طریقے پر کرنا جو شریعت سے ثابت نہیں ہے۔

اس پوری تفصیل کے بعد یہ واضح ہوگیا کہ یہ آیت دو چیزوں کو بتلا رہی ہے۔

① اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ محبوب چیز ،یعنی دعا میں عاجزی اور پست آوازی۔

② ناپسندیدہ مکروہ چیز،یعنی حد سے بڑھنا۔

جس کام کو پسند کرتا ہے اس کا حکم دیا گیا اور جو ناپسند ہے اُس سے روک

دیا گیا۔روکنے کا طریقہ بھی نہایت لطافت وبلاغت لیے ہوئے ہے۔فرمایا کہ وہ فاعلِ اِعتداء (یعنی حد سے بڑھنے والے) کو پسند نہیں کرتا تو پھر کون سی خیر اسے حاصل ہوسکتی ہے ﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ﴾ (۷/ الاعراف:۵۵) کا حکم دینے کے بعد ﴿ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴾ (۷/ الاعراف:۵۵) کہنے سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جو تضرّع، عاجزی اور خفیہ (پست آوازی) پر عمل نہ کرے وہ اللہ کو محبوب نہیں ہے۔اب انسانی مخلوق دوگروہوں میں بٹ گئی۔ایک وہ جو عاجزی اور خاموشی سے دعا کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جن کا عمل اس کے خلاف ہے ان کا شمار معتدین میں ہے۔

﴿ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ﴾ (۷/ الأعراف:۵٦)

''زمین کی اصلاح کے بعد اس میں فساد برپا نہ کرو۔''

فساد فی الارض

اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو مبعوث فرما کر اور لوگوں کو اپنی اطاعت کی طرف بلا کر اصلاح وخیر کی فضا پیدا کردی ہے۔اب اس کی نافرمانی اور غیر اللہ کی اطاعت کی طرف دعوت دے کر زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔سب سے بڑا فساد اور تمام فساد کا سرچشمہ یہی ہے کہ اس کی خدائی اور عبادت میں دوسروں کو شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے حکم کی مخالفت کی جائے۔فرمایا:

﴿ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ ﴾

(۳۰/ الروم: ٤١)

''یعنی لوگوں کے کرتوتوں کی وجہ سے خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا۔''

عطیہ اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ ''اللہ کی نافرمانی نہ کرو۔کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ بارش بند کردے اور کھیتیاں برباد ہو جائیں۔''

علمائے سلف کا قول ہے کہ جب قحط پڑتا ہے تو جانور بنی آدم پر لعنت کرتے ہیں: ''اے اللہ ان پر لعنت برسا، ان کی وجہ سے ہی زمین خشک ہوگئی اور بارشوں کا سلسلہ رک گیا۔''

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شرک اور غیر اللہ کی اطاعت کی طرف دعوت سب سے بڑا فساد ہے اس کا ازالہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہی تنہا معبود قرار دیا جائے اور اس کے رسول ﷺ کے سوا کسی کو لائق اطاعت نہ سمجھا جائے۔ رسول اللہ ﷺ کے سوا غیر کی اطاعت اسی وقت واجب ہوتی ہے جب کہ وہ رسول ﷺ کی اطاعت کے ماتحت حکم دے۔ لیکن اگر اس کے خلاف کہے تو پھر اطاعت و پیروی حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین، توحید اور رسول کے ذریعہ زمین کی اصلاح فرمائی اور شرک اور مخالفت رسول ﷺ کے ذریعے زمین میں فساد کرنے سے روکا۔ دنیا کے موجودہ حالات اور پوری گزشتہ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں۔ فساد کی جڑ مخالفت رسول ﷺ اور غیر اللہ کی طرف دعوت کو پائیں گے۔ فتنہ، بلا، قحط، دشمنوں کا غلبہ اور تمام دوسرے مصائب انہی دو باتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ زمین کی اصلاح وسعادت اور خیر و برکت کا سرچشمہ توحید و اطاعت رسول کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی، تا قیامِ قیامت یہی حال رہے گا۔ اسی طرح انسان کی انفرادی زندگی بھی انہی اسباب خیر و شر کی بنا پر اصلاح وفساد قبول کرتی ہے۔

﴿ وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ﴾ (۷/ الاعراف: ۵۶)

اس آیت میں اُمید وخوف کے ساتھ دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور پہلی آیت ﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ﴾ (۷/ الاعراف: ۵۵) میں عاجزی اور پوشیدہ طور پر دعا کی تاکید کی گئی ہے۔ ان آیتوں کے درمیان ایک جملہ خبریہ اور دوسرا طلبیہ لایا گیا ہے۔ یہ دونوں پہلے جملے کے مضمون کی تاکید اور وضاحت کرنے والے ہیں۔ مناسب اُمور کی تاکید اور مخالفت افعال کی ممانعت کے بعد خوف وطمع سے اللہ کو پکارنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی تاکید ﴿ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ (۷/ الأعراف: ۵۶) ''بیشک اللہ کی رحمت محسنوں (نیک کاروں) سے قریب ہے۔''

سے کی گئی ہے۔ اس جملہ کا تعلق اپنے ماقبل سے وہی ہے جو تعلق ﴿ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴾ (۷/ الاعراف: ۵۵) کا اپنے ماقبل سے ہے۔ ﴿ اُدْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ﴾ (۷/ الاعراف:۵٦) ایمان واحسان کے تمام مقامات محبت، خوف اور اُمید پر مشتمل ہیں اس لیے اس کے بعد ﴿ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ (۷/ الاعراف:۵٦) کا ذکر نہایت موزوں ہے۔ یعنی اللہ کی رحمت اُن پر نازل ہوتی ہے جو اس کو خوف وطمع کے ساتھ پکارتے ہیں۔ "تضرع وخفیه" کے ساتھ دعا کے مقابلہ میں اعتدا ہے، یعنی اللہ کو بلا تضرّع وخفیہ پکارنا۔ اس لیے آخر آیت میں ﴿ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴾ (۷/ الاعراف: ۵۵) فرمایا۔

قواعد نحو کے اعتبار سے "اُذکر ربّك تضرّعا" کے دو معنی ہیں:

① اللہ کو عاجزی کرتے ہوئے، گڑگڑاتے ہوئے پکارو۔

② اللہ کو یاد کرو عاجزی اور مسکینی والا یاد کرنا۔

یہ دونوں معنی یہاں مراد ہیں۔ یہی صورت خوفاً وطمعاً میں بھی ہے، یہی اندازِ بیان اس آیت میں بھی ہے:

﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴾ (۲۱/ الانبیاء: ۹۰)

"بے شک (انبیائے کرام) سبقت کرتے تھے بھلائیوں میں اور ہم کو پکارتے تھے رغبت کرتے ہوئے اور خوف کھاتے ہوئے یا ہم کو پکارتے تھے خوف اور رحمت کا پکارنا۔"

﴿ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ (۷/ الأعراف: ۵٦)

اس آیت میں صاف بتلا دیا گیا ہے کہ جس بات کا تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ یہی احسان تم سے مطلوب ہے اور تمہارا مطلوب اللہ کی رحمت ہے جو تم سے قریب ہی ہے۔ یہ رحمت ان محسنین سے نزدیک ہے جو اللہ کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں۔ اس طرح تمہارا مطلوب تم سے قریب ہو جائے گا جب کہ تم اللہ کے فرض کو پوری طرح بجا لاؤ گے اسی کا نام احسان ہے۔ درحقیقت یہ احسان اللہ پر نہیں ہے

بلکہ خود تمہاری فلاح ہے، اس آیت سے صراحتًا، اشارۃً اور بلحاظِ مفہوم تین باتیں ثابت ہوتی ہیں:

① اہل احسان سے اللہ کی رحمت قریب ہے۔

② اس قربِ رحمت کا اصل سبب احسان ہے۔

③ جو محسن نہیں ہے اس سے اللہ کی رحمت دور ہے۔

اہل احسان ربانی رحمت کے قرب کے ساتھ اس لیے مخصوص ہیں کہ رحمت اللہ کا احسان ہے جو اہل احسان کے ہی زیادہ مناسب ہے۔ بدلہ، عمل کے ہی مشابہ اور ہم جنس ہوتا ہے۔ جس طرح محسنین نے اپنے اعمال کو صفت احسان سے آراستہ کیا ہے اُسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اپنی رحمت کے احسان سے اُن کو مالا مال کرتا ہے۔ اور جو احسان سے دور ہوگا وہ اللہ کی رحمت سے بھی دور ہوگا۔ یہ رحمت سے دوری اور نزدیکی اسی قدر ہوگی جس قدر احسان سے نزدیکی اور دوری ہو گی۔ احسان کے معنی ہیں احکام الٰہیہ کا بجالانا خواہ یہ احسان لوگوں کے ساتھ ہو یا اپنے نفس کے ساتھ، احسان کا اعلیٰ درجہ ہے توحید، ایمان، اللہ کی طرف کامل توجہ، اس پر بھروسہ اور اس کی عبادت اس طرح کرنا گویا انسان اُسے دیکھ رہا ہے۔ اس کا جلال، خوف، محبت، حیا اور ہیبت دل پر چھا جائے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبرائیل کے سوال کے جواب میں فرمایا:

((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ)) [1]

جب احسان کی یہ صورت پیدا ہوجائے گی تو پھر رحمت کی نزدیکی میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔ اس نے اپنی رحمت اصحاب تقویٰ، نماز ادا کرنے والوں کے لیے لکھ دی ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ احسان کا بدلہ یہی ہوسکتا ہے۔ [2]

---

[1] صحیح البخاری ١/ ٢٧ (٣٦) الإیمان: باب سؤال النبی ﷺ عن الإیمان والإسلام؛ صحیح مسلم ١/ ٣٦ (١) الإیمان: باب بیان الإیمان و الاسلام و الاحسان۔

[2] بدائع الفوائد ٣/ ٢-١٨۔

تفسیر

﴿ إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ ......الخ﴾ (٤٤/ الاحزاب:٥٦)

سوال اللہ تعالیٰ کا اپنے رسولوں پر صلوٰۃ وسلام بھیجنا کیا معنی رکھتا ہے، یہ سلام تو ایک قسم کی طلب ودعا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا سلام دعا کرنا کیسے درست ہوسکتا ہے؟

جواب اس میں شک نہیں کہ طلب کے لیے تین اُمور کا ہونا ضروری ہے:

① طالب ② مطلوب

③ مطلوب منہ، یعنی جس سے طلب کیا جائے۔

لیکن یہ اسی وقت ہے جب کہ انسان کسی دوسرے سے طلب کرے یا سوال کرے، حکم دے یا منع کرے۔ لیکن اگر طالب خود اپنے نفس سے کچھ طلب کرے تو اس وقت تین ارکان کے بجائے طلب کے دو ہی رکن ہوں گے۔ یعنی طالب اور مطلوب۔ مطلوب منہ (یعنی جس سے طلب کیا جائے۔) خود اس کی اپنی ذات ہوگی۔ یہ بھی واضح رہے کہ طالب اور مطلوب منہ کا متحد ہونا کوئی محال بات نہیں ہے۔ اصل میں طلب، ارادہ کی ایک شاخ ہے۔ جس طرح انسان اپنے نفس سے کچھ چاہ سکتا ہے اسی طرح طلب بھی کرسکتا ہے اور جس طرح اپنی ذات کو حکم دے سکتا ہے یا منع کرسکتا ہے اسی طرح اس کو مطلوب منہ بھی بنا سکتا ہے۔ سورۂ یوسف میں ہے:

﴿ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌۢ بِالسُّوٓءِ ﴾ (١٢/ یوسف:٥٣)

''بیشک نفس برائی کا حکم دینے والا ہے۔''

سورۂ والنازعات میں ہے:

﴿ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۙ ﴾

(٧٩/ النازعات:٤٠)

''اور لیکن جو ڈر گیا اپنے رب کے پاس کھڑے ہونے سے اور نفس

کو خواہش سے روک لیا۔''

جب ایک بندہ اپنے نفس کو حکم دے سکتا ہے یا منع کرسکتا ہے۔حالانکہ اس کے اوپر دوسرا حاکم موجود ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اپنے نفس کے لیے آمر وناہی کیوں نہیں ہوسکتا جب کہ اس کے اوپر کوئی دوسرا آمر وناہی موجود نہیں ہے۔

انبیا پر اللہ تعالیٰ کے سلام کے معنی یہ ہیں کہ اُس نے اپنے نفس سے ان کے لیے سلامتی طلب کی ہے۔ مزید وضاحت کے لیے حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں۔ فرمایا:

﴿ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۚ ﴾ (٦/ الانعام:١٢)

''اس نے اپنے اُوپر رحمت کو لازم کرلیا ہے۔''

اس نے خود ہی اپنے نفس پر ایسا وجوب ولزوم ثابت کرلیا ہے کہ کسی دوسرے کا اس میں دخل نہیں ہے۔

﴿ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾ (٣٠/ الروم:٤٧)

''اور ہم پر مومنوں کی مدد کرنا واجب ہے۔''

انہی کی نظیر وہ آیات ہیں جن میں کسی کام کے کرنے کی خبر قسم کے ساتھ دی گئی ہے۔ فرمایا:

﴿ فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ ﴾ (١٥/ الحجر:٩٢)

''قسم ہے تیرے رب کی ہم ان سب سے ضرور ہی باز پرس کریں گے۔''

﴿ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ ﴾ (١٩/ مریم: ٦٨)

''قسم ہے تیرے رب کی ہم ان کو ضرور ہی جمع کریں گے۔''

یہ آیات اعمال صالحہ کی ترغیب دلانے اور برے کاموں سے روکنے پر مشتمل ہیں۔

باقی رہا جہاں گزشتہ افعال پر قسم بیان کی گئی ہے۔ وہاں محض خبر ہی مقصود

ہے۔ جیسے:

﴿ يٰسٓ ۚ﴿۱﴾ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۙ﴿۲﴾ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ﴿۳﴾ ﴾ (۳۶/ یسین:۱-۳)

''یٰسین، قسم ہے قرآن با حکمت کی، کہ بے شک آپ پیغمبروں میں سے ہیں۔''

منکرین جس بات کا انکار کر رہے ہوں اس کے ثبوت پر قسم کھانا خبر کی تاکیدوتصدیق ہے۔ اسی مضمون کی وہ آیات ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے سابق فیصلہ کی اطلاع دی ہے۔ فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۚ﴿۱۷۱﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ ﴾ (۳۷/ الصافات:۱۷۱-۱۷۳)

''اور البتہ ہمارا وعدہ پہلے ہی اپنے رسولوں کے لیے صادر ہو چکا ہے کہ یقیناً وہی مدد کیے جائیں گے، اور ہمارا ہی لشکر غالب (اور برتر) رہے گا۔''

جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے اُوپر کسی فعل کوواجب کرلیتا ہے۔اسی طرح حرام بھی کرلیتا ہے۔حدیث میں ہے:

((يَا عِبَادِيْ اِنِّيْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰى نَفْسِيْ)) [1]

''اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے نفس پرحرام کردیا ہے۔''

نکتہ: یہاں یہ بات بھی خوب اچھی طرح ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ جس چیز کو اپنے اُوپر لازم کر لیتا ہے۔ وہ اس کی پسندیدہ اور محبوب شے ہوتی ہے، اس کا وہ ارادہ بھی کرتا ہے اور جس چیز کواس نے اپنے نفس پر حرام کر لیا ہے اس کو ناپسند اور مکروہ قرار دیتا ہے اور اس کے چھوڑنے کا ارادہ کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس چیز کووہ پسند کرتا ہے اس کوواقع بھی کردیتا ہے اور جس چیز کوناپسند کرتا ہے وہ وقوع میں بھی نہیں آنے پاتی۔بخلاف اس کے بندوں کے، جن افعال کووہ پسند کرتا ہے، ضروری نہیں کہ ان کا وقوع بھی ہو۔ اسی طرح جن

[1] مسلم ٤/ ١٩٩٩ (٢٥٧٧) البر و الصلة و الآداب: باب تحريم الظلم۔

امور کو ان کے لیے مکروہ سمجھنا ہے، لازمی نہیں ہے کہ ان سے پرہیز بھی کیا جائے۔
اس تحریر سے افعال العباد اور افعال خالق دونوں کا فرق واضح ہوگیا۔ [1]

تفسیر ﴿وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا﴾ (۱۹/ مریم:۳۳)

وایضاً قول عیسیٰ علیہ السلام:
﴿وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا﴾
(۱۹/ مریم:۳۳)

ان دونوں آیتوں میں پیدائش، وفات اور قیامت ان تینوں اوقات کو بیان کیا گیا ہے۔ صرف ان اوقات کو خصوصیت کے ساتھ بیان کرنے میں بڑی حکمت ہے۔

① سلامتی زیادہ تر وہاں طلب کی جاتی ہے جہاں ہلاکت ونقصان کا گمان اور وحشت وپریشانی کا اندیشہ ہوتا ہے، پیدائش کا موقع ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس میں بچہ شکم مادر سے جو کہ اس کے لیے وطن مالوف سے کم نہیں، نکل کر آفات ومصائب سے گھری ہوئی دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ وطن اول کی جدائی اور شیطان کے چھیڑنے کی تکلیف سے بے قرار ہو کر رو پڑتا ہے۔ اس موقعہ کے لیے سلامتی طلب کرنا عقل کی مقتضیات میں سے ہے۔

② وفات کا وقت بھی کچھ کم ہولناک نہیں ہوتا۔ اس میں انسان عالم دنیا سے سفر کر کے عالم برزخ کی راہ اختیار کرتا ہے اور شکم مادر چھوڑنے پر جس قدر مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا ان سے کہیں زیادہ مصیبتیں چاروں طرف سے اس کو گھیر لیتی ہیں۔ ایسے مقام پر سلامتی کی دعا اہم اور ضروری امور میں سے ہے۔

③ تیسرا مقام قیامت کے روز اللہ کے حضور میں پیشی کا ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرے گا اور قبروں سے نکال کر کسی ہموار زمین پر ان کو کھڑا کردے

[1] بدائع ۲/ ۱۶۰-۱۶۴۔

گا۔ یہ وہ ہولناک مرحلہ ہوگا جس کے لیے سلامتی طلب کیے بغیر چارہ نہیں۔ وہاں کی ہلاکت وبربادی کی کوئی تلافی نہیں ہوسکتی، وہاں کی لغزش کے لیے کوئی معافی کی صورت نہیں، اس دن کی بیماری کا کوئی علاج نہیں، اس وقت کی محتاجی اور بے کسی کون ٹال سکتا ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ لفظ سلام صرف سلامتی ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ تسکین وانسیت کے وجود اوروحشت وپریشانی کی دوری کو بھی بتلا رہا ہے۔ [1]

تفسیر آیت

﴿قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ﴾ (۲۷/ النمل:۵۹)

''اے محمد ﷺ! آپ کہہ دیں سب تعریف اللہ کے لیے اور سلام ان بندوں پر جن کو اس نے چن لیا ہے۔''

اس آیت کے معنی دو طرح کیے جاسکتے ہیں:

① وسلامٌ کو بھی قل کے ماتحت رکھا جائے۔ یعنی کہہ دو کہ حمد اللہ کے لیے ہے اور کہہ دو کہ نیک بندوں پر سلام ہے۔

② سلام کا عطف قل پر مانا جائے۔ اس صورت میں سلامٌ الگ جملہ ہوگا۔

کئی وجوہ سے پہلی صورت زیادہ مناسب ہے۔

① الحمدللہ اس کے قریب ہی واقع ہے۔ اصل یہی ہے کہ جس طرح الحمدللہ، قل کا مقولہ ہے اسی طرح سلام کو بھی اس کا مقولہ مانا جائے۔

② اس صورت میں خبر کا عطف خبر پر ہوگا۔ یہ زیادہ بہتر ہے اس سے کہ خبر کا عطف طلب پر قرار دیا جائے۔

③ آیت کا اندازِ بیان یہ بتلا رہا ہے کہ یہ بندے کی طرف سے کہا جا رہا ہے، اگر اللہ کا کلام ہوتا تو یوں کہا جاتا: ''وسلام عبادی''

---

[1] بدائع ۲/ ۱۶۸، ۱۶۹۔

دوسری صورت کی بنا پر وسلامٌ اللہ کا قول ہوگا۔ اس کے نظائر بھی قرآن سے ملتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بنفسِ خود اپنے منتخب بندوں پر سلام فرماتا ہے:

﴿سَلٰمٌ عَلٰی نُوۡحٍ فِی الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ .... ﴿سَلٰمٌ عَلٰۤی اِبۡرٰہِیۡمَ﴾

﴿سَلٰمٌ عَلٰی مُوۡسٰی وَ ہٰرُوۡنَ﴾ .... ﴿سَلٰمٌ عَلٰۤی اِلۡ یَاسِیۡنَ﴾

(۳۷/ الصافات: ۷۹، ۱۰۹، ۱۲۰، ۱۳۰)

کلام پاک میں کبھی تو اللہ کی تسبیح اور نیک بندوں پر سلام کو یکجا بیان کیا گیا ہے اور کہیں اس کی حمد اور نیک بندوں پر سلام کو ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

پہلی صورت کی مثال یہ آیت ہے:

﴿سُبۡحٰنَ رَبِّکَ رَبِّ الۡعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ ﴿ۚ۱۸۰﴾ وَ سَلٰمٌ عَلَی الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿ۚ۱۸۱﴾﴾

(۳۷/ الصافات: ۱۸۰-۱۸۱)

''پاک ہے تیرا عزت والا رب ان باتوں سے جو وہ بیان کرتے ہیں اور سلام ہے رسولوں پر۔''

اس آیت میں اوّلاً اللہ تعالیٰ نے اپنی شان کے خلاف امور سے پاکی ظاہر فرمائی ہے اور پھر اس کے بعد رسولوں پر سلام بیان کیا ہے۔ان دونوں باتوں کو یکجا ذکر کرنے میں بڑی حکمت ہے۔جس طرح اللہ تعالیٰ ان تمام عیبوں اور کمزوریوں سے منزہ ہے جو مشرکین ومنکرین اس کی طرف منسوب کرتے ہیں،اسی طرح اس کے رسول ان تمام الزامات اور افتراء ت سے پاک ہیں جو مخالفین ان کے سر تھوپتے ہیں۔گویا ان کو دشمنوں کی تمام تہمتوں سے سلامتی حاصل ہے۔جب یہ بات ثابت ہوگئی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ رسول جس ربانی کلام کو لائے ہیں وہ بھی ہر قسم کے کذب وفساد اور عیب وداغ سے پاک ہے۔

انبیائے کرام کی معرفت جو کچھ بھی آیا ہے اس میں بڑی چیز توحید اور صفات الٰہیہ ہیں۔ جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ رسولوں کا لایا ہوا کلام بے عیب ہے۔ تو یہ خالص نکھرا ہوا حق ہے اور اس کے ماسوا جو کچھ بھی ہے وہ سب سرتاپا باطل

ہے بعینہٖ یہی معنی اس آیت کے ہیں:

﴿قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى﴾

(۲۷/ النمل:۵۹)

یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اوصاف حمیدہ، صفات کمال وجلال اوراسمائے حسنیٰ کے ساتھ حمد وتعریف پر مشتمل ہے اور بتلارہی ہے کہ اس کے رسول ہر عیب اور جھوٹ سے پاک ہیں۔ پھر یہ نتیجہ نکل آیا کہ ان کی معرفت جو کتاب آئی ہے وہ بھی بے عیب ہے۔ سلامٌ کو اللہ تعالیٰ کا قول ماننے سے یہ آیت اور سورۂ صافات کی آخری آیت معنی میں یکساں ہوگئیں۔باقی رہا یہ اعتراض کہ اس صورت میں خبر کا عطف طلب پر ہوجائے گا تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔قرآن مجید میں اس کے نظائر بہت سے ہیں:

① ﴿قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ﴾

(۲۱/ الانبیاء:۱۱۲)

② ﴿وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ﴾

(۲۳/ المؤمنون:۱۱۸)

"سلامٌ علی عبادہ" کا عطف "الحمد" پر ہے یا "قل" پر، دونوں کے دلائل واضح کردیئے گئے۔اس باب میں قولِ فیصل یہ ہے کہ آیت دونوں صورتوں کو شامل ہے۔

درحقیقت رسول صرف مبلغ ہوتا ہے۔کلام اصل میں اللہ تعالیٰ کا ہی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنی تعریف کی اور نیک بندوں کو سلام فرمایا اور رسول اللہ ﷺ کو اس کی تبلیغ کا حکم دیا۔ جب رسول اس آیت کو پڑھتا ہے تو گویا اس نے خود بھی اللہ کی حمد کی اور اس کے بندوں پر سلام بھیجا۔تو یہ سلام اللہ تعالیٰ سے ابتداءً ہے اور رسول سے تبلیغاً ہے اور عام بندوں سے اطاعت وپیروی کی بنا پر ہے۔اس معنی کی نظیر "قل ھو اللہ احد" ہے، یہاں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی توحید کا اعلان کیا ہے

اور مخاطب کو اس کے اعتراف واظہار کا حکم دیا ہے۔ لفظ "قل" لانے میں حکمت یہ ہے کہ نبی محض مبلغ ہے اس کا کام صرف یہ ہے کہ جو اس کو حکم ملتا ہے اُسے پہنچا دیتا ہے۔ بخلاف "قل أعوذ برب الفلق" اور "قل أعوذ برب الناس" کے، یہاں تبلیغ مقصود نہیں ہے بلکہ پناہ مانگنے کا حکم دیا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود کسی چیز سے پناہ نہیں مانگتا یہ تو اس کی شان جلالی کے یکسر خلاف ہے۔ "قل ھو اللہ أحد" میں یہ معاملہ برعکس ہے وہاں اللہ تعالیٰ خود اپنی توحید کی خبر دے رہا ہے کہ وہی "الواحد الاحد" ہے۔ فافھم فانه بدیع۔ [1]

[1] بدائع ۲/ ۱۷۰-۱۷۲۔

سلام کی حقیقت کیا ہے؟

اس لفظ کے اصلی معنی ہیں،شر وعیب سے نجات اور براء ت۔تمام مشتقات اور گردانیں اسی معنی کے گرد گھوم رہی ہیں۔مثلاً کہتے ہیں:

سلمك الله۔ ''یعنی اللہ تجھے شر وعیب سے محفوظ رکھے۔''

پل صراط پر مومنین کی دعا ہوگی: ((اَللّٰھُمَّ سَلِّمْ سَلِّمْ)) محاورہ ہے:

سَلِمَ الشَّیْءُ لِفُلَانٍ۔ ''یعنی اسی کے لیے خالص ہوگئی۔''

اور وہ شرکت وساجھے کے ضرر سے بچ گیا۔قرآن میں ہے:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ﴾ (۳۹/ الزمر: ۲۹)

''یعنی اللہ نے مثال بیان کی ایک آدمی کی۔جس کی ملکیت میں کئی آدمی شریک ہیں۔''

اور ایک آدمی ایسا ہے جو صرف ایک کے ساتھ خاص ہے یعنی تنہا ایک شخص بلاشرکت غیرے اس غلام کا مالک ہے۔سلم، حرب(جنگ)کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے، فرمایا:

﴿وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا﴾ (۸/ الانفال: ۶۱)

''اگر وہ صلح کے لیے جھکیں تو تم بھی صلح کی طرف جھک جاؤ۔''

صلح کو سَلْم اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ہر ایک اپنے فریق مقابل کے حملہ سے محفوظ ہوکر صحیح سالم بے خطر زندگی گزارتا ہے۔اسی طرح قرآن میں قلب(دل) کی ایک صفت سلیم بھی آئی ہے۔یعنی کینے اور فساد سے پاک،حقیقت بھی یہی ہے کہ مومن کا دل شرک اور معصیّت کی آلائشوں سے صاف ہوتا ہے۔صرف اللہ کی سچی محبت اور حسن سلوک کی عادت اس کے دل میں سمائی ہوتی ہے۔اسی سلام سے اسلام ماخوذ ہے۔اس کے معنی ہیں جھک جانا، تابعدار ہو جانا اور شرک کی آلودگیوں

سے نکل جانا۔ ایک مسلم اس صفت کے ساتھ اپنے رب کے لیے خاص ہو جاتا ہے۔ اپنے مولیٰ کے سوا کسی دوسرے کی غلامی برداشت نہیں کرتا۔ یہ مسلم اس غلام کی طرح ہے جس کا ایک ہی آقا ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔

بیع سلم میں بھی یہی معنی پوشیدہ ہیں۔ کیونکہ اس میں دوکان دار، خریدار کے لیے اصل چیز (مبیع) کی حفاظت وسلامتی کا ضامن ہوجاتا ہے۔ اس طرح لدیغ (سانپ ڈسے ہوئے) کو سلیم کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ سلامتی اور شفا کی تلاش میں ہوتا ہے۔ مآل اور انجام کے لحاظ سے اس کو سلیم کہا گیا ہے۔ جیسا کہ مھلکۃ (جنگل بیابان جہاں مسافر ہلاک ہوجاتے ہیں۔) کو مفازۃ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اُس بے آب وگیاہ صحرا میں مسافر کا مقصود ومطلوب سوائے فوز (نجات) کے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ یہی سلامتی کے معنی سُلَّم میں بھی پائے جاتے ہیں۔ بغیر سیڑھی کے بلندی پر پہنچنا تکلیف اور ضرر سے خالی نہیں۔ یہ سُلَّم سلامتی کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچا دیتی ہے اور اسی بنا پر جنت کو دار السلام کہا گیا ہے۔ اس کی تین وجوہات علما نے بیان کی ہیں:

① السلام سے اللہ تعالیٰ مراد ہے۔ یہاں جنت کی نسبت اس کے مالک کی طرف کی گئی ہے۔

② جنت والوں میں آپس میں سلام، کلام اسی لفظ سے ہوا کرے گا۔ اس لیے اس کا نام دار السلام رکھ دیا گیا۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَٰمٌ﴾ (١٠/ یونس:١٠)

''ان کی دعا اس میں سلام ہوگی۔''

③ سلام سے مراد سلامتی ہے۔ یعنی ایسا گھر جو ہر قسم کی آفت، نقصان اور شر سے پاک ہوگا۔ یہ تینوں وجوہات آپس میں لازم وملزوم ہیں۔ لیکن تیسری توجیہ زیادہ موزوں ہے۔ [1]

[1] بدائع: ٢/ ١٣٢، ١٣٤۔

سوال ﴿سَلٰمٌ عَلٰی نُوْحٍ﴾...... ﴿سَلٰمٌ عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ﴾ (۳۷/ الصافات:۷۹، ۱۰۹)

اور ﴿فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ﴾ (۵۶/ الواقعة:۹۱)

کہیں سلام کے بعد علی اور کہیں لام لایا گیا ہے۔اس فرق کی وجہ کیا ہے؟

جواب علی تو اس لیے لایا گیا ہے کہ یہ ظاہر ہو جائے جس کو سلام کیا گیا ہے۔اس پر سلامتی ڈال دی گئی ہے اور لباس کی طرح یہ معنی اس کو پہنا دیئے گئے ہیں۔سلام اور دعا کے موقعہ پر علی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔بخلاف سلام لك من اصحاب الیمین، کہ یہاں دعا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ جملہ خبر یہ ہے۔یعنی لوگوں کی تین قسمیں ہیں:

① مقربین ان کے لیے روح، ریحان اور نعمت کے باغات کا وعدہ ہے۔

② اصحاب الیمین ان کے لیے سلامتی اور آگ ہے۔

③ ظالمین جن کے لیے گرم پانی اور آگ ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ یہاں سلام وتحیۃ مراد نہیں ہے بلکہ صرف سلامتی کی خبر دینی مقصود ہے۔

سوال اس آیت میں لك ضمیر کا مخاطب کون ہے؟ لام کے معنی کیا ہیں اور من اصحاب الیمین میں من کس معنی پر دلالت کرتا ہے؟

جواب یہاں لام، لامِ اضافت ہے یہ اس بات کو بتلاتا ہے کہ لام کا ماقبل یعنی مضاف لام کے مابعد یعنی مضاف الیہ کے لیے حاصل ہے۔جیسا کہ فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ﴾ (۱۳/ الرعد:۲۵)

"یہی لوگ ہیں جن کے لیے لعنت ہے۔"

یہاں "علیهم اللعنة" نہیں کہا گیا، صرف یہ بتلانے کے لیے کہ ان کے لیے لعنت ثابت وحاصل ہے۔اسی طرح فرمایا:

﴿وَلَكُمُ الْوَیْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ﴾ (۲۱/ الانبیاء:۱۸)

"اور تمہارے لیے تباہی ہے بسبب اس کے جو تم بیان کرتے ہو۔"

اسی کے بالمقابل خیر کے مقام پر لك الرحمة، لك السلام اور لك التحية کہا جاتا ہے۔اس معنی میں یہ آیت ہے۔سلام لك، یعنی تیرے لیے سلامتی حاصل وثابت ہوگئی ہے۔یہاں خطاب کسی معین مخاطب کو نہیں ہے۔بلکہ اصحاب الیمین کا ہر فرد اس کا مخاطب ہے۔''یعنی سلامتی ہو تیرے لیے اے وہ شخص جو دائیں والوں میں سے ہے۔''یہاں من اصحاب الیمین،حال واقع ہے۔یعنی کائنا منہم......الخ۔ [1]

[1] بدائع: ٢/ ١٤٦، ١٤٧۔

تفسیر قول ملائکہ اور جواب ابراہیم

﴿قَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ﴾ (۱۱/ ھود:۶۹)

اس آیت میں فرشتوں کا سلام نقل نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ سلاماً یہاں قالوا کا مفعول ہے۔ گویا انہوں نے اس طرح کہا قالوا قولاً سلاماً ای سداداً صواباً۔ یعنی فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں پہنچ کر درست اور صحیح بات عرض کی۔ یہاں ان کے قول کو سلام اس لیے کہا گیا کہ اس قول نے سلام کے معنی کو ادا کر دیا اور اس سے میزبان کی وحشت دور ہو گئی۔ لیکن ابراہیم علیہ السلام کا قول بطور نقل وحکایت ذکر کیا گیا ہے۔ اسی لیے مرفوع علی الابتداء ہے اگر حکایت مقصود نہ ہوتی تو اس کو بھی قال کا مقولہ قرار دے کر منصوب ہی لایا جاتا۔ فرشتوں کا قول بطور حکایت نقل نہیں کیا گیا اور ابراہیم علیہ السلام کا قول نقل کیا گیا، اس میں حکمت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام امام الانبیاء اور سید الحنفاء ہیں۔ اس لیے ان کا سلام بطور حکایت، اقتدا واتباع کے لیے نقل کرنا ضروری تھا اور یہ بتلانا تھا کہ سلام علیکم یہ تمہارے بزرگ دادا کی سنت ہے۔ فرشتوں کے کلام میں اس اہتمام کی خاص ضرورت نہ تھی۔ [1]

سوال ﴿وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا﴾ (۲۵/ الفرقان:۶۳) یہاں سلاماً منصوب ہے۔ دوسری آیت ﴿سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۡ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ﴾ (۲۸/ القصص:۵۵) میں سلام مرفوع ہے، اس فرق میں کیا حکمت ہے؟

جواب پہلی آیت کا مطلب ہے، رحمٰن کے نیک بندے دشمنوں کی گالیوں اور طعنوں کا جواب نہایت سنجیدگی اور بربادی سے دیتے ہیں۔ جو فحش اور بدگوئی سے خالی ہوتا ہے یعنی قالوا قولاً سلاماً ای سداداً صواباً۔ ٹھیک درست معقول بات، اگر یہاں سلامٌ کہا جاتا تو اس کے معنی یہ ہوتے، یہ لوگ جاہلوں کے جواب میں سلام علیکم کہہ دیتے ہیں۔ یہ معنی کوئی معقول اور مقام مدح کے لیے موزوں

[1] بدائع: ۲/ ۱۵۷، ۱۵۸۔

نہیں ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے مدح کے اوصاف ہی ذکر کیے گئے ہیں۔ یہاں اس بات کو نمایاں کیا گیا ہے کہ صالحین برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے بلکہ حسن سلوک سے پیش آتے ہیں۔ ان کا عمل اس پر ہوتا ہے۔

﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾

(٤١/ فصلت:٣٤)

''نیکی اور برائی برابر نہیں ہوسکتی۔ اچھے مناسب طریقے سے برائی کو روکو۔''

غور کریں! اس میں صالحین کے قدم اور ان کی زبان دونوں کی خوبیاں یکجا بیان کردی گئی ہیں۔ فرمایا:

﴿الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا﴾ (٢٥/ الفرقان:٦٣)

''یعنی وہ زمین پر نہایت وقار، سنجیدگی اور متانت کے ساتھ چلتے ہیں۔''

ان کی چال میں رعونت، نزاکت اور غرور کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اسی طرح جب بولتے ہیں تو ان کی گفتگو سراپا حلم وبردباری ہوتی ہے۔ بے حیائی، جہالت اور سختی کا نام تک اس میں نہیں ہوتا۔ سلام کہنے کی صورت میں یہ لطیف پرحکمت معنی کیسے ادا ہوسکتے تھے؟

دوسری آیت کا مطلب دوسرا ہے، پہلے پوری آیت پر نظر ڈالیں۔ فرمایا:

﴿وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ﴾ (٢٨/ قصص:٥٥)

''اور جب وہ لغو بے ہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں، اور کہتے ہیں ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں، تم پر سلام ہو ہم جاہلوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔''

اس آیت میں اہل کتاب ایمان داروں کا حال بیان کیا گیا ہے کہ جب وہ ایمان لے آئے۔ تو ان کو مشرکین نے طعنے دیئے اور عار دلائی کہ تم نے اپنے دین کو کیوں چھوڑ دیا اور اس نئے نبی کے پیچھے کیوں لگ گئے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کا جواب نقل کیا ہے کہ مومنین اہل کتاب نے نہایت ہی خوبصورتی سے آخری اور الوداعی سلام وخطاب کرتے ہوئے کہا کہ اب ہم سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ تم اپنے عمل کے ذمہ دار ہو اور ہم اپنے عمل کے ذمہ دار۔ یہاں سلامٌ علیکم ایک واقعہ کی نقل ہے اس لیے رفع ہی مناسب تھا۔ پہلی آیت میں تعلیم وارشاد مقصود ہے۔ کسی واقعہ کی حکایت مدِ نظر نہیں ہے اس لیے سلاماً ہی موزوں ہے۔ [1]

دُعا اور بددُعا کے طریقوں میں فرق

قرآن مجید کا اندازِ بیان بتلا رہا ہے کہ دعائے خیر کے موقع پر سلام ورحمت جیسے الفاظ کو پہلے لانا چاہیے، اور دعائے شر (بددعا) کے مقام پر جس پر بددعا کی جارہی ہے اس کا ذکر پہلے ہونا چاہیے۔ پہلی صورت کے شواہد یہ ہیں:

﴿ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ﴾ (۱۱/ ھود:۷۳)

﴿ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴾ (۳۷/ الصافات:۱۰۹)

﴿ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ ﴾ (۳۷/ الصافات:۷۹)

﴿ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ﴾ (۳۷/ الصافات:۱۳۰)

﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ ﴾ (۱۳/ الرعد:۲٤)

دوسری صورت کے نظائر یہ ہیں:

﴿ وَّاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ ﴾ (۳۸/ صٓ:۷۸)

﴿ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ ﴾ (۱۵/ الحجر:۳۵)

﴿ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ﴾ (٤۸/ الفتح:٦)

---

[1] بدائع: ۲/۱۵۸-۱٦۰۔

﴿فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ﴾ (١٦/ النحل:١٠٦)

اس فرق میں حکمت یہ ہے کہ دعا میں کلمات خیر کو مقدم کیا گیا ہے جو کہ نفس کے لیے محبوب و مرغوب ہیں۔ان الفاظ کے کان میں پڑتے ہی دل خوشی سے باغ باغ ہوجاتا ہے اوراس انتظار میں رہتا ہے کہ یہ سلام اوررحمت کس کو حاصل ہوگی اورکس کے لیے طلب کی جارہی ہے۔جب ”عليك“ یا ”لك“ سنتا ہےتو دل مسرت سے بلیوں اُچھلنے لگتا ہے اوردل میں باہمی محبت واُلفت کا بیج پڑ جاتا ہے۔ سلام سے مقصود بھی یہی ہے۔

بددعا کے موقع پر ”عليك“ مقدم کرنے سے یہ بتلانا ہوتا ہے کہ یہ لعنت وغضب صرف تجھ پر ہے،تیرے سوا اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔بخلاف دُعائے خیر کے، اس میں جس قدر عموم ہوگا اسی قدر فوائدو فضائل زیادہ حاصل ہوں گے۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

”عام دعا کی خاص دعا پر برتری اورفوقیت ایسی ہے،جیسے آسمان کی فضیلت زمین پر۔“

اسی کے ہم معنی ایک روایت بھی ملتی ہے۔دوسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ جب ”عليك“ پہلے کہہ دیا جاتا ہے تو مخاطب کے کان کھل جاتے ہیں اوردل منتظر رہتا ہے کہ کون سی مصیبت اس پر نازل ہوگی۔

پھر جب مدعوبہ(جس لفظ کے ساتھ بددعا کی جاتی ہے۔)کاذکر کیا جاتا ہے تواس کاداخلہ ایسے دل میں ہوتا ہے جوپہلے سے خالی اوراس کی معرفت کے لیے منتظر رہتا ہے۔وعیدودھمکی سنانے کے لیے یہ طریقہ زیادہ مؤثر ہے۔

اس نکتہ سے سورۂ زمر کے آخرمیں اہل جہنم کے تذکرہ میں واؤ نہ لانے کی حکمت بھی معلوم ہوجاتی ہے۔فرمایا:

﴿وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى جَهَنَّمَ زُمَرًا ۖ حَتَّى إِذَا جَاءُوهَا فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا﴾ (٣٩/ الزمر:٧١)

''اور کافر جہنم کی طرف ہنکائے جائیں گے فوج درفوج، یہاں تک کہ جب وہ جہنم کے پاس پہنچ جائیں گے تو اس کے دروازے کھل جائیں گے۔''

ایسے موقع پر کافروں کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک شخص بند دروازہ پر کھڑا ہے اور اسے یہ خبر نہیں ہے کہ کس قسم کے مصائب وشدائد اس پر نازل ہوں گے۔ صرف اتنا جانتا ہے کہ ایک بہت بڑا عذاب ظہور میں آنے والا ہے، کہ اچانک دروازہ کھلتا ہے اور متوقع عذاب سامنے آجاتا ہے۔دنیا میں قیدیوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوتا ہے۔جیل کا دروازہ پہلے کھولا جاتا ہے بلکہ اس کے پہنچنے پر فوراً کھول دیا جاتا ہے۔ اس طرح مجرم کا ڈر، خوف اور بھی بڑھ جاتا ہے۔لیکن اہل جنت کا معاملہ دوسرا ہے،ان کے استقبال کے لیے پہلے سے دروازہ کھلا ہوگا۔ان کو انتظار کی تکلیف برداشت نہ کرنی پڑے گی۔اس لیے فرمایا:

﴿حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا﴾ (۳۹/ الزمر:۷۳)

''یعنی یہاں تک مومن جب جنت کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھلے ہوں گے۔''

یہاں "اذا" کے جواب کو حذف کردیا گیا ہے،تاکہ اس مقام کی عظمت وشان اور بھی دوبالا ہوجائے۔ [1]

سوال "وفتحت ابوابها" کا جو مطلب بیان کیا گیا ہے وہ اس حدیث کے خلاف ہے۔رسول اللہ ﷺ کے بارے میں آیا ہے:

((یاتی باب الجنة فیلقاه مغلقا حتی یستفتحه)) [2]

''یعنی آپ جنت کے دروازہ پر آئیں گے تو وہ بند ہوگا آپ اُسے

---

[1] بدائع ۲/ ۱۷۴، ۱۷۵۔

[2] صحیح مسلم ۱/ ۱۸۸ (۱۹۷) الإیمان: باب فی قول النبی ﷺ ((انا اول الناس یشفع فی الجنة......)) میں اسی معنی کی روایت موجود ہے۔

کھولیں گے۔"

جواب اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کے کمال شرف وفضل کو بیان کیا گیا ہے۔یعنی جنت کا دروازہ آپ کے ہاتھوں کھلے گا اور صالحین کے لیے آپ کھلوائیں گے۔اگر آپ بھی پہلے سے کھلا ہوا پاتے تو یہ شرف ظاہر نہ ہوتا۔اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہے جیسے کوئی قلعہ بند ہو اور ساری فوج اس کے دروازہ کھولنے سے عاجز و درماندہ ہوگئی ہو۔ایسی سخت مصیبت اور کٹھن وقت میں کوئی اللہ کا بندہ آئے اور دروازہ کھلوادے تو یقیناً اس کے شرف وفضیلت سے انکار کسی سے بھی نہ ہو سکے گا۔ [1]

تفسیر واسرار السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سوال سلام کے ساتھ رحمت وبرکت کو کیوں بیان کیا گیا ہے؟

جواب حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا تاوقتیکہ اس کو تین چیزیں حاصل نہ ہو جائیں:

1. ان تمام عیوب،مصائب وتکالیف سے سلامتی جو انسانی زندگی کو تلخ اور ناخوشگوار بنانے والی ہیں۔
2. خیر وسعادت کا حصول۔
3. اس خیر وسعادت کا بقا ودوام۔

اسلامی سلام ایسا مقرر کیا گیا ہے جس سے یہ تینوں فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔"سلام علیکم" ہر قسم کے شر سے سلامتی کو شامل ہے،"رحمۃ اللہ" حصول خیر کو بتلاتا ہے،"برکاتہ" سے اس خیر کے دوام وثبات کی طرف اشارہ ہے کیونکہ برکت نام ہے کثرت خیر اور اس کے بقا ودوام کا۔اس توجیہ سے قرآن حکیم میں رحیم کے ساتھ غفور کے بیان کرنے کی حکمت بھی معلوم ہو جاتی ہے۔جب کہ یہ تینوں امور ہر ایک انسان کے بلند مقاصد میں سے ہیں۔اس لیے سلام وتحیہ میں

[1] بدائع: ۲/ ۱۷۵۔

ایسے الفاظ خصوصیت کے ساتھ لائے گئے ہیں جوان مطالب کو واضح کرسکیں۔اگر یہ تینوں الفاظ لائے جائیں تو ان تینوں امور مذکورہ کا بیان مطابقۃ ، یعنی پوراپورا ہوگا۔اگر صرف سلام ورحمت کو بیان کیا جائے تو ضمنی طور پر ''برکات'' کی طرف بھی اشارہ ہوجائے گا،اوراگرصرف سلام علیکم کہا جائے تو رحمت اور برکات کی طرف اشارہ لزوماً ہوگا۔ہرقسم کے شر سے کامل سلامتی اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے،جب کہ دائمی طور پرخیر کا حصول بھی ہوجائے۔یہ سلام اپنی ان خوبیوں کی بناپردنیا میں مسلمانوں کے لیے تعارف وملاقات کا بہترین ذریعہ اور کنجی ہے اورآخرت میں بھی جامع محاسن سلام ان کی زبانوں پر ہوگا۔

تمام ادیان ومذاہب پر برتری اورفوقیت ثابت کرنے کے لیے یہ کیا کم دلیل ہے۔حقیقت یہ ہے کہ صرف سلام پر کیا منحصر ہے بلکہ شریعت کا ہر حکم عقل وفطرت دونوں کے مطابق ہے۔رب العالمین کا سب سے بڑا احسان یہی ہے کہ اُس نے اپنے بندوں کو کامل بے داغ شریعت اوردین قیم کے ساتھ نوازا ہے۔اسی لیے مقامِ احسان میں فرمایا ہے:

﴿ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۱٦٤)

''بے شک مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ ان ہی میں سے ایک رسول ان میں بھیجا، جو انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے، یقیناً یہ سب اس سے پہلے گمراہی میں تھے۔''

اورفرمایا:

﴿ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ ﴾

(٤٩/ الحجرات:١٧)

”بلکہ دراصل اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت کی اگر تم راست گو ہو۔“

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں لفظ من (احسان کرنا) شریعتِ کاملہ کے ذکر کے ساتھ ہی لایا گیا ہے۔واقعہ بھی یہی ہے کہ اس سے بڑھ کر عظیم احسان اور کیا ہوسکتا ہے۔

سوال اس میں کیا حکمت ہے کہ رحمت اور برکات کو اللہ کی طرف مضاف اور منسوب کرتے ہوئے رحمة الله اور برکاته کہا گیا ہے۔لیکن لفظ سلام بلا اضافت لایا گیا ہے؟

جواب (۱)”سلام“ اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔اس لیے اللہ کی طرف اضافت کی ضرورت ہی نہ تھی۔لیکن رحمت اور برکات کا معاملہ دوسرا ہے۔اگر ان دونوں کی اضافت اللہ کی طرف نہ ہوتی تو کیسے معلوم ہوتا کہ رحمت وبرکت کس سے طلب کی جارہی ہے۔اس لیے رحمت وبرکت والے کے نام کی تصریح ضروری تھی۔

جواب (۲)”سلام“ سے مراد سلام کرنے والے کا قول ”سلام علیکم“ ہوتا ہے۔ اور معنی یہ ہوتے ہیں ”سلام“ یعنی اللہ تعالیٰ سے سلامتی مطلوب ہے۔ ایسی صورت میں اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے، اور کبھی اس کو مصدر قرار دے کر اس کی نسبت طالب کی طرف ہوتی ہے۔ یہاں بغیر اضافت کے مطلق بیان کیا گیا، تاکہ دونوں مفہوم لیے جاسکیں۔ بخلاف رحمت وبرکت کے کہ ان کی اضافت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہوسکتی ہے۔”رحمتي وبركتي عليكم“ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ہاں ”سلام مني یاسلام فلان“ کہہ سکتے ہیں۔اس فرق میں راز یہ ہے ”سلام“ جملہ قولیہ ”السلام علیکم“ پر بھی بولا جاتا ہے۔لیکن رحمت وبرکت کا اطلاق ان کے معنی پر ہی ہوتا ہے، الفاظ وکلمات مقصود نہیں ہوتے (یعنی رحمت اور برکت کہہ کر ”رحمة الله وبركاته“ مراد نہیں لیا جاتا۔مترجم)

جواب (۳)رحمت وبرکت کا مفہوم سلامتی سے کہیں زیادہ جامع اور کامل ہے۔

سلامتی کے معنی تو ہیں شر سے بچنا،اور رحمت وبرکت کے معنی ہیں خیر کا حصول اور اس کا دوام،اس میں جو کمال ہے وہ سلامتی کے مفہوم میں نہیں ہے۔رحمت وبرکت تو اصل مقصود بالذات ہیں اور سلامتی اس اہم مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ذریعہ ووسیلہ۔ اس لیے اہل جنت کا نعمتوں کا حاصل کرنا زیادہ کمال رکھتا ہے محض جہنم کے عذاب سے محفوظ رہ جانے سے۔تو یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف کامل ترین معنی صراحتاً منسوب کیے گئے ہیں اور "سلام" کو بلا اضافت رکھا گیا ہے۔اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف عطف اور سیاق وسباق سے معلوم ہوسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جملہ کے اندازِ بیان کی خوبی اور حسن ترتیب سے کیسے انکار ہوسکتا ہے؟ [1]

رحمۃ اللہ وبرکاتہ

سوال کیا وجہ ہے کہ "سلام" اور "رحمة" کو مفرد اور "بركة" کو جمع لایا گیا ہے؟

جواب "سلام" یا تو مصدر ہے، اس صورت میں وہ شيء واحد ہے اس کے جمع لانے سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوتا،یا "سلام" اللہ کا نام مانا جائے تب بھی اس کا جمع لانا ناجائز ہے۔اسی طرح "رحمة" بھی مصدر ہے، شفقت ومہربانی کے معنی میں، اس کی جمع بھی نہیں آتی۔رحمة کی "ة" ضربة اور ثمرة کی طرح تحدید اور حد بندی کے لیے نہیں ہے، بلکہ یہ محبت اور رأفت (شفقت) کی طرح ہے۔جس طرح رأفات،محبات نہیں کہا جاتا اسی طرح رحمات بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں جمع لانے کی صورت میں تحدید کی صورت پیدا ہوسکتی تھی۔اس مقام پر مفرد لانا ہی عموم وکثرت بتلانے کے لیے زیادہ مناسب ہے۔اور یہ بھی ایک عجیب نادر نکتہ ہے کہ مفرد کے مفہوم میں جمع سے زیادہ وسعت پائی جائے۔یہی وجہ ہے مندرجہ ذیل آیات میں بجائے جمع کے مفرد کلمات مذکور ہیں:

---

[1] بدائع: ۲/ ۱۸۱، ۱۸۲۔

① ﴿قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾ (٦/ الأنعام:١٤٩)

''آپ کہیے بس پوری حجت اللہ ہی کی رہی۔''

"فللہ الحجج البوالغ" نہیں کہا گیا۔

② ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ (١٤/ ابراهيم:٣٤)

''اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو گن نہیں سکتے۔''

یہاں نعم اللہ کہنے کی صورت میں عموم وکمال حاصل نہ ہوسکتا۔

③ ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً﴾ (٢/ البقرة:٢٠١)

''اے رب! دے ہم کو دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بھلائی۔''

"حسنة" میں حسنات سے کہیں زیادہ معنوی کمال پایا جاتا ہے۔

"برکات" کو جمع بیان کرنے میں یہ حکمت ہے کہ برکت کے مفہوم میں شیئاً فشیئاً (آہستہ آہستہ تدریجی طور پر) خیر وسعادت کی کثرت اور دوام ملحوظ ہے۔ گویا وہ دائمی خیر ہے جس کے افراد نوبت بہ نوبت ظہور میں آتے رہتے ہیں۔ ایک فرد گزرا اور دوسرے فرد نے اس کی جگہ لے لی، یہاں جمع کا صیغہ بھی اصل مقصود کی دلالت کو واضح کرتا ہے۔ اسی بنا پر قرآن میں فرمایا گیا ہے:

﴿رَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ﴾ (١١/ هود:٧٣)

اسی طرح تشہد میں ہے:

((اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ)) [1]

"رحمۃ" کی اقسام اور "الحی القیوم" کی تشریح

وہ رحمت جس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے اس کی دو قسمیں ہیں:

① رحمت مخلوقہ

اس کی اضافت اللہ کی طرف اسی طرح ہے۔ جیسے مفعول کی اضافت فاعل

[1] بدائع: ٢/ ١٨٢، ١٨٣۔

کی طرف، جیسا کہ حدیث میں جنت کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

((انما انتِ رحمتی أرحم بكِ من أشاء)) [1]

''بس تو میری رحمت ہے تیرے ذریعہ جس کو چاہوں آغوشِ رحمت میں لے لوں۔''

قرآن میں ہے:

﴿ وَلَئِنْ أَذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ﴾ (۱۱/ هود:۹)

''اور اگر ہم چکھاتے ہیں انسان کو اپنی جانب سے رحمت۔''

اسی معنی کے اعتبار سے بارش کو بھی رحمت کہا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿ وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ﴾

(۷/ الاعراف:۵۷)

''اللہ وہ ہے جو ہواؤں کو چلاتا ہے بشارت دیتے ہوئے اپنی رحمت سے پہلے۔''

اسی بنا پر دعا میں ''اللهم اجمعنافی مستقر رحمة'' کہنا جائز ہے۔

② رحمت بطور صفت الٰہیہ

اس کی اضافت اللہ کی طرف ایسی ہی ہے۔ جیسے صفت کی اضافت موصوف کی طرف ہوتی ہے۔ فرمایا:

((یاحی یاقیوم برحمتك استغیث)) [2]

''اے ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والے میں تیری رحمت کے ساتھ فریاد کرتا ہوں۔''

---

[1] صحيح البخاری ٤/ ١٨٣٦ (٤٥٦٩) التفسير: باب قوله﴿و تقول هل من مزيد﴾؛ صحيح مسلم ٤/ ٢١٨٦ (٢٨٤٦) الجنة وصفة نعيمها واهلها: باب النار يدخلها الجبارون...... [2] سنن الترمذی ٥/ ٥٣٩ (٣٥٢٤) الدعوات : باب، علامہ البانی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے، صحیح سنن الترمذی (٢٧٩٨)

یہاں رحمت مخلوقہ مراد نہیں ہے، کیونکہ مخلوق کے ذریعہ تو استغاثہ اور مدد چاہنا جائز ہی نہیں ہے بلکہ یہ صفات الٰہیہ میں سے ایک صفت ہے۔یہ دعا مصیبت و بے قراری میں مفید ہے اس میں توحید واستغاثہ دونوں کو جمع کردیا گیا ہے اور دو الٰہی ناموں کو وسیلہ بنایا گیا ہے، یعنی "الحی القیوم"۔ یہ دونوں نام تمام اسمائے حسنیٰ کے معانی کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں، اس لیے کہ حیات کامل تمام صفات کاملہ کو چاہتی ہے۔کسی صفتِ کمال کا فقدان محض اسی بنا پر ہوسکتا ہے کہ اصل صفتِ حیات میں ضعف وکمزوری پائی جائے۔اللہ تعالیٰ اس عیب سے پاک ہے، پس ثابت ہو گیا کہ حیات کاملہ کے ساتھ تمام صفاتِ کمال بھی موصوف میں پائی جائیں اور جو صفات، ضعف وعیب کا پہلو رکھتی ہیں۔ ان سے ذات موصوف خالی ہو۔ اسی طریق سے اہل کلام اللہ کے لیے سمع (سننا) بصر (دیکھنا) کلام، ارادہ اور قدرت وغیرہ دوسری صفات کمالیہ ثابت کرتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا نام قیوم بھی اس کی کمال بے نیازی اور قدرت کو ظاہر کرتا ہے۔کیونکہ جو خود بذاتہ قائم ہو، وہ اپنے قیام وبقا میں کب کسی دوسرے کا محتاج ہوسکتا ہے بلکہ وہ تو دوسروں کو بھی قیام وبقا بخشنے والا ہے۔اس کی مرضی کے بغیر کوئی بھی اپنا وجود حاصل نہیں کرسکتا۔

الحاصل مذکورہ بالا دعا کے ساتھ پناہ طلب کرنے سے تمام صفاتِ کمالیہ اور اسمائے حسنیٰ کا تصور دل میں سما جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت صفت اس آیت میں بھی مذکور ہے:

﴿رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا﴾ (٤٠/ المؤمن: ٧)

جس طرح اس کا علم عام ہے اسی طرح اس کی رحمت بھی سب کو شامل ہے۔[1]

---

[1] بدائع: ٢/ ١٨٣۔

تفسیر صلّوا علیه وسلّموا تسلیما

سوال اس میں کیا حکمت ہے کہ سلام کے حکم کے ساتھ "تسلیما" مصدر تاکیدی بھی لایا گیا ہے، لیکن صلوٰۃ کو بلا مصدر ذکر کیا گیا ہے؟

جواب صلوٰۃ کے ساتھ تاکیدی مصدر اس لیے نہیں مذکور ہوا کہ اس سے قبل اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے نبی پر صلوٰۃ بھیجنے کا ذکر ہے۔ اس کے سنتے ہی ایک مسلمان کا دل صلوٰۃ بھیجنے کے لیے اُبھرآتا ہے۔ اس کے بعد محض امر بلا تاکید کافی تھا۔ سلام کا ذکر پہلے نہیں ہوا تھا اس لیے مصدر تاکیدی کے ساتھ اس کو بیان کیا۔ [1]

صلوۃ علی رسول اللہ کی لغوی توجیہ

سوال کیا صلوٰۃ کے معنی رحمت کے ہیں؟

جواب صلوٰۃ بمعنی رحمت ہے، یہ قول تین وجوہ سے باطل ہے:

① اللہ تعالیٰ نے دونوں کو الگ الگ بیان کیا ہے۔ (عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ) صلوٰۃ کا رحمۃ پر عطف ہے۔

② رحمت کی طلب ہر مسلمان کے لیے شرعًا جائز ہے اور صلوۃ، رسول اللہ ﷺ اور آپ کی آل کے ساتھ مخصوص ہے۔ اسی لیے بہت سے علما آپ کے علاوہ کسی معین شخص کے لیے صلوٰۃ کو ناجائز قرار دے دیتے ہیں۔ لیکن "رحمت" کے لیے یہ حد بندی کسی نے نہیں کی۔

③ اللہ تعالیٰ کی رحمت عام ہے، ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور صلوۃ، صرف خاص بندوں ہی کے لیے ہے۔

صلوۃ بمعنی دعا بھی چند وجوہ کی بنا پر درست نہیں۔

ا۔ دعا (دعوتُ) کا صلہ لام آتا ہے اور صلوۃ (صلیتُ) کا علیٰ۔
اگر دعا کے بعد علیٰ آ بھی جائے تو اس کے معنی بالکل برعکس ہو جائیں گے۔

---

[1] بدائع: ۲/ ۱۸۸۔

۲۔ فعل دعا یدعو (جو چیز طلب کی جائے) اور مدعولہٗ (جس کے لیے طلب کی جائے) دونوں کو طلب کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "دعوتُ اللّٰه لك بخير" اور فعل صلوٰۃ اس بات کا مطالبہ نہیں کرتا۔ یوں نہیں کہا جاتا، "صليتُ اللّٰه لك و عليك۔"

امام سہیلی نے اس مقام پر ایک نہایت لطیف بحث لکھی ہے:

لفظ صلوٰۃ کے تمام صیغوں میں شفقت، میلان (عطف و حنو) کے معنی پائے جاتے ہیں یہ شفقت و میلان محسوس بھی ہوتا ہے اور غیر محسوس (عقلی) بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف اسی میلان و شفقت کی نسبت کی جائے گی جو اس کے جلال کے مناسب ہے اور اس میلان و شفقت کی نسبت سے پرہیز کیا جائے گا جس سے اس کی ذات پاک ہے۔ مثلاً علو (بلندی) محسوس بھی ہے اور معقول بھی۔

ظاہری محسوس بلندی جسم کی صفت ہے اور غیر محسوس عقلی بلندی اللہ تعالیٰ کے لیے موزوں ہے اور یہ معنی کثرت کے ساتھ صفات میں پایا جاتا ہے۔

''کثیر'' محسوسات اور معقولات دونوں کی صفت بن سکتی ہے، اسمائے الٰہیہ میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ اجسام و ابدان کی مشابہت و مماثلت سے بالاتر ہے۔ اس کی طرف نسبت معقول (غیر حسی) معانی کی ہی کی جاسکتی ہے۔

اس بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ صلوٰۃ کے معنی حنو و عطف کے ہی ہیں "اللّٰهم اعطف علينا" یعنی "ارحم علينا"۔ شعر

وما زلت فی لینی له و تعطفی　　علیه کما تحنو علی الولد الأم

بندوں کی رحمت سے مراد دل کی رقّت اور نرمی ہے۔ جب رحم کرنے والا اس کو اپنے دل میں پاتا ہے تو مرحوم (جس پر رحم کیا جائے) پر جھک جاتا ہے۔ اور بندوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت بمعنی جود و کرم ہے۔ صلی علیه کے معنی ہوئے افضل علیه (مہربانی کی)۔ جب یہ افعال اللہ اور بندے کی طرف

منسوب ہوں تو علیٰ کے ساتھ ان کا استعمال ہوتا ہے اور خیر کے ساتھ خاص ہوتے ہیں۔ ان سب افعال کا مرکز ایک ہی ہے۔

مگر صرف اتنی بات ہے کہ رحمت اور دعا کے معنی لینے کی صورت میں عقلی صلوٰۃ مراد ہوگی۔ غیر محسوس جھکنا، جس کا ثمرہ اور نتیجہ بندے کی طرف سے دعا ہے کیونکہ اس سے زیادہ کی وہ قدرت نہیں رکھتا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے احسان و انعام ہے۔

حاصل یہ کہ لفظ صلوٰۃ فی نفسہ اپنے معنی میں کوئی اختلاف نہیں رکھتا۔ اختلاف جو کچھ بھی ہے وہ اس پھل اور نتیجہ میں ہے جو اس سے ظاہر ہوتا ہے۔

رکوع و سجود والی صلوٰۃ میں "انحناء" (جھکنا) محسوس طور پر پایا جاتا ہے۔ تو اس صورت میں بھی کوئی حقیقی اختلاف موجود نہیں، فرق صرف معقول و محسوس کا ہے۔ اسی بنا پر ان تمام افعال کا صلہ علیٰ آتا ہے اور صلوٰۃ سے مشتق لفظ سے موافقت پائی جاتی ہے۔ ہاں! "صليت على العدو" بمعنی "دعوتُ عليه" نہیں کہہ سکتے۔ صلوٰۃ کے معنی رحمت کے مفہوم سے کہیں زیادہ لطیف اور بلیغ ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ سرچشمہ اس کا بھی رحمت ہی ہے، اس لیے کہ ہر رحم کرنے والے کے لیے مرحوم پر مائل ہونا اور جھکنا لازمی نہیں۔ [1]

اسرار "اللّٰھم" اور "رَبّ"

قرآن مجید میں اکثر دعائیں رب کے ساتھ شروع ہوتی ہیں۔ مثلاً

﴿رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا﴾ (۳/ آل عمران:۱۹۳)

﴿رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي﴾ (۲۸/ القصص: ۱۶)

اس میں راز یہ ہے کہ سوال کے موقعہ پر اس ربوبیت (پروردگاری) کو ذریعہ بنایا جاتا ہے جو کہ قدرت، احسان اور بندے کی تربیت واصلاح کو شامل ہے۔ حمد وثنا

---

[1] بدائع الفوائد: ۱/ ۲۶، ۲۷۔

کے موقع پر اس کی الوہیت (خدائی) کو وسیلہ قرار دیا جاتا ہے جو کہ تمام صفات حسنہ اور کمالات عالیہ کی جامع ہے۔ قرآن میں تدبر کرنے سے حمد وثنا کے موقعہ پر اسمائے حسنیٰ خصوصاً اسم اللہ کا ذکر ملے گا، فرمایا:

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ﴾ (۱/ الفاتحة:۱)

﴿ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ ﴾ (۳۰/ الروم:۱۷)

﴿ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ ﴾ (۳۷/ الصافات:۱۸۰)

﴿ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ ﴾ (۵۷/ الحدید:۱)

﴿ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (۷/ الأعراف:۵۴)

﴿ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ (۲۳/ المومنون:۱۴)

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ...... ﴾ (۲۵/ الفرقان:۱)

صرف ایک مقام دعا ایسا ہے جہاں اللہ اور رب دونوں کو یکجا بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے:

﴿ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ﴾ (۵/ المائدة:۱۱۴)

''اے اللہ ہمارے رب! اتار ہم پر دسترخوان آسمان سے۔''

یہاں ان دونوں اسموں کو بیان کرنے میں خاص حکمت ہے۔ یہ دعا قوم مسیح کے ایک سوال کے بعد تھی۔ قوم نے مطالبہ کیا تھا:

﴿ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ﴾

(۵/ المائدة:۱۱۲)

''کیا تیرا رب آسمان سے ایک دسترخوان اتار سکتا ہے؟''

مسیح علیہ السلام نے اس مطالبہ پر اللہ کے غضب سے ان کو ڈرایا دھمکایا اور بتلایا کہ اس قسم کا سوال اللہ کے حضور میں پیش کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ جب انہوں نے بہت ہی اصرار اور ضد کی، اور مسیح علیہ السلام کو یہ اندیشہ ہوا کہ ان کا مطالبہ پورا نہ ہوا تو ممکن ہے کہ شک کے جراثیم ان کے دل میں جگہ پکڑ جائیں۔ ان کے

منہ سے یہ کلمات نکلے "اللھم ربنا......الخ" لفظ اللہ کے لانے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ تمام کمالات عالیہ اور صفات حسنہ کا مرکز سرچشمہ ہے۔ یہ کہ اس دعا اور مطالبہ سے مقصود صرف یہ ہے کہ اس کی حمدوثنا کی جائے۔ اس کی قدرت کمال اور ربوبیت کے مناظر آشکارا کیے جائیں اور اس کے رسول کی سچائی واضح کردی جائے۔ ایسے موقع پر حمدوثنا ضروری تھی اور چونکہ سوال ودعا کا مقام تھا اس لیے صفت ربوبیت کا ذکر بھی لازمی تھا۔ اس بنا پر یہاں اللہ اور رب دونوں مذکور ہیں۔ [1]

[1] بدائع: ۲/ ۱۹۴۔

چند قرآنی کلمات کی تاویل وتشریح

دعوت الی اللہ

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ (١٦/ النحل:١٢٥)

''اپنے رب کے راستہ کی طرف بلاحکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اوران سے بحث کراپسے طریقہ کے ساتھ جو بہتر ہو۔''

جن کو حق کی دعوت دی جاتی ہے ان کی تین قسمیں ہیں:

① متذکر منیب (نصیحت قبول کرنے والا، جھکنے والا) ایسا شخص امرونہی کا زیادہ محتاج ہوتا ہے۔ حکمت کے ساتھ اس کو راہ حق کی طرف بلایا جائے گا۔

② غفلت واعراض میں مبتلا، ایسے انسان کو ترغیب (رغبت دلانے) ترہیب (ڈرانے) کی زیادہ ضرورت ہے۔ موعظہ حسنہ اسی کے لیے ہے۔

③ معارض متکبر، فخر وتکبر کے ساتھ مقابلہ اور کج بحثی کرنے والا، ایسا مخاطب بحث ومجادلہ کے بغیر قائل نہیں ہوسکتا۔ اس کو مجادلہ حسنہ کے ذریعہ مطمئن کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

نکتہ

حکمت کی صفت حسنہ بیان نہیں ہوئی ہے، حکمت سرتاپا حسن ہے اس کا کوئی فرد بھی حسن سے خالی نہیں ہے۔ اس کے لیے حسنہ صفت لانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ مگر ہر موعظۃ (نصیحت) حسنۃ (اچھی) نہیں ہے اس لیے اس کے بعد حسنہ کی صفت ذکر ہوئی ہے۔

یہی حال جدال وبحث کا بھی ہے، ان کا اچھا پہلو بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔

﴿ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ کے دو مطلب ہوسکتے ہیں:

① مجادل (بحث کرنے والے) کی حالت اچھی ہونی چاہیے، یعنی نہایت نرمی

اور محبت سے بحث وگفتگو میں حصہ لے۔

② جو دلائل وبراہین بحث میں پیش ہوں۔وہ ایسے احسن، واضح اور کامل ہونے چاہییں کہ اصل مقصود نگاہوں سے اوجھل نہ رہنے پائے۔

بعض متاخرین علما نے اس آیت کو منطقی قیاس کی قسموں پر چسپاں کیا ہے، یہ درست نہیں ہے۔حکمت سے مراد برہانی طریقہ،موعظہ حسنہ سے مطلب طریق خطابت اور مجادلہ حسنہ سے مقصود طریقہ جدل لیا گیا ہے۔اس قسم کی تفسیر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن حکیم کو یونانی منطق کے قوانین پر ڈھال لیا جائے۔یہ صورت یکسر غلط ہے۔

ایام

﴿وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللَّهِ﴾ (١٤/ ابراهيم: ٥)

''اور نصیحت کران کو اللہ کے دنوں کے ساتھ۔''

ایام سے مراد وہ نعمتیں اور مصیبتیں ہیں جو بندوں پر اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔یہ بڑی بڑی نعمتیں نیکوں پر اور ہولناک حوادث ومصائب نافرمانوں پر ایام ہی میں اترے ہیں اس لیے ان نعمتوں اور مصیبتوں کو ایام کہہ دیا گیا ہے۔جیسے کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص ایام عرب سے واقف ہے یعنی اُن بڑے بڑے حوادث اور واقعات سے باخبر ہے جو اُن دنوں میں ظاہر ہوئے تھے۔ان ایام کی معرفت سے بندے کی بصیرت اور عبرت ونصیحت قبول کرنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔جیسا کہ فرمایا:

﴿لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ﴾ (١٢/ يوسف: ١١١)

''بیشک ان کے بیان میں عقل والوں کے لیے عبرت کا سامان ہے۔''

اعتصام

﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا﴾ (٣/ آل عمران: ١٠٣)

''اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو۔''

اعتصام کا لفظ عصمت سے نکلا ہے یعنی ایسی چیز کو مضبوطی سے تھامنا جو خطرناک اور نقصان دہ چیز سے بچا دے،اسی لیے عصمت کے معنی حمیت کے آتے ہیں۔قلعوں کو اسی بنا پر عواصم کہا جاتا ہے وہ دشمن سے محفوظ رکھتے اور بچاتے ہیں۔

دنیا اور آخرت کی سعادت وکامیابی کا مدار دو چیزوں پر ہے:

① اعتصام باللہ، جیسا کہ فرمایا:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۭ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ﴾ (۲۲/ الحج:۷۸)

''اور اللہ کو مضبوطی سے پکڑلو۔''

② اعتصام بحبل اللہ

ان دونوں کے بغیر نجات ناممکن ہے۔اعتصام بحبل اللہ گمراہی اور ضلالت سے بچاتا ہے اور اعتصام باللہ ہلاکت وتباہی سے محفوظ رکھتا ہے۔کیونکہ جس طرح عام مسافر صحیح راستہ کی واقفیت اور راستہ کے خطرات سے حفاظت کا محتاج ہوتا ہے۔اسی طرح راہ حق کا مسافر بھی سیدھی راہ کی ہدایت اور سلامتی کا حاجت مند ہے۔راہنما(راستہ بتانے والے) کا وجود بے راہ روی اور بھٹکنے سے بچالیتا ہے۔قوت، اسلحہ اور حفاظتی ساز وسامان راستہ کے ڈاکوؤں اور چوروں کے نرغہ میں پھنسنے سے محفوظ رکھتا ہے۔اسی طرح راہ حق کا مسافر بھی سیدھی راہ کی طرف ہدایت اور ضلالت سے سلامت ومحفوظ رہنے کا حاجت مند ہے۔

''اعتصام بحبل اللہ''ہدایت کا سبب بنتا ہے اور''اعتصام باللہ''مادی قوت اور اسلحہ کا سبب ہے۔جس کے ذریعہ انسان راہ حق کی آفات سے بچ جاتا ہے۔

سلف کی عبارات ''اعتصام بحبل اللہ''کی شرح میں مختلف ہیں۔لیکن سب کا مرکز یہی تفسیر ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔اقوال مختصراً درج ذیل ہیں:

① ابن عباس رضی اللہ عنہما: دین اللہ۔

② ابن مسعود رضی اللہ عنہ: الجماعۃ یعنی جماعت مسلمہ کی پابندی اور افتراق (فرقہ بندی) سے پرہیز۔

③ مجاہد وعطاء رحمۃ اللہ علیہما: عھد اللّٰہ۔

④ قتادہ، سدی رحمۃ اللہ علیہما: قرآن۔

⑤ مقاتل اللہ کا حکم اور اس کی اطاعت۔

فرار الی اللہ

﴿ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ﴾ (۵۱/ الذاریات:۵۰)

''پھر بھاگو اللہ کی طرف۔''

فرار کے معنی، ایک شے سے دوسری شے کی طرف بھاگنے کے ہیں۔

اس کی دو قسمیں ہیں:

① اولیا کا فرار اللہ کی طرف۔

② نافرمانوں کا فرار غیر اللہ کی جانب۔

الجہل

﴿ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۶۷)

''میں اللہ کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں کہ میں ہو جاؤں جاہلوں میں سے۔''

جہل کے دو معنی ہیں:

① حق سے بے خبر رہنا۔

② صحیح علم کے ہوتے ہوئے اس پر عمل نہ کرنا۔

جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

﴿ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴾

(۱۲/ یوسف:۳۳)

''اور اگر نہیں ہٹائے گا تو مجھے ان کے مکر سے، تو میں ان کی طرف جھک جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔''

علم الیقین

علم الیقین خبر سے حاصل ہوتا ہے، پھر وہی چیز دل یا آنکھ پر منکشف (ظاہر)

ہوجاتی ہے تو عین الیقین کی لذت سے ہمکنار ہوجاتا ہے۔پھر زیادہ ممارست اور تعلق سے حق الیقین کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔جنت ودوزخ کا علم دنیا میں علم الیقین کی حد تک ہے۔ قیامت کے روز جب کہ قریب سے ان دونوں کو دیکھیں گے تو عین الیقین کا مرتبہ حاصل کرلیں گے۔ پھر جنت یادوزخ میں داخل ہونے کے بعد حق الیقین کا نظارہ سامنے ہوگا۔

السماع

مسموعات کی تین قسمیں ہیں:

❶ پسندیدہ ❷ حرام ❸ مباح

قسم اول،آیات قرآنی کا سماع (سننا) یہ سماع،ایمان کی بنیاد اوراصل ہے اس کی تین قسمیں ہیں:

1. سماع حاسہ، یعنی کان سے سننا۔جیسا کہ فرمایا:

﴿ اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۙ﴾ (۷۲/ الجن:۱)

''ہم نے عجیب قرآن سنا۔''

2. سماع فہم وعقل،یعنی اس طرح سننا کہ بات سمجھ میں آجائے۔مثلاً فرمایا:

﴿ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى ﴾ (۲۷/ النمل:۸۰)

''بیشک تم نہیں سناتے مردوں کو۔''

یعنی کفار کی عقلوں میں تم بات نہیں اتار سکتے۔

3. سماع قبول، یعنی اطاعت وفرمانبرداری،جیسا کہ فرمایا:

﴿ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۤ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۸۵)

''ہم نے سنا اوراطاعت کی۔''

یہاں سماع کے تینوں معنی پائے جاتے ہیں۔

﴿ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۭ﴾ (۹/ التوبۃ: ۴۷)

''اورتم میں ان کی باتیں سننے والے ہیں۔''

یعنی قبول کرنے والے ہیں۔ سماعون سے جاسوس مراد لینا درست نہیں ہے۔

خوف

کسی ہولناک شے کی وجہ سے دل کا اضطراب۔

خشیة: ایسا خوف جو معرفت کے ساتھ ہو اس حالت میں سکون و اطمینان پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَٰٓؤُا ﴾ (۳۵/ فاطر: ۲۸)

''بس اللہ کے بندوں میں سے اس سے ڈرنے والے علما ہی ہیں۔''

جو شخص دشمن یا سیلاب کو دیکھتا ہے اس کی دو حالتیں ہوتی ہیں:

① بھاگنے کے لیے حرکت، یہ خوف کی حالت ہے۔

② کسی ایسی جگہ پناہ لینا، جہاں دشمن یا سیلاب نہ پہنچ سکے۔ اس کا نام خشیت ہے۔

رھبة: ناپسندیدہ شے سے بھاگنے میں پوری قوت صرف کرنا۔

وجل: کسی کے غلبہ یا سزا کے ڈر سے دل کانپ جانا۔

ھیبة: ایسا خوف جس کے ساتھ تعظیم کی آمیزش ہو۔

خوف عام مؤمنین کا شیوہ ہے، خشیت، علما کا نشان ہے اور ہیبت اصحاب محبت کی علامت ہے اور اجلال مقربین کا شعار ہے۔ صاحب خوف بھاگنے اور باز رہنے میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ لیکن صاحب خشیت علم کے قلعہ کو ملجا و ماویٰ بناتا ہے۔ ان دونوں کی مثال طب سے ناواقف مریض اور ماہر طبیب کی سی ہے۔ پہلا مرض سے بچنے کے لیے بھاگنے کی راہ اختیار کرتا ہے اور دوسرا دواؤں اور علاج کے ذریعہ بیماری کو دور کرتا ہے۔

خوف کے تین درجے ہیں:

① سزا کا خوف، ایمان کا مدار اسی پر ہے، عوام کا ڈر اسی درجہ کا ہوتا ہے، یہ خوف وعید کی تصدیق، گناہوں پر متنبہ ہونے اور انجام پر نگاہ رکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔

② اس بات سے خوف کہ اللہ کی یاد میں جو بیداری حاصل ہوئی ہے۔ اس کی مٹھاس اور لذت فریب حس اور خود پسندی میں مبتلا نہ کردے۔

③ یہ خواص کا درجہ ہے، اللہ سے مناجات اور سرگوشی کرتے وقت اس بات کا خوف کہ کہیں اس کی ہیبت وجلال اس سلسلہ کو منقطع نہ کردے۔

اشفاق

اشفاق اس خوف کو کہتے ہیں جس میں رحمت کی آمیزش ہو، یعنی خائف جس سے خوف کھا رہا ہے اس سے رحمت وشفقت کا تعلق ہو۔ اشفاق اور خوف کے درمیان فرق، رأفت ورحمت کا طرح ہے۔ رأفت میں رحمت سے زیادہ رقت اور لطافت پائی جاتی ہے۔ اس کی بھی کئی صورتیں درج ہیں:

① نفس کے بارے میں خوف کہ کہیں عناد وسرکشی پر نہ جھک جائے، عمل کے ضائع ہوجانے کا اندیشہ بے چین رکھے۔ مخلوق کے بارے میں خوف کہ اس کے عذر معلوم کیے جائیں۔

② وقت کے بارے میں خوف کہ یکسوئی اور دلجمعی میں انتشار اور پراگندی نہ پیدا ہو، دل میں کسی شہوت یا شبہ کی بنا پر وساوس نہ پیدا ہوں اور قوت یقین کے ظاہری اسباب کمزور نہ کردیں۔

③ مؤمن کی کوششیں، خود پسندی اور عجب سے برباد نہ ہوں اور اپنے آپ کو مخلوق کے ساتھ جھگڑے سے باز رکھا جائے۔ اور سعی وجہد کا سلسلہ دائمی رہے اس میں کوئی کمزوری نہ آنے پائے۔

خشوع

﴿أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ﴾

(۵۷/ الحدید: ۱٦)

''کیا مومنوں کے لیے وقت نہیں آ گیا ہے کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کے لیے جھک جائیں۔''

خشوع کہتے ہیں کہ دل پوری یکسوئی، عاجزی اور ذلت کے ساتھ اللہ کی طرف جھک جائے۔ لغت عرب میں خشوع کے معنی سکون، ذلت اور جھکنے کے ہیں۔

﴿ خَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ ﴾ (۲۰/ طه:۱۰۸)

''آوازیں پست ہوگئیں رحمٰن کے لیے۔''

﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً ﴾ (۴۱/ فصّلت: ۳۹)

''اوراس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تم دیکھتے ہوکہ زمین خاشع ہے۔''

یعنی خشک اور بے سبز ہے، تروتازگی اور پیداوار سے محروم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ خشوع کہتے ہیں، شہوت وخواہش کی آگ ٹھنڈی پڑ جائے، دل کا دھواں ٹھہر جائے اور دل میں تعظیم کی روشنی چمک اٹھے۔

عارفوں کا اتفاق ہے کہ خشوع کا مرکز دل ہے اور اس کے ثمرات ظاہری اعضا پر نمایاں ہوتے ہیں۔ گویا یہ اعضا باطنی خشوع کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ نماز میں اپنی ڈاڑھی سے کھیل رہا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس کا دل خاشع ہوتا تو اس کے اعضا بھی خشوع سے بہرہ مند ہوتے۔ [1]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((التقوی ھھنا)) ''تقویٰ یہاں ہے۔''

اورآپ نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا۔ [2]

---

[1] مصنف عبدالرزاق ۲/ ۲۶۶ (۳۳۰۸) الصلاۃ: باب العبث فی الصلاۃ؛ مصنف ابن ابی شیبہ ۲/ ۲۸۹ الصلاۃ: باب فی مسح اللحیۃ فی الصلاۃ، یہ مرفوع روایت نہیں بلکہ سعید بن المسیب رحمہ اللہ کا قول ہے۔

[2] الترمذی ۴/ ۳۲۵ (۱۹۲۷) البر والصلۃ: باب ماجاء فی شفقۃ المسلم علی المسلم۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''خشوعِ نفاق سے بچو، یعنی بدن تو خاشع ہو لیکن دل اس نعمت سے محروم ہو۔'' [1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز میں اپنی گردن جھکائے ہوئے ہے۔آپ نے فرمایا:خشوع گردن میں نہیں بلکہ دل میں ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے چند نوجوانوں کو دیکھا کہ وہ نہایت سست رفتار سے چل رہے ہیں۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟جواب ملا،یہ زاہدوں کا گروہ ہے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب چلتے تیز چلتے،جب بات کرتے تو خوب زور سے کرتے یہاں تک کہ مخاطب سن لیتا،جب مارتے تو گہری چوٹ لگاتے اور جب کھلاتے تو پوری طرح آسودہ کر دیتے درحقیقت وہی زاہد تھے۔

مقام ربّہ

﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ﴾ (٥٥/ الرحمن:٤٦)

''اور اس کے لیے جو اپنے رب کے مقام سے ڈر گیا دو باغ ہیں۔''

﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى﴾

(٧٩/ النازعات:٤٠)

''اور لیکن جو ڈر گیا اپنے رب کے مقام سے اور نفس کو خواہش سے روک دیا۔''

ان آیتوں کے دو مطلب ہیں:

① جس نے یہ جان لیا کہ رب کا مقام کیا ہے یعنی اس کی ربوبیت کس قدر پھیلی ہوئی ہے اور اس کے علم کی وسعتیں کتنی بے پایاں ہیں۔اس کی ربوبیت اور علم کے صحیح تصور کے بعد گناہ سے پرہیز اور اطاعت کا جذبہ پیدا ہو جانا لازمی

[1] مصنف ابن ابی شیبہ ١٤/ ٥٩(١٧٥٥٩) یہ قول حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

ہے۔

② بندہ قیامت کے روز اپنے رب کے حضور میں مقام (کھڑے ہونے) سے ڈرتا ہے۔

یہ مطلب آیت کے زیادہ مناسب ہے۔ [1]

[1] (مدارج السالکین ۱/ ٤٤٥-٥٢٣) ببعض التصرف۔

تاویل کے معنی لغت اور قرآن میں

تاویل

لفظ تاویل بروزن تفعیل اوّل یأوّل سے نکلا ہے جس کے معنی لوٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں۔ اس اعتبار سے تاویل کے معنی ہوئے لوٹانا، پھیرنا۔

اسی بنا پر انجام اور نتیجہ کو تاویل کہا گیا ہے جیسا کہ فرمایا:

﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾

(٤/ النساء:٥٩)

''پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹادو، اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ نتیجہ کے اعتبار سے بہتر اور اچھا ہے۔''

اور اسی لیے کسی شے کی حقیقت اور اصلیت کو بھی تاویل کہا جاتا ہے، فرمایا:

﴿هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ يَقُولُ الَّذِينَ نَسُوهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ﴾ (٧/ الاعراف:٥٣)

''نہیں انتظار کرتے ہیں مگر اس کی تاویل کا، جس دن اس کی تاویل آجائے گی تو وہ لوگ کہیں گے جو اس کو پہلے بھول گئے تھے، بیشک ہمارے رب کے رسول حق لائے تھے۔''

یہاں تاویل کے معنی یہ ہیں کہ رسولوں نے جن امور (آخرت، جنت اور دوزخ) کے آنے کی خبر دی تھی۔ وہ بعینہ بے نقاب ہوکر سامنے آجائیں گے۔

انہی دو معنوں کے لحاظ سے خواب کی تعبیر کو بھی تاویل کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿يَا أَبَتِ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِنْ قَبْلُ﴾ (١٢/ یوسف:١٠٠)

''اے میرے باپ! یہ میرے خواب کی تاویل (حقیقت واصلیت یا نتیجہ) ہے۔''

کبھی کسی کام کی علت، غرض اور حکمت کو بھی تاویل کہہ دیتے ہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کشتی کو پھاڑنے، غلام کو قتل کرنے اور بلامعاوضہ دیوار بنانے کی غرض وحکمت بتانے کے بعد فرمایا:

﴿ذٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا﴾ (۱۸/ الكهف:۸۲)

''یہ ان باتوں کی تاویل (علت، غرض اور حکمت) ہے جن پر تم صبر نہ کرسکے۔''

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ قرآن میں تاویل کا معنی مفہوم ہے۔ معنی کی وہ حقیقت جو لفظ کا مرکز ومرجع بنتی ہے اور خارج میں موجود ہوتی ہے۔

یہ اس لیے کہ عربی میں کلام کی دو قسمیں ہیں: خبر اور طلب۔ خبر کی تاویل سے مراد اس کی حقیقت اور وعد و وعید کی تاویل کا مفہوم بعینہ وہی موعود (جس کا وعدہ کیا گیا ہے) یا متوعد منہ (جس سے دھمکایا گیا ہے) تاویل صفات سے صفات کی حقیقت مراد ہے اور تاویل امر سے بعینہ وہی افعال مقصود ہیں جن کا حکم دیا گیا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع وسجود میں سبحان ربی العظیم، سبحانك اللهم ربناو بحمدك اللهم اغفرلی اور سبحان ربی الاعلی پڑھا کرتے تھے۔ یتاول القرآن ''قرآن کی تاویل کرتے ہوئے، یعنی اس کے حکم پر عمل کرتے ہوئے۔'' [1]

سلف میں سے اہل تفسیر وحدیث وفقہ کے نزدیک تاویل کے معنی تفسیر

[1] صحیح البخاری ۱/ ۲۸۱ (۷۸٤) الصلوٰۃ: باب التسبیح والدعاء فی السجود؛ صحیح مسلم ۱/ ۳۵۰ (٤۸٤) الصلوٰۃ: باب مایقال فی الرکوع و السجود، لیکن صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت میں سبحان ربی العظیم اور سبحان ربی الاعلی کے الفاظ نہیں ہیں۔ یہ الفاظ امام ابوداؤد (۸۷۱) امام ترمذی (۲۶۲) اور امام ابن ماجہ (۸۸۸) نے نقل کیے ہیں۔

وبیان کے ہیں۔ متکلمین اورمتاخرین فقہا کے ہاں کسی لفظ کواس کے ظاہری معنی سے پھیر دینے کوتاویل کہتے ہیں۔ اس قسم کی تاویل بغیر قرینہ اور بے دلیل نہیں ہوسکتی۔

﴿وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا﴾

(۲۵/ الفرقان:۳۳)

''اور نہیں لائیں گے وہ تمہارے پاس مثال مگر ہم لائیں گے تمہارے پاس حق اور بہترین تفسیر۔''

حق سے مراد وہ معنی اورمفہوم ہے جس پر کتاب کے الفاظ مشتمل ہیں اور تفسیراحسن سے مقصود حق پردلالت کرنے والے الفاظ ہیں۔یہی الفاظ حق کی تفسیر وبیان ہیں۔تفسیر کے اصلی معنی بیان وظہور کے ہیں۔

''ف، س، ر''یہ الفاظ کسی ترتیب سے آئیں ان میں وضاحت ظہور اور چمک کے معنی ضرور ملحوظ ہوں گے۔کہا کرتے ہیں:

اسفر الفجر۔''یعنی صبح چمک اٹھی اورظاہر ہوگئی۔''

اس محاورہ سے لفظ سَفر بنا ہے کیونکہ مسافر گھر سے باہر نکلتا ہے۔اسی سے سِفر ہے جس کے معنی کتاب کے ہیں،وہ علم کے اظہار پر مشتمل ہوتی ہے۔

① ﴿وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا﴾ (٤/ النساء:١٦٤)

''اورکلام کیااللہ نے موسیٰ سے کلام کرنا۔''

''تکلیم''کے لفظ سے مجاز کا احتمال اُٹھ گیا،یہاں کلام کے حقیقی اوراصلی معنی مراد ہیں۔

② ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾

(۷/ الاعراف:٤٢)

''اورجولوگ ایمان لائے اورنیک اعمال کیے۔نہیں تکلیف دیتے ہم کسی نفس کو،مگر اس کی طاقت کے مطابق۔''

اس آخری فقرہ سے یہ وہم دور کر دیا گیا کہ تمام صالحات پر عمل کرنے کا انسان مکلّف بنایا گیا ہے۔

③ ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ كُلُّ امْرِیًٔۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۝ ﴾

(۵۲/ الطور:۲۱)

''اور جولوگ ایمان لائے اوران کی اولاد نے ان کی پیروی کی ایمان کے ساتھ، توہم ان کی اولاد کوان کے ساتھ شامل کردیں گے اورہم ان کے عمل میں سے کچھ کمی نہ کریں گے۔ہر شخص اپنی کمائی کا ذمہ دار ہے۔''

اس آیت میں کئی وہم دور کیے ہیں۔ایمان کے ساتھ پیروی سے یہ وہم دورکردیا کہ یہاں نسب،تربیت اورآزادی یاغلامی کے اعتبار سے اتباع مراد ہے اوراس کے یعنی باپ دادوں کے عمل میں سے کچھ کم نہ کریں گے۔اس سے مقصود یہ ہے کہ باپ دادوں کواولاد کے درجہ میں نہیں لایاجائے گا۔بلکہ اولاد کوترقی دے کر والدین کے درجہ میں کردیاجائے گا،خواہ عمل کے لحاظ سے کم رتبہ رکھتے ہوں۔

"کل امری ء بماکسب رھین"اس جملہ نے یہ وہم دورکردیا کہ اللہ تعالیٰ جس طرح صالحین کی اولاد صالحہ کو خواہ وہ نیکی میں کم ہوں ان کے ہم رتبہ بنادے گا۔اسی طرح کفار کی اولاد کے ساتھ بھی کرے گا۔یہ وہم غلط ہے ایسا نہیں ہوسکتا کہ سرکشی بغاوت میں مبتلا انسانوں کی اولادخواہ وہ نافرمانی میں کم ہی ہواپنے آباء واجداد کے ہم پلہ ٹھہرادی جائے۔کیونکہ ہر شخص اپنے عمل کاخودذمہ دار ہے۔دوسرے کے گناہوں کابار اس پرنہیں ڈالا جائے گا۔

﴿ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۳۲)

''اے نبی ﷺ کی بیویو! تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو بات میں لچک اور نرمی مت پیدا کرو، تاکہ وہ شخص امید نہ باندھ لے، جس کے دل میں مرض ہے، اور جو بات کہو اچھی کہو۔''

اس آیت کی ابتدا میں تقویٰ کا حکم دیا گیا ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ ہے کہ گفتگو میں نرمی اور انکساری پیدا ہو۔ اس لیے بعد میں فلا تخضعن بالقول فرمایا، ہوسکتا ہے کہ اس حکم سے ناپسندیدہ لفظ اور سخت کلامی کی اجازت کا وہم دل میں پیدا ہوجائے تو اس لیے فرمایا:

﴿ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۳۲)

''کہو اچھی بات۔''

﴿ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۷)

''کھاؤ پیو! یہاں تک کہ تمہارے لیے صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے ممتاز اور نمایاں ہوجائے۔''

یہاں ''من الفجر'' کے لفظ سے ''خیط'' (دھاگہ) سے عام دھاگہ مراد لینے کا وہم رفع کردیا گیا ہے۔

﴿ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴾ (۸۱/ التکویر:۲۸)

''جو چاہے تم میں سے سیدھا ہونا۔''

ان الفاظ سے یہ وہم پیدا ہوسکتا ہے کہ بندہ کی مشیت (چاہت) مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے بعد میں فرمایا:

﴿ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ﴾ (۸۱/ التکویر:۲۹)

''اور تم نہیں چاہو گے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے۔''

اسی کی نظیر سورۂ مدثر کی یہ آیت ہے:

﴿ كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ؕ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ؕ وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴾ (۷٤/ المدثر:٥٤۔٥٦)

''سچی بات تو یہ ہے کہ یہ (قرآن) ایک نصیحت ہے۔اب جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے اور وہ اس وقت نصیحت حاصل کریں گے جب اللہ تعالیٰ چاہے،وہ اسی لائق ہے کہ اس سے ڈریں اوراس لائق بھی کہ وہ بخشے۔''

﴿ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۱۱)

''اس کا وعدہ حق ہے تورات وانجیل میں۔''

اس کے بعد فرمایا:

﴿ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۱۱)

''اور اللہ سے زیادہ عہد کو پورا کرنے والا اور کون ہوسکتا ہے۔''

اس جملہ سے یہ وہم دور کردیا گیا کہ شاید اللہ تعالیٰ بھی اپنے وعدوں کو پورا نہ کرے۔

﴿ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ ﴾ (٦/ الانعام:۱٥۸)

''وہ انتظار نہیں کرتے ہیں مگر یہ کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تیرا رب آئے یا تیرے رب کی بعض نشانیاں آئیں۔''

"بعض آیات ربك" اس جملہ نے یہ وہم دور کردیا کہ "یاتی ربك" سے مراد اللہ تعالیٰ کا بذاتِ خود آنا مراد نہیں ہے بلکہ اس کی نشانی کا اترنا مراد ہے۔ [1]

دعوت الی اللہ

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ ﴾ (١٦/ النحل:۱۲٥)

[1] یہ بحث مختصر الصواعق سے لی گئی ہے۔

"اپنے رب کے راستے کی طرف بلا، حکمت اور اچھی نصیحت کے
ساتھ اور ان سے بحث کر ایسے طریقہ کے ساتھ جو بہتر ہو۔"

جن کو حق کی دعوت دی جاتی ہے، ان کی تین قسمیں ہیں:

① متذکر منیب (نصیحت قبول کرنے والا، جھکنے والا) ایسا شخص امر ونہی کا زیادہ محتاج ہوتا ہے، حکمت کے ساتھ اس کو راہ حق کی طرف بلایا جائے گا۔

② غفلت و اعراض میں مبتلا، ایسے انسان کو ترغیب (رغبت دلانے) اور ترہیب (ڈرانے) کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، موعظہ حسنہ اسی کے لیے ہو۔

③ معارض متکبر، فخر وتکبر کے ساتھ مقابلہ اور کج بحثی کرنے والا، ایسا مخاطب بحث و مجادلہ کے بغیر قائل نہیں ہوسکتا، اس کو مجادلہ حسنہ کے ذریعہ مطمئن کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

نکتہ: حکمت کی صفت حسنہ نہیں بیان ہوئی ہے، حکمت سرتاپا حسن ہے، اس کا کوئی فرد بھی حسن سے خالی نہیں، اس کے لیے حسنہ صفت لانے کی ضرورت ہی نہ تھی، مگر ہر موعظہ (نصیحت) حسنہ (اچھی) نہیں ہے۔ اس لیے اس کے بعد حسنہ کی صفت ذکر ہوئی ہے۔ یہی حال جدال و بحث کا بھی ہے، ان کا اچھا پہلو بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔

﴿وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ﴾ (١٦/ النحل:١٢٥)

کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

① مجادلہ (بحث کرنے والے کی حالت اچھی ہونی چاہیے، یعنی نہایت نرمی اور محبت سے بحث و گفتگو میں حصہ لے۔

② جو دلائل و براہین بحث میں پیش ہوں وہ ایسے بہترین، واضح اور کامل ہونے چاہییں کہ اصل مقصود نگاہوں سے اوجھل نہ رہنے پائے۔

بعض متاخرین علمانے اس آیت کو منطقی قیاس کی قسموں پر چسپاں کیا ہے، یہ درست نہیں ہے، حکمت سے مراد برہانی طریقہ، موعظہ حسنہ سے مطلب، طریق

خطابت اور مجادلہ حسنہ سے مقصود طریقہ جدل لیا گیا ہے، اس قسم کی تفسیر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن حکیم کو یونانی منطق کے قوانین پر ڈھال لیا جائے یہ صورت یکسر غلط ہے۔

[1] مدارج السالکین: ١/ ٤٤٥، ٤٤٦۔

ایک اصولی بحث

قرآنی الفاظ تین قسم پر ہیں:

① ایسے الفاظ جن کی تشریح اور مفہوم کو ساتھ ہی بیان کر دیا گیا ہے، مثلاً فرمایا:

﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾

(۲/ البقرة: ۱۸۷)

"یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے تمہارے لیے سفید دھاگہ سیاہ دھاگے سے صبح سے۔"

یہاں "من الفجر" نے "خیط" کی تفسیر خود ہی کر دی ہے۔

﴿لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (٤/ النساء: ٩٤)

"مومنوں میں سے بے عذر بیٹھنے والے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے برابر نہیں ہیں۔"

یہاں "غیر اولی الضرر" نے "قاعدون" کی مراد کو واضح کر دیا ہے۔

② ایسے کلمات جن کی تفسیر دوسری آیات میں ملتی ہے۔ مثلاً ارشاد ہے:

① ﴿وَالْوٰلِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾

(۲/ البقرة: ۲۳۳)

"اور مائیں دودھ پلاتی ہیں اپنی اولاد کو پورے دو سال۔"

دوسری آیت میں ہے:

﴿وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾ (٤٦/ الاحقاف:١٥)

"حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ ہے۔"

ان دو آیتوں کے ملانے سے نتیجہ نکلتا ہے کہ حمل کی کم سے کم مدت چھ ماہ

ہے۔

② ﴿وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً﴾ (٤/ النساء:١٢)

''اور جن کی میراث لی جاتی ہے وہ مرد یا عورت کلالہ ہو۔''

اس آیت میں''کلالہ'' کا حکم مذکورہ ہے اوردوسری آیت میں''کلالہ''کی تفسیر کردی ہے۔فرمایا:

﴿قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ﴾ (٤/ النساء:١٧٦)

''آپ کہہ دیجیے کہ اللہ تعالیٰ (خود)تمہیں کلالہ کے بارے میں فتوی دیتا ہے۔''

③ ﴿اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ﴾ (٦٥/ الطلاق:٦)

''یعنی ان کوٹھہراؤ جہاں تم رہتے ہو،اپنی طاقت کے مطابق۔''

دوسری آیت میں ہے:

﴿فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾

(٦٥/ الطلاق :٢)

''پھر جب وہ پہنچ جائیں اپنی مدت کوتو پھرروک لیں ان کوبھلائی کے ساتھ،یا جدا کردیں ان کو بھلائی کے ساتھ۔''

دونوں آیتوں کو یکجا کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم مطلقہ رجعیہ کے لیے ہے،بائنہ کے لیے نہیں ہے۔

④ ایسے قرآنی کلمات جن کی تفسیر وتشریح نبی ﷺ کے ذمہ رکھی گئی ہے جیسے صلوٰۃ، زکوٰۃ ، صوم، حج اوردوسرے فرائض اسلام نماز، روزہ وغیرہ کے آداب وہیئات اورمقادیر کوآنحضرت ﷺ نے بیان فرمایا ہے، ان کاتفصیلی ذکرقرآن میں نہیں ہے۔

﴿وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ﴾ (٣/ آل عمران:١٨)

''اورعلم والے قائم ہیں انصاف کے ساتھ۔''

یہاں علم سے مراد وحی الٰہی ہے جس کا نزول انبیائے کرام پر ہوا ہے۔فلسفہ وکلام کا علم مراد نہیں ہے۔اوریہی معنی ربّ زدنی علما کے ہیں۔

﴿لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ﴾ (٤/ النساء:١٦٦)

"لیکن اللہ گواہی دیتا ہے اس کی جواس نے اتارا ہے آپ کی طرف، اس نے اتارااس کوعلم کے ساتھ۔"

"بعلمہ" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جوکچھ اتارا ہے اس کا علم بھی اسی میں ہے جسے کوئی بشر بغیر وحی کے نہیں جان سکتا۔یہی مطلب اس آیت کا بھی ہے:

﴿فَاِلَّمْ يَسْتَجِيبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ﴾

(١١/ هود: ١٤)

"پھر اگر وہ تمہاری بات نہ مانیں توتم جان لوکہ کتاب اللہ علم کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔"

یعنی کتاب اتاری گئی ہے بحالیکہ اس میں اللہ کا علم ہے۔اس تفسیر کی بنا پرنبوت کی سچائی کا ایک اورثبوت ملتا ہے۔باقی رہی یہ تفسیر کہ اللہ تعالیٰ نے جانتے ہوئے وحی کو اتارا ہے اصل واقعہ کے اعتبار سے درست ہے لیکن اس کودعوائے نبوت کے ثبوت میں نہیں پیش کیا جاسکتا،کیونکہ اللہ تعالیٰ حق وباطل دونوں جانتا ہے۔

﴿وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا﴾

(٧/ الاعراف:١٤٨)

"اورموسیٰ کی قوم نے ان کے بعد اپنے زیوروں کا ایک بچھڑا معبود ٹھہرا لیا۔"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جوہدایت نہیں کرسکتا بولنے کی طاقت نہیں رکھتا وہ الٰہ نہیں ہوسکتا۔

﴿ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۝ ﴾

(۲۰/ طٰہٰ: ۸۹)

''کیا یہ گمراہ لوگ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ وہ تو ان کی بات کا جواب نہیں دے سکتا اور نہ ان کے کسی برے بھلے کا اختیار رکھتا ہے۔''

اس آیت سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ جو ہستی جواب نہ دے سکے اور نفع ونقصان نہ پہنچا سکے وہ الٰہ نہیں ہے۔

﴿ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝ ﴾ (۹۰/ البلد: ۸)

''کیا ہم نے اس کے لیے دو آنکھیں نہیں بنائیں۔''

اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ جس خالق نے انسان کو آنکھوں، ہونٹوں اور زبان سے نوازا ہے وہ خود بدرجہ اولیٰ ان صفات سے موصوف ہوگا۔

﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۭ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۚ ﴾ (۱۷/ الاسراء: ۱۱۰)

''یعنی تم جس نام کے ساتھ بھی اس کو پکارو گے تم اسی ایک ذات ہی کو پکارو گے، اس نے اعلان کردیا ہے کہ وہ ایک الٰہ ہے۔ اگرچہ اس کے صفاتی نام بہت سے ہیں۔''

﴿ اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ۝ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ۝ ﴾ (۲۱/ الانبیاء: ۲۳)

''کیا انہوں نے ٹھہرائے ہیں الٰہ زمین سے کہ وہ زندہ کرتے ہیں۔ اگر آسمان وزمین میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ ہوتے تو دونوں کا نظام بگڑ جاتا، پس پاک ہے عرش کا رب اللہ ان باتوں سے جو وہ (مشرکین) بیان کرتے ہیں۔ نہیں پوچھا جائے گا ان کاموں کے بارے میں جو وہ کرتا ہے اور وہ (انسان) پوچھے جائیں گے۔''

اس آیت کے آخری فقرے کا یہ منشا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال حکمت ومصلحت سے خالی ہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ اس سے باز پرس اس بنا پر نہیں ہوسکتی کہ اس کے افعال کامل حکمت، مصلحت اوررحمت پر مبنی ہیں۔جوافعال واحکام حکمتوں اور مصلحتوں سے پر ہوں وہاں کسی معترض کے اعتراض کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اس سے باز پرس اس لیے نہیں ہوسکتی کہ وہ زبردست حکومت وغلبہ کامالک ہے۔اس صورت میں مدح کاپہلو کوئی نہ ہوگا بلکہ یہ تو مذمت ہوگی۔

﴿ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ﴾

(٦/ الانعام:٤٤)

”جب وہ (کافر)ان باتوں کوبھول گئے جن کے ساتھ وہ نصیحت کیے گئے تھے توہم نے ان پر ہرچیز کے دروازے کھول دیے۔“

اللہ تعالیٰ مجرم بندوں کودوقسم کی سزادیتا ہے:

① مجرم کوایسا گناہ کاشیدائی بنا دیتاہے کہ وہ اس کے نقصان اورتکلیف کا احساس بھی نہیں کرتا۔ کیونکہ گناہ اس کی خواہش اورارادہ کے بالکل موافق ہوتا ہے درحقیقت یہ سزاتمام سزاؤں سے بڑھ کرہے۔

② گناہوں کے ارتکاب کے بعد دردناک عذاب کادورشروع ہوتا ہے۔

یہ سزا دوسری قسم کی ہے۔

اس آیت کے نصف ابتدائی حصہ میں سزا کی قسم اول بیان ہے۔اس کے بعد دوسری قسم کو بیان کیاہے،فرمایا:

﴿ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُم بَغْتَةً ﴾ (٦/ الانعام:٤٤)

”یہاں تک کہ جب وہ اس پراترا گئے توہم نے ان کواچانک پکڑ لیا۔“

یہاں دونوں سزائیں اس طرح بیان ہوئی ہیں۔دوسری پہلی کولازم ہے

لیکن پہلی قسم ہوائے نفس اورلذت کے موافق ہے اوردوسری انسانی محبوبات ومرغوبات کے یکسر خلاف۔

﴿ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ (۱۱/ ھود:۷)

''اوروہ اللہ جس نے آسمان وزمین کو چھ دن میں بنایا حالانکہ اس کاعرش پانی پرتھا، تاکہ تمہیں آزمائے کہ کون تم میں سے عمل کے اعتبار سے اچھا ہے۔''

اس آیت نے واضح کردیا کہ اللہ تعالیٰ نے عالم سماوی اورارضی کواس لیے پیدا کیاہے، تاکہ فرمانبردار اورنافرمان کافرق ظاہر ہوجائے۔یہ امتحان اورآزمائش کچھ اسباب وذرائع چاہتے ہیں۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسباب بھی پیدا کردیے ہیں مثلاً شہوات اور زینت ولطف اندوز ہونے جیسی چیزیں امتحان وآزمائش کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔دوسری آیت میں ہے:

﴿ إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ﴾

(۱۸/ الکھف:۷)

''ہم نے زمین پرجوکچھ بنایاہے وہ اس کے لیے زینت ہے، تاکہ ہم ان کوآزمائیں کہ عمل میں کون اچھا ہے۔'' [1]

آیت حج کے اسرار وحکم

﴿ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ﴾

(۳/ آل عمران:۹۷)

''اور اللہ کے لیے لوگوں پربیت اللہ کاحج واجب ہے جوراستہ کی طاقت رکھتے ہیں۔''

یہاں ''حج البیت'' مبتدا اور''علی الناس'' خبر ہے۔

[1] یہ بحث مختصر الصواعق سے لی گئی ہے۔

یہاں لفظ اللہ کو مقدم کرنے میں حکمت یہ ہے کہ اللہ اس ہستی کا نام ہے جس نے حج کو واجب قرار دیا ہے، لہٰذا اس کی تقدیم ضروری تھی۔

یہ آیت تین امور کو شامل ہے جو کہ واقعہ کے لحاظ سے ترتیب وار مذکور ہیں:

① فریضہ حج کو واجب قرار دینے والی ہستی، آیت کو اسی کے نام کے ساتھ شروع کیا گیا ہے۔

② فرض کے ادا کرنے والے جن پر فریضہ حج لازم کیا گیا ہے یعنی "الناس" (لوگ)۔

③ جو فریضہ واجب قرار دیا گیا ہے یعنی حج۔

اللہ کا ذکر پہلے اس لیے لایا گیا ہے کہ یہ ذات باری کا نام ہے جس کو مقدم کرنے کا اہتمام ضروری تھا، تاکہ اس واجب کی عظمت واضح ہو جائے جس کو اس نے واجب کیا ہے اور اس کے ضائع کرنے اور اس کے چھوڑنے سے ڈرایا جائے۔ کیونکہ جو اللہ نے فرض کیا ہے اس کا وہ درجہ نہیں ہے جو انسانوں کے خودساختہ فرائض کا ہے۔

① "من استطاع اليه"، من یہاں پر بدل واقع ہے۔ "من" کو "حج" مصدر کا فاعل قرار دینا کئی وجوہ سے درست نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ بیت اللہ کا حج وہ کرے جو راہ کی طاقت رکھتا ہو۔ اس صورت میں حج فرض کفایہ بن کر رہ جائے گا۔ حالانکہ وہ فرض عین ہے، یعنی ہر مسلمان پر فرض ہے یہ اور بات ہے کہ عذر کی وجہ سے یہ فریضہ اُن سے ساقط ہو گیا ہے۔

یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر طاقت والے حج کر لیں تو غیر مستطیع افراد سے حج ساقط ہو جائے گا۔ اس مسئلہ کی وضاحت ذیل کی مثال سے سمجھیں:

مثلاً: یوں کہا جائے کہ اس شہر والوں پر فرض ہے کہ ان میں سے طاقت والا گروہ جہاد کرے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ طاقتور گروہ کے جہاد سے باقی افراد فرضیت سے بے تعلق ہو جائیں گے۔

لیکن اگر یوں کہا جائے کہ تمام لوگوں پر واجب ہے کہ ان میں سے طاقت والا جہاد کرے۔تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وجوب سب پر ثابت ہے،صرف اتنی بات ہے کہ طاقت نہ رکھنے والے اپنے عجز وضعف کی بنا پر معذور قرار دیئے گئے ہیں۔ یہی نکتہ ہے جس کی وجہ سے "للّٰہ علی الناس" کہا گیا ہے۔صرف "علی من استطاع" کہہ دینا کافی نہیں سمجھا گیا۔

② "من" "حج" کا فاعل اس لیے بھی نہیں ہوسکتا کہ فاعل کے ہوتے ہوئے مصدر کی اضافت مفعول کی طرف جائز نہیں بلکہ یوں ہونا چاہیے تھا،"حج من استطاع" باقی رہا مصدر اور اس کے مضاف الیہ فاعل کے درمیان مفعول کا فعل ماننا تو یہ مرجوع مسلک ہے۔("من" کا صلہ "منھم"کیوں حذف کیا گیا ہے اور "الیہ" کا تعلق کس سے ہے ان تفصیلات کو حذف کر دیا گیا ہے..... مترجم)

بعض کا خیال ہے کہ"الیہ ، سبیل"سے متعلق ہے اور "سبیل" بمعنی "الموصل الی البیت"ہے، گھر تک پہنچانے والا۔لیکن صحیح یہ ہے کہ "الیہ ، علی الناس"سے جو وجوب سمجھا جاتا ہے اس کے متعلق ہے۔یہ عام محاورہ ہے کہا کرتے ہیں:

"للّٰہ علیك الحج وللّٰہ علیك الزکوٰۃ والصلوٰۃ"

اس آیت میں چند اسرار و فوائد ہیں۔عام طور پر قرآن مجید میں کسی فعل کی فرضیت یا حرمت کو امر اور نہی کے صیغوں سے بیان کیا گیا ہے یا کتابت (لکھنا) اور تحریم جیسے الفاظ لائے گئے ہیں۔مثلاً فرمایا:

① ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۸۳)

② ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ﴾ (۵/ المائدۃ: ۳)

حج کے بیان میں یہ خاص انداز اس کی فرضیت کو چند وجوہ سے مستحکم ومضبوط کر رہا ہے:

① ذات باری کے نام اللہ کو مقدم کیا گیا۔

② لام استحقاق وخصوصیت اس پر بڑھایا گیا۔(تا کہ اس بات کو واضح کیا جائے کہ عبادت حج کا مستحق خاص طور پر اللہ تعالیٰ ہی ہے۔مترجم)

③ پھر جن پر حج فرض کیا گیا ہے ان کا ذکر عام لفظ "الناس" کے ساتھ کیا گیا اور ساتھ ہی "علی" بھی لایا گیا۔(جو کہ فرضیت کو بتلاتا ہے۔)

④ اہل استطاعت کو بدل کی صورت میں بیان کیا گیا۔

⑤ اور "سبیل" کو نکرہ عام لایا گیا، جس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ حج اس شخص پر فرض ہے جس کے لیے راستہ کی کسی قسم کی سہولت میسر آجائے۔خواہ غذا کی صورت ہو یا نقدی کی صورت میں۔یہاں وجوب کو اللہ تعالیٰ نے "سبیل" کے حصول پر موقوف رکھا ہے۔

⑥ پھر اللہ تعالیٰ نے کفر پر جو وعید اور دھمکی دی جاسکتی ہے اس کو بیان فرمایا ہے۔"ومن کفر" یعنی جس نے اس واجب کا انکار کردیا۔پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی شان بے نیازی کی خبر "ھو الغنی الحمید"(وہ بے پروا، لائق حمد ہے۔) کے ذریعہ دے کر وعید کو پر زور اور مؤثر بنادیا۔

⑦ کسی کے حج نہ کرنے سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا وہ تو بے پرواہ ہے۔اس کی یہ بے پرواہی اس کے غصہ اور ناراضگی کو صاف ظاہر کررہی ہے اور اس کی دھمکی کو سخت ترین صورت میں پیش کررہی ہے۔

⑧ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فان اللہ غنی عنہ"بے شک اللہ اس سے غنی ہے۔" کے بجائے یہ فرمایا:

﴿فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾

"بے شک اللہ تعالیٰ تمام جہانوں سے بے پرواہے۔"

جو ہستی تمام جہانوں سے بے نیاز ہو اس کی بے نیازی کس قدر کامل اور عام ہوگی وہ ہر ایک سے، ہر طور سے، ہر اعتبار سے بے نیاز ہے۔یہ اندازِ بیان تارک فرض پر خدائی غیظ وغضب کو نمایاں طور پر بتلا رہا ہے۔

⑨ پھر "انّ" لاکر اس معنی میں مزید تاکید پیدا کردی گئی۔

یہ چند وجوہ ہیں جن سے اس فرض عظیم کی مزید تاکید واہمیت معلوم ہوتی ہے۔یہاں بدل کاذکر ایک خاص حسن پیدا کررہا ہے۔اس کی وجہ سے اسناد (نسبت) دوبار ثابت ہوگئی۔ایک بار عموی طور پر"الناس" کی طرف اور پھر دوسری بار خصوصی طور پر"من استطاع" کی طرف، یہ بدل ہی کی خوبی ہے کہ تکرار اسناد سے معنی کو تقویت وتاکید ہوجاتی ہے۔گویا عامل (فعل) کو بار بار لایا گیا ہے۔پھر یہ بھی غور کریں کہ کس طرح ابہام واجمال کے بعد تفصیل ووضاحت کواختیار کیا گیا ہے۔گویا اس طرح کلام کو دوخوش نما لباسوں میں پیش کیا گیا ہے۔جس سے اصل مقصد کی عظمت وتاکید میں اضافہ ہوگیا۔

قرآنی اندازِ بیان کس قدر شاندار ہے کہ اس نے حج کی فرضیت کو بتلانے سے پہلے بیت اللہ کی شان اورخوبیاں اس طرح نمایاں کی ہیں کہ دلوں میں ازخود زیارتِ بیت اللہ کے لیے شوق، ولولہ اورتڑپ پیدا ہوجاتی ہے۔فرمایا:

﴿ إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ ﴿٩٦﴾ فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ ۖ وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا ۗ ﴾

(۳/ آل عمران:۹۶۔۹۷)

"بے شک پہلا گھر جولوگوں کے لیے تعمیر کیا گیا وہ ہے جومکہ میں ہے برکت والا ہے اورجہانوں کے لیے ہدایت۔اس میں کھلی نشانیاں ہیں مقام ابراہیم، جواس میں داخل ہوااس نے امن پایا۔"

یہاں بیت اللہ کی پانچ صفات بیان ہوئی ہیں:

① یہ گھر قدیم ترین عمارت ہے جوزمین پر بنائی گئی۔

② وہ برکت والا ہے۔دائمی برکت، کثرتِ خیر اورنفع رسانی کے لحاظ سے دنیا کا کوئی گھر بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

③ ہدایت ہے، یہاں صفت مصدر کی صورت میں ذکرہوئی ہے۔گویا یہ گھر

سرتاپا مجسمہ ہدایت ہے۔

④ کھلی ہوئی واضح روشن نشانیوں سے بھر پور ہے جن کی تعداد چالیس سے کم نہیں۔

⑤ امن وراحت کا گہوارہ ہے جو اس میں داخل ہوگیا وہ امن وعافیت کی دولت سے مالا مال ہوگیا۔

ابتداءً حج کی فرضیت بیان کرنے کے بجائے بیت اللہ کی اُن صفات کو ذکر کیا گیا ہے جو دلوں کو زیارت کے لیے اُبھارتی ہیں۔شوق کی آگ اس طرح بھڑکاتی ہیں کہ وطن کی دُوری اور مسافت کی لمبائی کا احساس تک بھی نہیں ہوتا۔ان صفات کے بعد حج کی فرضیت کا حکم مذکورہ بالا تاکیدات کے ساتھ سنایا گیا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رب العالمین کے نزدیک اس کا کتنا مرتبہ اور شان ہے۔یہی شرف کیا کچھ کم ہے کہ اس گھر کو خاص اپنی طرف منسوب کیا۔فرمایا:

﴿طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِينَ﴾ (۲/ البقرة: ۱۲۵)

''میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لیے پاک کردو۔''

یہی وہ شرف وفضل ہے جس نے دنیا کے ہر گوشے سے اسلام کے پروانوں کو اس کے گرد جمع کردیا ہے۔اس کے دیدار کے بغیر قرار نہیں، جس قدر دیکھا جاتا ہے اس قدر محبت وشوق کی چنگاریاں بھڑکتی جاتی ہیں، نہ وصال سے شفا ہے اور نہ فراق سے آرام۔[1]

اسرار آیت قتال

﴿يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ۖ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ ۖ﴾

(۲/ البقرة:۲۱۷)

''اورآپ سے حرمت والے مہینے کے بارے میں دریافت کرتے

[1] بدائع:۲/ ۴۲-۴۶۔

ہیں، اس میں لڑائی کیسی ہے؟ کہہ دیجئے اس میں لڑائی بڑا گناہ ہے۔"

اس آیت میں "قتال فیہ" بدل الاشتمال ہے۔

ایک شبہ

سوال تو یہاں کہا جارہا ہے "قتال" کے بارے میں پھر "الشھر" کومقدم کیوں کیا گیا ہے۔قاعدہ تو یہ ہے کہ جس کا بیان زیادہ اہم ہوتا ہے اسی کو پہلے لایا جاتا ہے؟

جواب کافروں کی طرف سے یہ سوال ہی اس وقت ہوا ہے جب کہ حرمت والے مہینے میں لڑائی ہوچکی تھی اور وہ مسلمانوں کواس ماہ کی حرمت کے برباد کرنے کا طعنہ دے چکے تھے۔ان کے نزدیک خود الشھر (مہینہ) ہی نہایت عظمت واہمیت رکھتا تھا، خواہ اس میں لڑائی ہو یا نہ ہو،اوراس سوال کی بنیاد یہی ہے کہ وہ اس ماہ کی حرمت وعزت کے قائل تھے۔لہٰذا "الشھر" کامقدم کرنا قاعدہ کے مطابق ہی ہوا۔

سوال پھر "قتال" کو دوبارہ لانے میں کیا حکمت ہے؟ کیا ضمیر کا لے آنا کافی نہ تھا؟

جواب ضمیر لانے میں یہ خیال پیدا ہوسکتا تھا کہ یہ حکم اسی خاص "قتال" کے لیے ہے جس کے بارے میں سوال کیا گیا ہے۔اب "قتال" کے ذکر سے حکم کا عموم ثابت ہوگیا، یعنی حرمت والے ماہ میں لڑنا خواہ کسی سال میں ہوکبیرہ گناہ ہے اس اندازِ بیان کی نظیر یہ حدیث ہے۔رسول اللہ ﷺ سے سمندر کے پانی کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ آیا وہ پاک ہے یا ناپاک۔آپ نے جواب دیا:

((ھو الطھور ماؤہ والحل میتتہ)) [1]

"اس کا پانی پاک ہے اوراس کا مردہ حلال ہے۔"

---

[1] سنن ابوداود ١/ ٦٤ (٨٣) الطھارۃ: باب الوضوء بماء البحر۔

لفظ "ماء" کو صراحتًا بجائے ضمیر کے لیے لایا گیا ہے تا کہ حکم عام دائمی اور پانی کے ہر فرد کو شامل ہو جائے اور خصوصیت کا کوئی شائبہ باقی نہ رہے اور اس کی مثال یہ آیت ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ﴾ (۷/ الاعراف:۱۶۹)

"اور جو لوگ کتاب کو مضبوطی سے تھام لیتے ہیں اور انہوں نے نماز کو قائم کیا تو ہم مصلحین (نیکی وصلاحیت والوں) کا اجر ضائع نہیں کرتے۔"

یہاں "اجرھم" (ان کا اجر) کہہ دینا کافی تھا۔لیکن اصل مقصود یہ ہے کہ ان کے ثواب کا ضائع نہ ہونا محض اس بنا پر ہے کہ وہ مصلحین ہیں۔ظاہر بات ہے کہ یہ بات ضمیر سے حاصل نہ ہوسکتی اور اسی کی نظیر یہ آیت ہے جو کہ معنوی لطافت سے پر ہے:

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۲۲)

"لوگ آپ سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہہ دیجیے وہ گندگی ہے۔اس لیے تم حیض کی حالت میں ان سے الگ رہو۔"

یہاں "فی المحیض" کے بجائے "فیه" نہیں کہا گیا ہے،تا کہ معلوم ہو جائے کہ علیحدگی کا سبب حیض ہے۔"قل ھو اذی" یہاں "ھو" ضمیر لائی گئی ہے ورنہ اگر "محیض" ہی لایا جاتا تو ایک ہی لفظ تین بار آنے سے کلام میں ثقل (بوجھ) پیدا ہو جاتا اور یہ بات بھی ہے کہ حیض کی گندگی سے تو کسی کو انکار ہی نہ تھا یہ تو طبعًا سب کو مسلم تھی۔باقی رہا حیض کی حالت میں اعتزال (علیحدگی) تو یہ ایک شرعی حکم ہے۔اس کا سبب بتلانے کے لیے اسم ظاہر لانا زیادہ موزوں تھا۔[1]

[1] بدائع: ۲/ ۴۷، ۴۸۔

قرآنی معارف وحقائق

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں چند امور کے ساتھ مختلف چیزوں پر قسم کھاتا ہے۔ کبھی اللہ تعالیٰ اپنی ذات صفات یاان نشانیوں کی قسم کھاتا ہے۔جو اس کی ذات وصفات کو بتلاتی ہیں۔کبھی کسی مخلوق کی قسم کھاتا ہے جس سے اشارہ ہوتا ہے کہ یہ مخلوق اللہ کی بڑی نشانیوں میں سے ہے۔قسم کبھی جملہ خبریہ کی صورت میں ہوتی ہے(اکثر ایسا ہی ہے)جیسے فرمایا:

﴿ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ ﴾

(۵۱/ الذاریات:۲۳)

''آسمان کے رب کی قسم!بیشک وہ حق ہے جس طرح کہ تم بولتے ہو۔''

اورکبھی جملہ طلبیہ کی صورت میں ہوتی ہے۔فرمایا:

﴿ فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴾ (۱۵/ الحجر:۹۲)

''تیرے رب کی قسم!ہم ان سے ضرور ہی سوال کریں گے۔''

اس قسم کے ذریعہ سے کبھی مقسم علیہ(جس پرقسم کھائی جائے)کو ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے اورکبھی قسم یا مقسم علیہ دونوں کااثبات اورتاکید مطلوب ہوتی ہے۔اس غرض کے لیے انہی چیزوں کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔جو کہ نظروں سے اوجھل اور پوشیدہ ہوں ورنہ ظاہری مخلوقات سورج،چاند،آسمان جیسی چیزوں کو ثابت کرنے کے لیےقسم کھانا بے معنی سی بات ہے۔ہاں ان اشیاء کے ساتھ قسم کھائی جاسکتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں پرقسم کھائی ہے وہ اس کی آیات (نشانیوں) میں شمار ہوں گی۔ان کو مقسم بہ(جن کے ساتھ قسم کھائی جائے۔)بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔لیکن ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہروہ شے جومقسم بہ ہے اس کو مقسم علیہ بھی قرار دیا جاسکے(مثلاً سورج،چاند مقسم بہ تو ہیں، مقسم علیہ نہیں اورقرآن مجید مقسم علیہ بھی ہے اورمقسم بہ بھی)قرآن میں قسم کا جواب کبھی مذکور ہوتا ہے اورکبھی

محذوف، جیسا کہ ''لو'' کا جواب کبھی مذکور ہوتا ہے اور کبھی محذوف۔

﴿كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ﴾ (۱۰۲/ التکاثر:۵)

''سنو! اگر تم جان لو یقینی علم۔''

﴿وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ﴾

(۱۳/ الرعد:۳۱)

''اور اگر قرآن اس کے ذریعے پہاڑ چلائے جاتے یا زمین طے کی جاتی۔''

﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا ۙ الْمَلَائِكَةُ﴾ (۸/ الانفال:۵۰)

''اور اگر تو دیکھے جبکہ فرشتے کافروں کی روحیں قبض کریں گے۔''

اس قسم کے مقامات پر لرأیت ھولاً عظیما'' تو تو بڑا ہولناک منظر دیکھے گا'' محذوف ہے۔ یہ انداز بیان لوگوں کی عام عادت کے مطابق ہے۔ جب وہ قسم قسم کی عجیب چیزیں دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں اگر تم فلاں وقت فلاں جگہ جو کچھ ہوا دیکھتے (اس موقع پر بھی (اگر) کا جواب حذف کر دیا جاتا ہے۔) اسی انداز پر یہ آیت ہے:

﴿وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۙ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۶۵)

''اور اگر دیکھیں وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا ہے جبکہ دیکھیں گے عذاب کو کہ بیشک قوت ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے۔''

اس آیت کے ظاہری معنی یہ ہیں: ''اگر تو دیکھے ان لوگوں کو جنہوں نے دنیا میں ظلم کیا ہے جبکہ وہ آخرت میں عذاب کو دیکھیں گے۔'' یہاں جواب '' لو'' محذوف ہے۔ اس کے بعد فرمایا:

﴿أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۙ﴾

قسم کے موقع پر حالف (قسم کھانے والا) کسی شے پر قسم کھاتا ہے اور پھر جب دوبارہ اس قسم کو دہراتا ہے تو مقسم علیہ کو دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں

ہوتی۔کلام عرب میں قسم کا استعمال زیادہ ہوا کرتا تھا اس لیے اختصار کی غرض سے فعل قسم کی بجائے باء یا اس کے بدلہ واؤ ظاہری اسماء کے ساتھ مستعمل ہوتی ہے اور تاء صرف اللہ کے نام کے ساتھ بولی جاتی ہے۔فرمایا:

﴿ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ ﴾ (۲۱/ الانبیاء:۵۷)

''اللہ کی قسم میں تمہارے بتوں سے چال چلوں گا۔''

اہل عرب سے ''فرب الکعبة'' بھی منقول ہے لیکن واؤ کا استعمال زیادہ ہے۔

قرآن میں مقسم علیہ کون سی اشیاء ہیں؟

ایمان کی وہ بنیادی باتیں جن کا پہچاننا ضروری ہے انہی کو مقسم علیہ قرار دیا گیا ہے۔مثلاً:

① توحید ② حقانیت قرآن

③ صداقت رسول ﷺ ④ قیامت

⑤ انسانی حالت

نمبر۱ کی مثال:

﴿ وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۙ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۙ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۭ ﴾ (۳۷/ الصافات:۱۔٤)

''صف بستہ فرشتوں کی قسم!...... بیشک تمہارا الٰہ (معبود) ایک ہے۔''

نمبر۲ کی مثال:

﴿ فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۙ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۙ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۙ ﴾ (٥٦/ الواقعة:۷۵۔۷۷)

﴿ حٰمٓ ۚ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۙ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ﴾

(٤٤/ الدخان:۱۔۳)

اور ﴿ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا ﴾ (٤٣/ الزخرف:۳)

خواہ ''انا انزلنا'' کو جواب قسم مان لیا جائے یا جواب محذوف سمجھا جائے جیسا

کہ ﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ﴾(۳۸/ صٓ:۱) میں محذوف قرار دیا جاتا ہے۔

نمبر۳ کی مثال:

﴿یٰسٓ وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ﴾ (۳۶/ یٰسین:۱۔۳)

یہاں جواب محذوف بھی مانا جاسکتا ہے۔

﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّکَ بِمَجْنُوْنٍ﴾

(۶۸/ القلم:۱۔۲)

﴿وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی﴾

(۵۳/ النجم:۱۔۲)

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ﴾

(۶۹/ الحاقۃ:۳۸۔۴۰)

نمبر۴ کی مثال:

﴿وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا فَالْجٰرِیٰتِ یُسْرًا فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ﴾ (۵۱/ الذاریات:۱۔۵)

﴿وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا فَالْمُلْقِیٰتِ ذِکْرًا عُذْرًا اَوْ نُذْرًا اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ﴾

(۷۷/ المرسلات:۱۔۷)

﴿وَالطُّوْرِ وَکِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ وَّالْبَیْتِ الْمَعْمُوْرِ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ لَوَاقِعٌ﴾

(۵۲/ الطور:۱۔۷)

ذیل کی تین آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو قیامت پر قسم کھانے کا حکم دیا ہے، فرمایا:

﴿قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ﴾ (۶۴/ التغابن:۷)

﴿وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَا تَاْتِیْنَا السَّاعَةُ قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتَاْتِیَنَّکُمْ﴾

(۳۴/ سبا:۳)

﴿وَیَسْتَنْۢبِـُٔوْنَکَ اَحَقٌّ هُوَ قُلْ اِیْ وَرَبِّیْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ﴾ (۱۰/ یونس:۵۳)

معاد (قیامت) پر بار بار قسم اس لیے کھائی گئی ہے کہ اس کا علم انبیائے کرام کی تبلیغ کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا،عوام کا یہی حال ہے۔کچھ ہی لوگ ایسے ہوں گے جو نظر واستدلال سے قیامت کا یقین حاصل کرسکیں۔(اس جگہ کلامی مبحث کی چند سطریں حذف کردی گئی ہیں۔مترجم)

نمبر۵ کی مثال:

﴿ وَالَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ ۝ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ ۝ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ۝ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ۝ ﴾ (۹۲/ اللیل:۱۔۴) ہے۔

انسان کی صفت پر سورۃ العادیات میں قسم کھائی ہے فرمایا:

﴿ وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا ۝ فَالْمُورِيَاتِ قَدْحًا ۝ فَالْمُغِيرَاتِ صُبْحًا ۝ فَأَثَرْنَ بِهِ نَقْعًا ۝ فَوَسَطْنَ بِهِ جَمْعًا ۝ إِنَّ الْإِنسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ ۝ ﴾

(۱۰۰/ العادیات:۱۔۶)

انسانی اعمال کے انجام وجزا کو سورۃ التین اور سورۃ العصر میں بیان کیا گیاہے۔کبھی جواب قسم مذکور نہیں ہوتا، بلکہ قرآن کے عام انداز بیان سے سمجھ لیا جاتا ہے۔قرآن میں جن امور کی قسم کھائی گئی ہے وہ سب ایک دوسرے کو لازم ہیں۔جب یہ ثابت ہوجائے کہ رسول اللہ ﷺ حق ہیں تو پھر قرآن اور قیامت کی صداقت میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔اسی طرح قرآن کی حقانیت سے رسالت نبوی کا ثبوت یقینی ہے۔اسی انداز پر قیامت کا معاملہ ہے۔جب وعدے ووعید ثابت ہوگئے تو قرآن اور رسالت کا ثابت ہوجانا پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔

کبھی جواب قسم اس طرح حذف کیا جاتا ہے کہ نیت میں بھی مراد نہیں ہوتا بلکہ مقسم بہ کی تعظیم مقصود ہوتی ہے اور یہ کہ مقسم بہ اُن چیزوں میں ہے جن کے ساتھ قسم کھائی جاسکتی ہے اور کبھی جواب قسم باوجود محذوف ہونے کے مراد ہوتا ہے۔اس کی چند صورتیں ہیں:

① جواب قسم اس قدر مشہور ومعروف ہے کہ اس کے بیان کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔

② گفتگو اور جواب وسوال کی حالت ہی ایسی ہوتی ہے کہ جواب قسم خود بخود

سمجھ میں آجاتا ہے۔جیسے کسی سے کہا جائے کُلْ (کھانا کھالے)وہ جواب دے لا واللہ (نہیں اللہ کی قسم!) یہاں "نہیں کھاؤں گا۔" جواب قسم ہے جو بغیر ذکر کیے سمجھ میں آرہا ہے۔

③ سیاق وسباق (پہلے اور پیچھے کی عبارت) کا قرینہ جواب قسم کے ذکر سے بے نیاز کر دیتا ہے۔قرآن میں زیادہ تر وہاں جواب قسم نہیں لایا جاتا، جہاں کہ خود مقسم بہ (جس کے ساتھ قسم کھائی جائے۔) مقسم علیہ (جس پر قسم کھائی جائے، یعنی جواب قسم) مفہوم ومعنی کو بتلا رہا ہو۔حقیقت بھی یہی ہے کہ ایسے موقع پر مقسم علیہ کا حذف کرنا ہی فصاحت وبلاغت کے زیادہ مناسب ہے۔ مثلاً کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کی صداقت پر قسم کھانا چاہتا ہے:

والذی ارسل محمدا بالھدیٰ ودین الحق وایدہ بالآیات والبینٰت۔

"قسم ہے اس ذات کی جس نے محمد ﷺ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا اور کھلی ہوئی نشانیوں کے ساتھ اس کی تائید ومدد کی۔"

ایسے موقع پر مقسم علیہ کے ذکر کی ضرورت نہیں،قسم کے الفاظ خود اس ضرورت کو پورا کر رہے ہیں۔اسی طرح توحید اور صفات الٰہیہ پر قسم کھانے والا اگر یوں کہے:

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾ (۵۹/ الحشر:۲۲)

تو جواب قسم کے بیان کرنے کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔سورۂ ص میں یہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔فرمایا:

﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ﴾ (۳۸/ ص:۱)

"قسم ہے ذکر والے قرآن کی۔"

یہاں مقسم بہ میں قرآن کی عظمت،شرف اور مرتبہ کو ظاہر کرتے ہوئے بتلایا گیا ہے کہ یہ قرآن نصیحت اور ذکر سے پر ہے۔یہ بندوں کو ان کی ضرورتوں کے

متعلق راہنمائی اور نصیحت کرتا ہے۔قرآن کی صفت ”ذی الذکر“ کے بیان سے جواب قسم سے بے نیازی حاصل ہوگئی۔ [1]

تفسیر سُوْرَةُ الْقِيَامَةِ

ان قرآنی آیات میں سے جہاں جواب قسم مذکور نہیں ہے، سورۃ القیامہ بھی ہے۔ فرمایا:

﴿لَآ أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝ وَلَآ أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝﴾

(۷۵/ القیامۃ:۱۔۲)

”قیامت کی قسم ہے اور ملامت کرنے والے نفس کی قسم ہے۔“

قسم کے الفاظ جزا (بدلہ) اور مستحق جزا دونوں کے ذکر کو شامل ہیں۔غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندازِ بیان معاد (آخرت) کے ساتھ توحید اور رسالت کو بھی ثابت کررہا ہے۔قرآن میں بہت سے مقامات میں ان تینوں مضامین کو مقسم علیہ قرار دے کر تاکیدی اور زوردار الفاظ میں ان کو ذہن نشین کیا گیا ہے۔ان پر ایمان لائے بغیر نجات کی کوئی صورت نہیں ہے۔یہ دین کے بنیادی امور ہیں۔ان کی معرفت ہرطالب حق کے لیے ضروری ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پاک ﷺ کو بھی ان تینوں امور پر قسم کھانے کا حکم دیا ہے۔فرمایا ہے:

﴿وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؕ﴾ (۱۰/ یونس:۵۳)

”کافر آپ سے دریافت کرتے ہیں کیا وہ حق ہے؟ (یعنی قیامت) آپ کہہ دیجیے! ہاں قسم ہے میرے رب کی وہ حق ہے۔“

سورۂ تغابن میں ہے:

﴿زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ؕ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝﴾ (٦٤/ تغابن:۷)

[1] التبیان فی اقسام القرآن ص ۳-۸۔

”کافروں نے خیال کیا کہ وہ اٹھائے نہیں جائیں گے۔ کہہ دیجیے کیوں نہیں! قسم ہے میرے رب کی تم ضرور اٹھائے جاؤ گے، اور تمہارے اعمال تمہیں بتائے جائیں گے،اور یہ اللہ پر نہایت آسان ہے۔“

سورۂ سبا میں ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ ۖ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ﴾

(۳٤/ سباء:۳)

”کافروں نے کہا قیامت نہیں آئے گی۔ کہہ دیجیے کیوں نہیں! میرے رب کی قسم! قیامت تم پر ضرور ہی آئے گی۔“

یہ تین آیات ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کو قیامت پر قسم کھانے کی تاکید کی گئی ہے۔ توحید، رسالت اور قیامت ان تینوں امور کی اللہ کے ہاں اتنی اہمیت ہے کہ بندوں کو ان کی طرف متوجہ کرنے کے لیے خود ان کی قسم کھائی اور مخلوق میں سب سے سچے انسان حضرت محمد ﷺ کو اس کا حکم دیا اور روشن دلائل سے ان کو ثابت کر دکھایا۔ لیکن پھر بھی دشمنوں نے انکار وتکذیب (جھٹلانے) کی راہ اختیار کی۔

نفس لوّامہ کی تشریح

مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ یہاں نفس لوّامہ سے کوئی خاص نفس مراد ہے یا عام۔ اس اختلاف کی بنیاد لوّامہ کی تین تشریحات پر ہے:

① حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ قیامت کے دن ہر نفس اپنے آپ کو ملامت کرے گا۔ نیک انسان کے دل میں یہ تمنا ہوگی کہ کاش اس کی اطاعت کی رفتار دنیا میں اور تیز ہوتی۔ بدکار شخص پچھتائے گا اور حسرت کرے گا کہ ہائے افسوس! میں کیوں نہ بدکاری سے باز آ گیا۔

② حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ یہاں خاص مومن نفس مراد ہے۔ ایمان دار ہر وقت اپنے نفس کو ملامت کرتا رہتا ہے اور ہر معاملہ میں اپنی کوتاہی کا اقرار کرتا ہے۔ ندامت وپشیمانی سے اس کا کوئی وقت بھی خالی نہیں جاتا۔ لیکن فاجر بدکار کی

حالت اس کے برعکس ہوتی ہیں۔

③ لوامہ سے مراد نفس کافرہ ہے جو اپنی کوتاہیوں اور نافرمانیوں کی وجہ سے (قیامت کے روز) اپنے آپ کو ملامت کرے گا۔امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عام نفس انسانی مراد ہے۔اس لیے کہ ہر نفس ملامت کنندہ ہے۔یہاں عام نفس انسانی اسی طرح مراد ہے جس طرح "ونفس وماسوّاھا" میں بلاتخصیص سمجھا جاتا ہے۔ ہر انسان دو حال سے خالی نہیں یا تو اپنے آپ کو ملامت کرے گا یا کسی غیر کو۔پھر ملامت کی بھی دو صورتیں ہیں۔محمود (لائق تعریف) مذموم (قابل مذمت) ذیل کی آیات میں غیر محمود ملامت مراد ہے۔

﴿ فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَلَاوَمُونَ ﴾ (٦٨/ ن: ٣٠)

"پھر وہ ایک دوسرے پر ملامت کرتے ہوئے متوجہ ہوئے۔"

﴿ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ﴾

(٥/ المائدۃ:٥٧)

"اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔اور ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔"

نفس لوّامہ، جزا اور اعمال

نفس لوّامہ کی صفت پر اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے، فرمایا:

﴿ إِنَّ الْإِنسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ ﴾ (١٠٠/ العادیات: ٦)

"بے شک انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔"

اور کبھی اس کی جزا کو مقسم علیہ بنایا ہے:

﴿ فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴾ (١٥/ الحجر: ٩٢)

"قسم ہے تیرے رب کی! ہم ان سے ضرور ہی سوال کریں گے۔"

کبھی اعمال کے اختلاف پر قسم بیان کی گئی ہے، فرمایا:

﴿ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ﴾ (٩٢/ اللیل: ٤)

”بے شک تمہاری کوششیں الگ الگ ہیں۔“

الحاصل ہر نفس ملامت کرنے والا ہے۔نیک نفس گناہ کے ارتکاب اور عمل صالح کے چھوڑنے پر ملامت کرتا ہے اور بد نفس کی حالت اس کے بالکل الٹ ہوتی ہے۔ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے بدلہ کی جگہ(قیامت)اور عمل وکسب کے مرکز(نفس)کو یکجا بیان کردیا ہے۔نفس کی صفت لوّامہ نے اس بات کی طرف اشارہ کردیا ہے کہ انسان ایسی ہستی کا شدت کے ساتھ محتاج ہے۔جو خیر وشر کی راہ بتلائے اور خیر کا ارادہ اور شر سے نفرت دل میں پیدا کردے،تاکہ اس طرح ملامت اور اس کے اسباب سے محفوظ رہ سکے۔صفت لوّامہ کے لانے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ انسانی نفس متلوم ومتردد رہتا ہے۔یعنی اس کو ایک حالت پر قرار نہیں ہے۔اس کے لیے اس ذات کے بغیر چارہ نہیں جو اسے نفع ونقصان بتائے اور وہ غفلت کی صورت میں اس کی طرف رجوع کرے۔ایک نیک بخت سعید انسان یہی کرتا ہے،اور جو بدکردار انسان ہے اس پر اس طرح انصاف کے ساتھ حجت قائم ہوجاتی ہے۔اب وہ قیامت کے روز اپنے نفس ہی کو ملامت کرسکے گا،اللہ پر کوئی الزام نہ آئے گا۔نفس کے ساتھ ملامت کی صفت لاکر یہ واضح کردیا کہ قرآن اور رسالت پر ایمان لائے بغیر کامیابی اور صلاحیت کی کوئی صورت ہو ہی نہیں سکتی۔ملامت کا زیادہ تر اثر قیامت کے روز ہی ظاہر ہوگا۔اس لیے ملامتِ نفس اور قیامت دونوں کو ایک ساتھ بیان فرمایا ہے۔[1]

جواب قسم کیا ہے؟

یہاں جوابِ قسم کے بارے میں چند توجیہات ہوسکتی ہے:

① جواب قسم مذکور نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاق وسباق سے اس کا پتہ چل جاتا ہے۔

② یہاں قسم کے بیان سے مقصود یہ ہے کہ مقسم بہ(جس کے ساتھ قسم کھائی

[1] التبیان:صفحہ ۱۰-۱۳۔

جائے) کے متعلق تنبیہ کردی جائے کہ یہ خود ایک بڑی نشانی اور قابل عبرت چیز ہے۔

انسانی گمان کی تردید

﴿ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝ ﴾ (۷۵/ القیامۃ:۳)

''کیا انسان گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں نہ جمع کریں گے۔''

بوسیدہ اور گل سڑ جانے کے بعد انسانی بدن کی دوبارہ پیدائش کو کافر ناممکن سمجھتے ہیں۔اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کو پیش کیا ہے۔اس کی قدرت سے بعید نہیں کہ وہ انسانوں کو دوبارہ پیدا کردے۔لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اللہ جس چیز پر قادر ہے وہ فوراً واقع بھی ہوجائے۔

﴿ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۝ ﴾ (۷۵/ القیامۃ:٤)

''کیوں نہیں! ہم قادر ہیں اس کے پوروں کو ہموار کرنے پر۔''

یعنی ہم ہڈیوں کے جمع کرنے پر اس طرح قادر ہیں کہ پورے بھی اپنی اصلی حالت پر بحال ہوجائیں گے۔یہ پورا مفہوم لفظ ''بلیٰ'' نے ادا کردیا ہے۔یہ سابق نفی کے ثابت کرنے کے لیے آتا ہے۔اس آیت نے فعل الٰہی کو ظاہر کردیا ہے اور قدرت کے ذکر سے جھٹلانے والوں کی تردید ہوگئی۔

نکتہ اوّل

بنان (پورے) کے ذکر میں ایک عجیب نکتہ ہے۔ جو اللہ پوروں جیسے پتلے باریک اعضا کو پیدا کرسکتا ہے، جوکہ سلسلہ پیدائش کی آخری کڑی ہیں تو کیا وہ پورے انسان کے پیدا کرنے سے عاجز رہ سکتا ہے۔جب اللہ تعالیٰ انگلیوں کے ان جوڑوں اور ہڈیوں کو گل سڑ جانے کے بعد ٹھیک کردے گا۔جوکہ منتشر ہونے اور بکھرنے میں بدن کے باقی اعضا سے کہیں زیادہ امکان رکھتے ہیں۔تو پھر پورے بدن کے حشر کو کیسے محال کہا جاسکتا ہے۔

تسویہ بنان کے ایک اور معنی

بعض علما نے اس آیت کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ ہم ان کے ہاتھ پیر کی انگلیوں کو اونٹ کے قدم اور گدھے کے سُم کی طرح برابر، ہموار کر دینے پر قادر ہیں۔ ایسی صورت میں انسان ہر قسم کے کام کھولنا، بند کرنا، موڑنا اور ان سب فوائد و منافع سے محروم رہ جائے گا جو اسے موجودہ حالت میں حاصل ہیں۔ بہت سے مفسرین اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی قول ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ دنیا میں الگ الگ انگلیوں اور پوروں کو جمع و ہموار کر سکتا ہے۔ تو آخرت میں بکھرے ہوئے اجزاء و اعضا کو جمع کرنا اور سمیٹنا اُسے کیا مشکل ہے۔

یہ طریق استدلال پہلے طرز استدلال سے مختلف ہے۔ اس میں موجودہ انگلیوں کی حالت کو ہموار و برابر کرنے پر اللہ کو جو قدرت حاصل ہے اس کو بطور دلیل کے پیش کیا گیا ہے۔ پہلے قول کا منشا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں منتشر جسم کے ذرات جمع کرنے پر قادر ہے۔ دونوں قول کچھ نہ کچھ ترجیحی پہلو رکھتے ہیں۔ پہلا قول تو اس بنا پر کہ یہی اصل مقصود ہے، کفار اسی کے منکر تھے۔ کلام کی ترتیب بھی اس کو چاہتی ہے۔ یہاں اس کلام کے لانے کا یہ مقصد نہیں کہ دنیا میں ہڈیوں اور انگلیوں کے جمع کرنے اور پھیلنے کو بیان کیا جائے۔ بلکہ آخرت میں بکھری ہوئی ہڈیوں کو جمع کرنے کے متعلق خبر دینا مقصود ہے۔ دوسرا قول اس وجہ سے راجح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہتھیلی میں مناسب ترتیب کے ساتھ الگ الگ انگلیوں کو جوڑ دیا ہے۔ جو آپس میں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ جب چاہو کھولو اور بند کر لو، ایک کو حرکت دو اور دوسری کو ٹھہرا دو، ایک سے کام لو اور دوسری کو بے کار رکھو۔ یہ سب کارخانہ ایک ہتھیلی اور پہونچے میں نہایت خوبی کے ساتھ سمو دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو ہتھیلی کی طرح ان کو برابر کر سکتا ہے اور پھر انسان ان تمام فائدوں سے محروم ہو سکتا ہے جو اسے اب حاصل ہو رہے ہیں۔ یہ کلام اس بات پر بڑی دلیل ہے کہ اللہ موت کے بعد بکھرے ہوئے ذرات کو دوبارہ جمع کر سکتا ہے۔

﴿ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ﴾ (۷۵/ القیامۃ:۵)

''بلکہ انسان چاہتا ہے کہ آیندہ بدکاری کرے۔''

اس آیت میں انسان کی بدحالی اور گناہ پراصرار (ضد) کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنی نافرمانی سے باز نہیں آتا اور ایسے دن سے نہیں ڈرتا جبکہ اللہ کے حضور مرنے کے بعد پیشی ہوگی۔نہ تو گزشتہ گناہوں پر شرمندہ ہوتا ہے اور نہ آیندہ نافرمانی کے چھوڑنے پر آمادہ ہوتا ہے بلکہ معصیت پر اڑ جاتا ہے۔

﴿ يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ﴾ (۷۵/ القیامۃ:٦)

''پوچھتا ہے قیامت کب ہوگی؟''

اس سوال کے یہ معنی نہیں کہ کافر قیامت کے وقوع کو تو مانتا ہے۔صرف اس کے زمانہ وقوع کو دور سمجھتا ہے بلکہ دراصل وہ قیامت کے واقع ہونے سے ہی انکاری ہے اور اس کو ناممکن خیال کرتا ہے۔جیسا کہ قرآن نے دوسری جگہ اس کا قول نقل کیا ہے:

﴿ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ﴾ (۵۰/ ق:۳)

''یعنی دوبارہ زندگی حاصل ہونا محالات میں سے ہے۔''

زمانہ کی دوری مراد نہیں ہے۔ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے اصحاب کا یہی قول ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ﴾ کی تفسیر میں بھی لکھا ہے کہ کافر گناہ کو مقدم کرتا ہے اور توبہ کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔قتادہ اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ معصیت میں رفتہ رفتہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔بدکاری سے باز رہنے کی کوشش نہیں کرتا۔ابن زید اور ابن قتیبہ کے نزدیک اس آیت کے معنی ہیں:

"بل یرید الانسان لیکذب بما امامہ من البعث"

''بلکہ انسان چاہتا ہے کہ اس کے آگے قیامت اور حشر ونشر کا جو معاملہ پیش آنے والا ہے اس کو جھٹلائے۔''

آیت ﴿ يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ﴾ (۷۵/ القیامۃ:٦) سے بھی اس کی تائید

ہوتی ہے اور لفظ "بل" بھی اسی تفسیر کو تقویت دیتا ہے یعنی انسان اس حجت کے باوجود قیامت پر ایمان نہیں لایا بلکہ اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہے۔کلام کی ترتیب وسیاق بھی ظاہر کررہاہے کہ یہاں فاجرو نافرمان کی مذمت کی بجائے مکذب (جھٹلانے والے) کی مذمت مقصود ہے۔اس آیت سے پہلے اور بعد کی آیات بھی اسی معنی کو بتلاتی ہیں۔

﴿ أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَلَّن نَّجْمَعَ عِظَامَهُ ﴾ (۷۵/ القیامۃ:۳)اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کافروں کے غلط گمان کی تردید کی ہے اورکمالِ قدرت کو ثابت کیا ہے۔اس کے بعدتکذیبِ قیامت کی مذمت وتردید فرمائی ہے۔پہلے کافر کے اس گمان پرانکار ہے کہ موت کے بعدزندگی حاصل نہ ہوگی اوربعدمیں اس کی تکذیبِ قیامت پرانکار ہے۔یعنی وہ ایسی بات کاانکار کررہاہے جس کی دلیل پوری روشنی کے ساتھ ظاہر ہوچکی ہے۔ ﴿ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ ﴾ میں تکذیب کاارادہ بتلایا گیا ہے اور ﴿ يَسْأَلُ أَيَّانَ يَوْمُ ﴾ میں کافر کی نطق بالتکذیب (زبان سے قیامت کے جھٹلانے) کانمونہ پیش کیاگیاہے۔یہ دلیل بلحاظ دلائل قوی معلوم ہوتی ہے،صرف غورکرنے کی بات ہے کہ کیاالفاظ بھی ان معانی کے متحمل ہوسکتے ہیں۔

﴿ فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝ يَقُولُ الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفَرُّ ۝ ﴾ (۷۵/ القیامۃ۷۔۱۰)

''پھر جبکہ آنکھ پتھراجائے گی چاند بے نور ہوجائے گا۔سورج اور چاند جمع کردیئے جائیں گے۔ اس دن انسان کہے گا کہاں ہے بھاگنے کی جگہ؟''

ان آیات میں اس حالت کو بیان کیاگیاہے جوقیامت کی ہولناکیوں کو دیکھنے سے پیش آئے گی۔جس دن کووہ جھٹلایا کرتا تھا وہ اپنی پوری دہشت ناکیوں کے ساتھ سامنے ہوگا۔اس منظر کودیکھ کراس کی نگاہیں پتھراجائیں گی، یہی معنی ہیں ﴿ بَرِقَ الْبَصَرُ ﴾ کے۔ ﴿ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ﴾ یعنی ''چاند سیاہ پڑجائے گا'' اس کی

روشنی زائل ہوجائے گی۔ ﴿وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ﴾ (۷۵/ القیامۃ:۹) ''اس دن سورج اور چاند دونوں اکٹھے ہوجائیں گے۔'' حالانکہ اس سے قبل کبھی یکجا نہ ہوئے تھے۔ان کو وہ ذات جمع کردے گی جو منتشر انگلیوں کے پوروں کو جمع کرنے پر قادر ہے۔اس دن انسان کے اگلے پچھلے تمام اعمال جمع کردیے جائیں گے اور اُن کو وہ جمع کرے گا جس نے اپنے رسول ﷺ کے سینے میں قرآن جمع کیا ہے۔ مومنوں کو عزت کے مقام پر جمع کرے گا جہاں وہ دیدارالٰہی سے مشرف ہوں گے اورکافروں کو ذلت کی جگہ میں اکٹھا کرے گا۔اللہ ان تمام کاموں پر قادر ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی پیدائش کا سلسلہ بنایا ہے، اس نے منی کے متفرق قطرات کو لوتھڑے کی صورت میں عورت کے رحم میں جمع کردیا حالانکہ پہلے انسانی بدن کے تمام اعضا میں پھیلے ہوئے تھے اور جس طرح کہ اللہ تعالیٰ،ملک الموت اورانسان کو جمع کردیتا ہے اورمیت کی پنڈلی سے پنڈلی ملادیتا ہے۔

﴿وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ﴾ (۷۵/ القیامۃ:۲۹) کے متعدد معانی ہو سکتے ہیں:

① میت کی دونوں پنڈلیاں۔

② کفنانے والے اورمیت کی پنڈلیاں۔

③ دنیا اورآخرت کی سختیاں۔

جبکہ انسان جمع کرنے کی یہ تمام صورتیں دیکھتا اورسنتا ہے تو پھر قیامت کے روز اگلے اورپچھلے انسانوں کے ساتھ جمع ہونے سے کیسے انکار کرسکتا ہے۔اس دن توانسان، اس کا عمل اوراس کی جزاسب یکجا نظر آئیں گے۔جب کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انسان کے لیے امرونہی اور بندگی کے تقاضوں کو یکجا بیان کردیا ہے تو پھر کیسے ہوسکتا ہے۔کہ اس کو مہمل وبے کار چھوڑ دیا جائے کہ نہ وہ کسی حکم کے ماتحت ہو اورنہ ثواب وعذاب کا انتظام ہواورغفلت ومعصومیت کے متعلق دربارالٰہی میں کوئی بازپرس ہو۔(ایسا ہونا اللہ کی صفت رحمت وعدل کے بالکل خلاف ہے۔)

اس سورت میں ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تمام چیزوں کو بیان کر دیا گیا ہے۔جن میں جمع اور یکجائی کے معنی پائے جاتے ہیں:

① قیامت کے دن جبکہ تمام پہلے وپچھلے جمع ہوں گے۔

② نفس لوّامہ جس میں افکار،خیالات،عقائد،ارادوں اور پریشانیوں کا اجتماع ہوتا ہے۔

یہ سورہ مبدأ ومعاد،دنیا وآخرت،قیامت صغریٰ وقیامت کبریٰ اور آخرت میں لوگوں کے حالات بتلا رہی ہے۔کوئی خوش وخرم تروتازہ ہوگا اور کوئی رنجیدہ عذاب میں مبتلا ہوگا۔روح کا وصف اور جان کنی کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ یہ روح ایک ایسی مادی چیز ہے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوسکتی ہے۔ (موت کے وقت) تمام بدن کے گوشوں سے سمٹ کر حلقوم میں پہنچ جاتی ہے اور حاضرین کہتے ہیں:

﴿مَنْ ٚ رَاقٍ﴾ (۷۵/ القیامۃ: ۲۷)

یعنی ہے کوئی جھاڑ پھونک والا؟ جو اس مرض والے کو موت کے پنجے سے چھڑا لے۔ایسے وقت میں جھاڑ پھونک والے کی تلاش ہوتی ہے یہ علاج کی آخری تدبیر ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ ﴿مَنْ ٚ رَاقٍ﴾ (۷۵/ القیامۃ:۲۷) کے معنی ہیں کہ اس روح کو آسمان کی طرف کون لے جائے گا؟ رحمت کے فرشتے یا عذاب کے؟

پہلے معنی کی صورت میں اس کا مصدر ہوگا رُقیۃ جس کے معنی ہیں جھاڑ پھونک،اور فعل آئے گا رمیٰ یرمی کے وزن پر رقیٰ یرقی۔دوسرے معنی کی بنا پر اس کا مصدر ہوگا رقاء اور فعل آئے گا خَشِیَ یخشٰی کے وزن پر رَقِیَ یرقیٰ۔ پہلا معنی چند وجوہ کی بنا پر راجح اور قوی ہے:

① ہر میت کے حاضرین یہ نہیں کہا کرتے کہ اس کی روح کو کون سے فرشتے لے جائیں گے۔بلکہ وہی کہہ سکتے ہیں جو فرشتوں کی اس صفت پر ایمان رکھتے

ہیں۔اس کے برخلاف رُقیۃ (دعا جھاڑ پھونک) کی طلب ہر شخص کرتا ہے،آیت میں عموم ہے،اس لیے عام معنی لینا مناسب ہے۔

② فرشتے توروح کوموت کے بعد لے جاتے ہیں اور یہ ﴿مَنْ ۜ رَاقٍ﴾ کا سوال تو اس سے قبل ہوتا ہے۔زندگی کی حالت میں تو رُقیۃ کی خواہش اورطلب ہی ہوتی ہے۔جھاڑ پھونک کرنے والے کے متعلق توعلم ہوسکتا ہے اوراس کے بارے میں سوال مفید بھی ہوسکتا ہے۔کیونکہ وہ محسوس مشاہدہ میں آنے والی شخصیت ہے، بخلاف فرشتوں کے کہ ان کی تعیین نہیں ہوسکتی۔کیونکہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہیں اوراصل مقصود سوال سے تعیین ہی ہے۔

سورۂ قیامہ کے بعض لطائف

اس سورت میں ایک خاص حسن یہ ہے ،کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے صالحین بندوں کے ظاہری اورباطنی جمال وخوبصورتی کو یکجابیان کردیا ہے۔ان کے چہروں کوتروتازگی اورمسرت وخوشی سے آراستہ کیاہے اوران کے باطن کواپنے دیدار کی فرحت سے مالامال کیاہے۔

اس ظاہری اورباطنی حسن وجمال کودوسری آیات میں بھی جمع کیا گیاہے:

① ﴿وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا﴾ (۷۶/ الدھر:۱۱)

’’اورعطا کی ان کوتروتازگی (ظاہری جمال)اورخوشی (باطنی حسن)۔‘‘

② ﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ﴾ (۷/ الاعراف:۲۶)

’’اے بنی آدم! ہم نے تم پرلباس اتاراہے جوتمہاری ستر پوشی کرتا ہے اورباعث زینت بنتا ہے (یہ ظاہری جمال ہے۔) اور تقویٰ پارسائی کا لباس بہت بہتر ہے (یہ باطنی جمال ہے)۔‘‘

③ ﴿اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاۗءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِۨ الْكَوَاكِبِ ۙ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ﴾ (۳۷/ الصافات:۷۔۸)

’’ہم نے آسمان دنیا کوستاروں سے زینت دی ہے،(ظاہری حسن)

اوراس کو سرکش وشیطان سے محفوظ رکھا ہے، (باطنی خوبصورتی)۔"

④ عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کی شان میں کہا تھا:

﴿فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ۝﴾ (۱۲/ یوسف:۳۱)

"ملامت گر عورتوں نے جب حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو ان کو بڑا جانا اور اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور کہہ اٹھیں یہ انسان نہیں یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔"

یہ ظاہری جمال کا اقرار تھا۔اس کے بعد عزیز مصر کی بیوی نے باطنی جمال بھی ظاہر کر دیا:

⑤ ﴿قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ؕ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ﴾ (۱۲/ یوسف:۳۲)

"اس نے کہا وہی ہستی ہے جس کے بارے میں تم مجھ کو ملامت کرتی تھیں۔میں نے اس کو اپنے نفس کی طرف پھسلایا لیکن وہ تو عصمت وعفت کا پتلا نکلا۔"

یہ باطنی جمال پر روشن شہادت ہے حضرت یوسف علیہ السلام دونوں قسم کے جمالوں میں انتہائی کمال رکھتے تھے۔اسی کے قریب ہم معنی یہ آیت ہے:

⑥ ﴿اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى۝﴾

(۲۰/ طٰہٰ:۱۱۸۔۱۱۹)

"بیشک تو (اے آدم!) اُس (جنت) میں نہ بھوکا رہے گا اور نہ ننگا، اور نہ پیاسا ہو گا اور نہ دھوپ کی تکلیف اٹھائے گا۔"

پہلی آیت میں بھوک اور عریانی کو یکجا بیان کیا ہے۔بھوک باطنی تکلیف ہے اور عریانی ظاہری ذلت۔اسی طرح دوسری آیت میں پیاس اور دھوپ کا ذکر ہے۔ پیاس اندرونی عارضہ ہے اور دھوپ بیرونی زحمت۔

⑦ ﴿ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۷)

"اور توشہ لو اور بہتر توشہ تقویٰ ہے۔"

اس میں ظاہری اور باطنی، روحانی اور جسمانی، دنیوی اور اخروی دونوں کے توشوں کو بیان فرما دیا ہے۔

⑧ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا:

﴿ يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ ﴾ (۱۱/ ہود:۵۲)

"اے میری قوم! اپنے رب سے (اپنے گناہوں) کی معافی چاہو پھر اس کی طرف (جھک کر) توبہ کرو، وہ تم پر برستا ہوا بادل بھیجے گا اور تمہاری قوت میں اضافہ فرمائے گا۔"

بارش کا نزول ظاہری نعمت ہے، اضافہ قوت باطنی دولت۔

⑨ ﴿ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ﴾ (۸۶/ الطارق:۱۰)

"یعنی گناہ گار کے پاس عذاب کو روکنے کے لیے نہ تو اندرونی قوت ہوگی اور نہ کوئی بیرونی مددگار۔"

نکتہ دوم

اس سورت میں اس بات کی تعلیم و تلقین کی گئی ہے کہ علم کے حاصل کرنے میں جلد بازی کی بجائے تحمل و بردباری اختیار کی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ علم کے شوق اور حرص کی بنا پر استاد کی فراغت سے پہلے ہی شاگرد سبق دہرانا شروع کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی ادب سکھلایا ہے کہ وحی کو نہایت صبر و تحمل کے ساتھ ذہن میں جمالیں اور جبرائیل علیہ السلام کی قراءت کے بعد اپنی قراءت شروع کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو ہدایت دی گئی ہے اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے استاد کے کلام کو خوب اچھی طرح سن کر پھر اُسے دہرائے۔ اگر کوئی حل طلب سوال ہو تو اُسے دریافت کر لے۔ لیکن اس معاملہ میں

استاد پر سبقت لے جانے کی کوشش نہ کرے۔اس قسم کی ہدایت قرآن میں تین جگہ بیان کی گئی ہے:

① اسی سورۂ قیامہ کی آیت ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ﴾ (۷۵/ القيامة:۱۶)

② ﴿وَكَذَٰلِكَ أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا وَصَرَّفْنَا فِيهِ مِنَ الْوَعِيدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ أَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ۝ فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۗ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ ۖ وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا ۝﴾

(۲۰/ طٰه: ۱۱۳۔۱۱۴)

''اوراسی طرح اتاراہم نے اُسے عربی قرآن کی صورت میں اوراس میں وعید اور تنبیہ کو باربار دہرایا ہے،تاکہ وہ (گناہ) سے بچ جائیں یا ان کے لیے کوئی ذکر (نوشتہ) ظاہر کردے۔ پس مِلک حق اللہ تعالیٰ ہی کے لیے بلندی ہے۔سلسلہ وحی ختم ہونے سے پہلے اس کے پڑھنے میں جلدی نہ کریں۔آپ کہہ دیں کہ اے اللہ! میرا علم زیادہ کر۔''

③ ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ ۝ إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۚ﴾ (۸۷/ الاعلیٰ: ۶۔۷)

''ہم عنقریب آپ کو پڑھائیں گے کہ آپ بھولیں گے نہیں مگر جو اللہ چاہے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ خود اس بات کا ضامن ہوا ہے کہ جو ہم پڑھائیں گے۔وہ آپ کے سینے میں محفوظ رہے گا۔نزول وحی کا وقت ہو یابعد کا دونوں حالتوں میں بھول چوک سے بچایا جائے گا۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی مذمت کی ہے جو آجلہ (آخرت) پر عاجلہ (دنیا) کو ترجیح دیتا ہے اور یہ اس لیے کہ انسان فانی دنیا سے لطف اندوز ہونے کی ہوس میں پڑا ہوا ہے اور باقی رہنے والی آخرت کی پروا ہی نہیں کرتا ہے۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی کئی جلد بازیاں بیان فرمائی ہیں۔یہ سب کچھ اس بنا پر ہے کہ عاجلہ (دنیا) کی محبت دل

میں سمائی ہوئی ہے، بدکاری کا ارادہ، قیامت کی تکذیب (جھٹلانا)، فرائض نماز کا چھوڑنا، اللہ تعالیٰ سے روگردانی اور دنیاوی حصہ کے حصول کے لیے شب وروز دوڑ دھوپ ان سب کی اصل جڑ حُبِّ عاجلہ (دُنیا کی محبت) ہے۔

انسان کی حرص اور جلدبازی کا تو یہ حال ہے جبکہ اس کے مقابلہ میں اس کے خالق ورب کا یہ حال ہے کہ وہ نہایت بردباد ہے۔مہلت پر مہلت دیئے جاتا ہے پکڑنے اور عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا۔یہاں تک کہ روح حلقوم میں پہنچ جاتی ہے اور موت کا یقین ہو جاتا ہے۔ اس پوری زندگی میں آیتیں اتارتا ہے، مثالیں بیان کرتا ہے اور اس بات پر تنبیہ فرماتا ہے کہ اس نے کس طرح قطرۂ منی سے خون بستہ بنایا، لوتھڑا تیار کیا اور پھر نہایت موزوں قدوقامت والا انسان بنادیا۔اللہ نے سلسلہ پیدائش بھی آہستہ آہستہ مناسب ترتیب کے ساتھ انجام دیا اور گناہ پر بار بار مہلت دی اور جزا کا معاملہ بھی تدریجی رکھا اور اچانک نہیں پکڑا۔لیکن پھر بھی انسان اس مہلت کی قدر نہیں کرتا بلکہ اپنی جلدبازی اور سرکشی پر اڑا ہوا ہے۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مذمت فرمائی ہے:

﴿ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا ﴾ (۱۷/ الاسراء:۱۱)

''انسان نہایت جلدباز ہے۔''

﴿ خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ۚ سَأُورِيكُمْ آيَاتِي فَلَا تَسْتَعْجِلُونِ ﴾

(۲۱/ الانبیاء:۳۷)

''انسان جلد باز پیدا ہوا ہے۔میں تم کو عنقریب اپنی نشانیاں دکھاؤں گا۔ان کے طلب کرنے میں جلدبازی نہ کرو۔''

نکتہ سوم، اثباتِ نبوت وقیامت

اس سورت کے مضمون سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ نبوت اور قیامت کا ثبوت عقل کے ذریعہ معلوم ہوسکتا ہے۔اگرچہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے لیکن راجح مسلک یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس خیال کو رد فرمایا ہے کہ انسان اپنی زندگی میں

بے کار چھوڑ دیا جائے نہ اس کو کسی بات کا حکم دیا جائے اور نہ اُسے کسی بات سے روکا جائے ، نہ ثواب ہو اور نہ عذاب۔(کوئی صحیح عقل بھی اس کو نہیں مان سکتی۔)اس خیال کی تردید اللہ تعالیٰ نے محض خبر کے ذریعہ نہیں کی بلکہ(صحیح عقلی دلیل پیش کی)یہ ایسا خیال ہے کہ اس کی نسبت اللہ کی طرف ہو ہی نہیں سکتی اور نہ ایسا فیصلہ یا گمان درست قرار دیا جاسکتا ہے۔پھر اس خیال کے فساد پر یہ دلیل بیان کی کہ جس اللہ نے ایسا سلسلہ پیدائش بنایا اور انسان کو مختلف دوروں اور حالتوں میں سے گزارا یہاں تک کہ وہ اپنے کمال کو پہنچ گیا۔کیا وہ انسان کو بے کار چھوڑ سکتا ہے؟اس بات سے اللہ پاک ہے، جیسا کہ وہ ہر قسم کے عیب، کمزوری اور فضول کام سے بالاتر ہے۔قرآن کا یہی طرز استدلال متعدد جگہ ملتا ہے۔فرمایا:

﴿ أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ۝ فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ ۝ ﴾

(۲۳/ المؤمنون:۱۱٦)

”کیا تم نے پھر یہ خیال کر لیا ہے کہ ہم نے تم کو بے کار پیدا کیا ہے اور یہ کہ ہماری طرف لوٹ کر نہ آؤ گے، اللہ تعالیٰ ملک حق بلند و بالا ہے نہیں کوئی الٰہ مگر وہی بزرگ عرش کا رب۔“

اس آیت میں غلط گمان کی تردید اور اس کی عام کامل ربوبیت و پروردگاری کے ثبوت میں چار باتیں کی ہیں:

① کامل بادشاہت اسی کے لیے ہے۔

② وہ سرتاپا حق ہے۔

③ اس کے سوا کوئی الٰہ (معبود) نہیں۔

④ وہ بزرگ عرش کا رب ہے۔

یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بلامقصد پیدا کیا ہے ایسا ہی غلط اور باطل ہے،جیسا کہ یہ کہنا کہ وہ ہماری سرگوشیوں کو نہیں سنتا،وہ ہم کو نہیں دیکھتا،وہ ہم

پر قادر نہیں ہے اور یہ خیال کرنا، کہ وہ اپنے دوستوں اور دشمنوں کو زندگی اور موت دونوں حالتوں میں ایک درجہ پر رکھے گا۔یا یہ کہ اس نے کسی انسان کو اپنا بیٹا یا شریک بنا لیا ہے۔یہ تمام باتیں اس کے کمال تقدس کے یکسر خلاف ہیں۔ اگر انسان کو بلامقصد پیدا کرنے پر محض سماعی دلیل کافی ہوتی تو ﴿اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً﴾ کہنے کی ضرورت نہ پڑتی۔

دوسری دلیل

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات اور ان کے تقاضوں کو معطل و بے معنی قرار دینا جائز نہیں۔اس کی بادشاہت حقہ چاہتی ہے کہ وہ حکم دے، منع کرے، ثواب سے نوازے، عذاب کے ساتھ سزا دے اور اپنے رسولوں کو بھیجے، کتابوں کو نازل کرے قیامت کا دن مقرر کرکے اس میں ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دے، جس نے ان باتوں کا ہی انکار کر دیا، گویا اس نے بادشاہت ہی کو تسلیم نہیں کیا اور ایسا شخص اپنے رب کا منکر قرار دیا جائے گا۔وہ زبان سے اللہ کا اقرار ہی کیوں نہ کرتا ہو۔اللہ پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی صفات کمال وجلال اور ان کے تقاضوں کو پوری طرح تسلیم کیا جائے۔ اگر کوئی شخص ان صفات کا انکار کرتے ہوئے اللہ کی ذات پر ایمان لاتا ہے۔تو گویا وہ ایسے معبود پر ایمان رکھتا ہے جس کا وجود صرف ذہن میں ہے۔

رب العالمین اور الٰہ العالمین اس بے صفت خدائی سے پاک ہے اس کی صفت حیٌّ (زندہ) چاہتی ہے کہ وہ شنوائی، بینائی، قدرت، ارادہ اور علم رکھتا ہو۔ وہ قیوم ہے اس کی قیومیت کا تقاضا ہے کہ وہ تمام عالم کا انتظام کرے اور مخلوق کی مصلحت ومنفعت کی نگہداشت فرمائے۔لیکن جس نے ان صفات کا انکار کر دیا تو اس کا اللہ کو الحیّ القیوم ماننا فعل عبث ہے۔ [1]

---

[1] التبیان ۹۲-۱۰۲۔

تفسیر سُوْرَۃُ التَّکْوِیْر

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ﴾ (۸۱/ التکویر:۱۵، ۱۶)

''میں قسم کھاتا ہوں ظاہر ہونے والے، چھپنے والے، چلنے والے ستاروں کی۔''

اس آیت کے سلسلہ قسم میں ستاروں کے تین احوال بیان ہوئے ہیں، ستاروں کا طلوع، ان کا چلنا اور غروب ہونا۔ حضرت علی، ابن عباس رضی اللہ عنہم اور عام مفسرین کا یہی قول ہے اور یہی درست ہے۔

خُنَّسْ کی لغوی تحقیق

خُنَّس خانس کی جمع ہے۔ خُنَّس کے معنی ہیں سمٹنا اور چھپنا، اسی بنا پر شیطان کا ایک نام ''خنّاس'' بھی ہے، جب بندہ اللہ کو یاد کرتا ہے تو وہ سمٹتا اور سکڑتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''فانخنستُ'' میں پیچھے ہٹ گیا۔ [1]

کُنَّسْ کی تحقیق

کُنَّس، کانس کی جمع ہے (گھر میں داخل ہونے والا) اسی سے یہ محاورہ ہے تکنست المرأۃ یعنی عورت ہودج میں داخل ہوگئی۔ جب ہرن اپنے غار میں پناہ لیتا ہے، تو کہا کرتے ہیں ''کنست الظباء''۔

جواری، جاریۃ کی جمع ہے۔ جیسا کہ غواش، غاشیۃ کی جمع ہے۔

خُنَّس اور کُنَّس کی تفسیر میں چند اقوال ہیں:

① ستارے دن کو اوجھل ہو جاتے ہیں اور رات کو نکل آتے ہیں (از حضرت

[1] صحیح البخاری ۱/ ۱۰۹(۲۷۹) الغسل: باب عرق الجنب، وان المسلم لاینجس؛ صحیح مسلم ۱/ ۲۸۲(۳۷۱) الحیض: باب الدلیل علی ان المسلم لا ینجس۔

علی رضی اللہ عنہ ،قتادہ و مقاتل رحمۃ اللہ علیہما) یعنی ستارے سورج کی روشنی میں نگاہوں سے چھپ جاتے اور پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور غروب کے وقت اپنے منازل میں داخل ہو جاتے ہیں۔

② خنوس سے مراد ستاروں کی رجعی حرکت ہے۔ یعنی مشرقی حرکت، کیونکہ ان کی دو حرکتیں ہوتی ہیں، ایک کا تعلق ستاروں کے فعل سے ہوتا ہے اور دوسری کا نفس ذات سے ۔

③ کنوس اور خنوس دونوں کے معنی اوجھل ہونے کے ہیں، اصل حقیقت یہ ہے کہ یہاں ستاروں کے تمام حالات کی قسم کھائی گئی ہے۔ خنوس سے حالت ظہور کی طرف اشارہ ہے کیونکہ چھپنا اسی کے لیے ہوسکتا ہے جو پہلے ظاہر رہ چکا ہو۔ستاروں کا طلوع وغروب اور رفتار سب اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ بعض مفسرین نے خنس اور کنس سے مراد ہرنوں کو لیا ہے۔لیکن یہ معنی چند وجوہ سے درست نہیں ہے:

❶ جن حالات کا یہاں ذکر ہے ان کا ستاروں میں مراد لینا زیادہ سرمایہ عبرت ہے اور یہ ستارے ربوبیت پر ایک بڑی واضح نشانی اور علامت ہیں۔ قرآن زیادہ تر واضح اور روشن امور کو بطور دلیل پیش کیا کرتا ہے۔

❷ اگر یہاں ہرن مراد ہوتے تو خانس کی جمع خُنَّسْ آتی نہ کہ خُنُسْ، جیسا کہ صائم کی جمع صوم اور قائم کی جمع قُوَّم ہے۔

❸ قرآن کی یہ عادت نہیں ہے کہ گائے، ہرن جیسی اشیاء کی خاص طور پر قسم بیان کرے۔ بلکہ وہ ہر نوع میں سے اس کی اعلیٰ قسم کو بیان کرتا ہے۔ نفوس میں سے اعلیٰ نوع نفسِ انسانی ہے۔ تمام کلاموں میں افضل کلام الٰہی ہے اور علویات (بلند اشیاء) میں سے بہتر سورج، چاند اور ستارے ہیں اور راتوں میں سب سے افضل عشرہ ذی الحجہ کی دس راتیں ہیں۔ اسی لیے سلسلہ قسم میں انہیں کو بار بار بیان کیا ہے۔لیکن اعلیٰ اور اشرف اشیاء کے علاوہ اور کو عام الفاظ میں ذکر کرتا ہے،

جیسا کہ فرمایا:

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۝﴾ (۶۹/ الحاقة: ۳۸، ۳۹)

”میں قسم کھاتا ہوں جن کو تم دیکھتے ہو اور جن کو تم نہیں دیکھتے۔“

④ یہاں ساتھ ہی راتوں کی قسم بھی بیان ہوئی ہے۔خنس سے ستاروں کو مراد لینا ان دونوں سے مناسبت رکھتا ہے۔ ہرن وغیرہ کا ذکر یہاں بالکل بے جوڑ نظر آتا ہے۔

⑤ مقسم علیہ (قرآن) اور مقسم بہ (ستاروں) کے درمیان خاص مناسبت ہے۔ستارے چلنے والوں کے لیے ہدایت اور شیاطین کے لیے باعث لعنت و عذاب ہیں اور قرآن جہانوں کے لیے سرتاپا ہدایت،دلوں کے واسطے زینت اور شیطانی شکوک و شبہات کا مٹانے والا ہے، یہ ربط التفات ہرن اور قرآن کے مابین کہاں؟

﴿وَالَّیْلِ اِذَا عَسْعَسَ ۝ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۝﴾ (۸۱/ التکویر: ۱۷، ۱۸)

”قسم ہے رات کی جبکہ چلی جائے اور دن کی جبکہ روشن ہو۔“

عَسْعَسَ کی تفسیر میں اَقْبَلَ (آئے) اَدْبَرَ (جائے) دونوں منقول ہیں، لیکن زیادہ مناسب "ادبر" ہے۔ رات کی واپسی اور دن کی آمد، روشنی کا قوت کے ساتھ پھیلاؤ اور اندھیرے کی ضعف و ناتوانی کی حالت میں پسپائی، اپنے اندر بہت کچھ سامان عبرت رکھتی ہے۔

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ ۝﴾ (۸۱/ التکویر: ۱۹)

”بیشک وہ بزرگ رسول کا قول ہے۔“

اب سلسلہ قسم کے بعد مقسم علیہ کو بیان کیا گیا ہے۔ یہاں رسول سے یقینی طور پر جبرائیل ہی مراد ہیں۔ بعد والی صفات اسی مراد کو معین کرتی ہیں۔ ہاں سورۃ الحاقۃ میں رسول کریم سے محمد رسول اللہ ﷺ مراد ہیں کیونکہ وہاں اس کے بعد دشمنوں کے اس قول کی تردید ہے کہ یہ قرآن شاعر یا کاہن کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ

نے قرآن کی نسبت کبھی تو رسول ملکی (جبرائیل) اور کبھی رسول بشری (ﷺ) کی طرف فرمائی ہے۔ لیکن اس نسبت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان دونوں نے از خود یہ قرآن بنا لیا ورنہ پھر تو آیات میں تناقض اور ٹکراؤ نظر آئے گا بلکہ یہاں نسبت بلحاظ تبلیغ ہے۔ خود لفظ رسول اس معنی کی تائید کر رہا ہے۔ رسول وہی ہوتا ہے جو مرسل (بھیجنے والے) کے کلام کو پہنچائے، نہ کہ اپنے کلام کو۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ یہ کلام اُس ذات کا ہے جس نے محمد ﷺ اور جبرائیل کو منصب رسالت پر فائز فرمایا۔ اس آیت میں ان لوگوں کے لیے قطعاً گنجائش نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے متکلم بالقرآن ہونے کے منکر ہیں۔ بلکہ یہ آیت تو اس کے برعکس مضمون پر روشنی ڈالتی ہے کہ یہ کلام الٰہی ہے اور ان رسولوں نے صرف تبلیغ کا فرض انجام دیا ہے۔ جبرائیل نے اِسے اللہ تعالیٰ سے سنا ہے اور آنحضرت ﷺ نے جبرائیل سے۔

﴿ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِیْنٍۙ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍؕ۝﴾

(۸۱/ التکویر: ۲۰، ۲۱)

”جو قوت والا ہے، عرش والے (اللہ) کے نزدیک بلند مرتبہ، جس کی (آسمانوں میں) اطاعت کی جاتی ہے، امین ہے۔“

حضرت جبرائیل رسول ملکی کی پانچ صفتیں بیان ہوئی ہیں:

① کریم (بزرگ)

② صاحب قوت

③ رتبہ والا

④ اس کے ماتحت فرشتے اس کی اطاعت کرتے ہیں۔

⑤ امانت دار

یہ پانچوں صفات بتلارہی ہیں کہ قرآن کی سند کس قدر بلند پایہ اور ہر قسم کی خامیوں سے پاک ہے۔ اس سند کی بلندی اور بے عیبی کے لیے یہی کیا کچھ کم ہے کہ خود اللہ تعالیٰ اس کے راویوں کی دیانت و امانت کو بیان فرماتا ہے،

پہلی صفت کریم کے معنی یہ ہوئے کہ قرآن کو جو فرشتہ اللہ کی طرف سے لایا ہے۔ وہ نہایت ہی شریف ہے دشمنوں کے قول کے مطابق قرآن کا لانے والا شیطان نہیں ہے۔ کیونکہ شیطان تو ظاہر و باطن، صورت و سیرت ہر لحاظ سے خبیث، اخبث اور کمینہ ہے۔ شرافت و خیر کا اس میں نام تک نہیں ہے۔ اس کے برعکس رسول مَلکی صورت و سیرت کے اعتبار سے حُسن و جمال اور خیر و سعادت سے مالا مال ہے۔ خود پاکیزہ ہے اور پاکیزہ انسان کا معلم ہے۔ ایمان، معرفت الٰہی، ہدایت وعلم، نیکی اور پارسائی کی روشنی اس کے ہاتھوں اللہ نے زمین میں پھیلائی ہے۔ یہ ظاہری اور باطنی کرم کا وہ شرف ہے جو حضرت جبرائیل علیہ السلام کو حاصل ہوا ہے۔

ذو قوۃ کی تشریح

ذو قوۃ ہی کے ہم معنی دوسری جگہ ﴿عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى﴾ (۵۳/ النجم:۵) (سکھایا اُسے مضبوط قوتوں والے نے۔) بیان ہوا ہے۔ اس صفت میں چند باتوں پر تنبیہ کی گئی ہے:

① حضرت جبرائیل علیہ السلام اس قوت کی بنا پر شیاطین کو اپنے نزدیک بھی پھٹکنے نہیں دیتے کہ وہ اس کلام الٰہی میں کوئی کمی بیشی کر سکیں بلکہ وہ تو حضرت جبرائیل کو دیکھتے ہی دم دبا کر بھاگ جاتے ہیں۔

② یہ جبرائیل علیہ السلام اس رسول کا معاون و مددگار ہے جس کو تم نے جھٹلایا ہے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر ہے:

﴿وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ﴾ (٦٦/ التحريم: ٤)

''اگر وہ دونوں اس پر اڑ جائیں تو بیشک اللہ اس کا دوست ہے اور جبرائیل اور نیک مؤمنین اور فرشتے بھی اس کے بعد مددگار ہیں۔''

جس نبی کا ایسا قوی فرشتہ حامی اور دوست ہو تو وہ لامحالہ ہدایت یافتہ اور کامیاب ہوگا، اللہ کی ہدایت و نصرت سے ہمیشہ سرفراز رہے گا۔

③ جس کسی نے اس نبی ﷺ سے دشمنی مول لی تو گویا اُس نے اُس کے دوست جبرائیل کو اپنا دشمن بنالیا۔ ظاہر بات ہے کہ قوی طاقتور کو اپنا دشمن بنالینے کی صورت میں نتیجہ سوائے ہلاکت کے اور کیا نکل سکتا ہے۔

④ حضرت جبرائیل علیہ السلام قوت اور امانت کی وجہ سے اُن باتوں کے جاری کرنے پر قادر ہیں جن کا انہیں حکم دیا گیا ہے۔ اس لیے ان کی صفت القوی الامین بیان ہوئی ہے، دنیا میں عام قاعدہ ہے کہ ذمہ داری، وکالت، نیابت، پیغامبری اور گورنری کا عہدہ اُسے سونپا جاتا ہے جو بادشاہ کے نزدیک صاحب رتبہ، قوی امین اور لوگوں میں بااثر ہو۔ جس قدر کام اہم ہو گا اسی قدر ان صفات کا لحاظ رکھا جائے گا۔ حضرت جبرائیل کا ان صفات کے ساتھ موصوف ہونا مُرسل (بھیجنے والے) پیغام، قاصد اور مُرسل الیہ (جس کی طرف قاصد بھیجا گیا ہے۔) ان چاروں کی شان وعظمت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے کہ بادشاہوں کا عام قاعدہ ہے کہ بڑے کاموں میں شریف اور صاحب رتبہ کو قاصد بنا کر بھیجتے ہیں۔

﴿عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ﴾ (۸۱/ التکویر:۲۰)

''یعنی اللہ کے ہاں ان کا بہت بڑا درجہ ہے۔''

عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بلند مقام حاصل ہے کیونکہ وہ عرش کے قریب ہی ہیں۔

مطاع

اس صفت سے اس بات پر تنبیہ ہے کہ جبرائیل علیہ السلام کی تمام فوجیں اور معاونین اس کی اطاعت کرتی ہیں جب وہ محمد ﷺ کی مدد کے واسطے ان کو بلاتا ہے تو ان میں سے کوئی بھی پیچھے نہیں رہتا، لفظ مطاع سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ کافر جس نبی کو جھٹلاتے ہیں اور دشمنی کرتے ہیں وہ بھی ایک دن زمین میں مطاع بنے گا لوگ اس کی اطاعت کریں گے۔ جیسا کہ جبرائیل علیہ السلام آسمان میں مطاع ہے۔ دونوں رسول یعنی مَلَکی اور بشری اپنی اپنی جگہ اور اپنے

اپنے حلقہ میں مطاع اور سردار ہیں، اس لفظ سے حضرت جبرائیل علیہ السلام کی شان و عظمت ظاہر ہوتی ہے کہ یہ اپنے ماتحتوں میں اسی طرح مطاع ہیں جس طرح بادشاہ اپنی رعایا میں ہوتا ہے۔ اسی لیے ایسے بڑے اہم کام کے لیے اسی قسم کی شخصیت ہی موزوں ہو سکتی ہے۔

امین

صفت امانت سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے وحی الٰہی کے یاد کرنے اور پہنچانے میں کسی قسم کی خیانت نہیں کی ہے۔ بلکہ پیغمبری کے حق کو پوری خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔

﴿ وَمَا صَاحِبُكُم بِمَجْنُونٍ ﴾ (۸۱/ التکویر:۲۲)

''اور تمہارا ساتھی پاگل نہیں ہے۔''

اس آیت میں رسول بشری صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عیب سے پاک بتلایا گیا ہے جو دشمن آپ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اس بات کا علم مشرکین کو بھی تھا وہ جانتے تھے کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وہ سراسر جھوٹ ہے۔

﴿ وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ ﴾ (۸۱/ التکویر:۲۳)

''اور بے شک دیکھا اس کو روشن کنارہ پر۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام ایک واقعی موجود ہستی ہے جو آنکھوں سے دیکھی جا سکتی ہے۔

فلاسفہ کا فرشتوں کو محض ایک خیالی وجود قرار دینا درست نہیں۔ یہ عقیدہ تمام انبیائے کرام کے خلاف ہے۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت جبرائیل کو دیکھنا ایک نہایت اہم مسئلہ ہے، اس کے انکار سے کفر لازم آتا ہے۔ اگر کوئی رؤیتِ الٰہی کا انکار کر دے تو اس کو بالاتفاق کافر نہیں قرار دیا جائے گا۔ رؤیت باری تعالیٰ پر نبوت کا ثبوت موقوف نہیں ہے۔ لیکن رؤیت جبرائیل علیہ السلام پر بہرحال اس کا دار و مدار ہے۔ بہ نسبت رؤیت باری تعالیٰ کے ہم اس کے اثبات کے زیادہ

محتاج ہیں۔ اگرچہ فی الواقع رویت باری تعالیٰ زیادہ عظمت وشان رکھتی ہے۔

﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ﴾ (۸۱/ التکویر: ۲٤)

"اور وہ غیب پر بخیل نہیں ہے۔"

اس آیت میں دونوں (جبرائیل علیہ السلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی بخل، حق پوشی، یانت سے براءت ظاہر فرمائی ہے۔ ایک کی براءت صراحتاً ہے اور دوسرے کی ضمنی طور پر، رسالت کا مقصود دو باتوں سے حاصل ہو سکتا ہے:

① وحی الٰہی کو بغیر چھپائے بندوں تک پہنچا دینا۔

② اس طرح اس کو ادا کرنا کہ ذرا بھی کمی بیشی نہ ہونے پائے۔

یہاں دو قراءتیں ہیں ضنین اور ظنین (متہم) یہ دونوں مستقل دو آیتیں ہیں۔

پہلی قراءت سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بخل و کنجوسی سے بالکل پاک تھے، عربی محاورہ ہے ضننتُ به یعنی بخلت به۔ جمیل بن معمر کہتا ہے:

اجود بمضنون التلاد واننی　　بسرك عمن ساء لنی لضنین

"میں موروثی قیمتی مال خرچ کرنے میں فیاض ہوں لیکن جو تیرا راز مجھے پوچھتا ہے تو میں اس کے ظاہر کرنے میں بخل سے کام لیتا ہوں۔"

ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: لیس بضنین یعنی لیس ببخیل بما انزل الله۔ "یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اللہ نے جو اتارا ہے اس کے بیان کرنے میں بخیل نہیں ہیں۔"

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ جو کچھ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہیں اس کے بیان میں بخل نہیں کرتے۔ غیب سے مراد وحی اور قرآن ہے۔

فراء نے کہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی آتی ہے آپ کو اس سے رغبت ومحبت ہے۔ لیکن پھر بھی اس کے اظہار میں تأمل نہیں فرماتے۔ یہ نہایت

لطیف نکتہ ہے، عام طور پر عادت یہی ہے کہ انسان قیمتی چیز کے ظاہر اور خرچ کرنے سے گریز کرتا ہے۔ خصوصاً ناقدری اور مذمت کرنے والوں کو تو وہ ایک جھلک بھی نہیں دکھا سکتا، اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ وحی الٰہی جیسی اعلیٰ اور بیش قیمت شے بلاکم وکاست بیان کر دیتے ہیں۔

ابو علی الفارسی نے کہا ہے کہ کاہن جب تک کہ اپنا نذرانہ نہیں لے لیتا اپنی خفیہ معلومات کو ظاہر نہیں کرتا۔ لیکن پیغمبر اسلام کا معاملہ دوسرا ہے یہاں بلامعاوضہ حق کی دعوت ہے وحی الٰہی کا واضح اعلان ہے۔

ایک دوسرا لطیف معنی

رسول اللہ ﷺ کو وحی الٰہی پر پورا ایمان اور اعتماد ہے۔ ان کو یقین ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اس میں ذرا بھی شک اور جھوٹ کی ملاوٹ نہیں ہے۔ نبی کو اس بات کا قطعاً اندیشہ ہوتا ہی نہیں کہ اس کی بات غلط نکلے گی یا اس میں کوئی تعارض و تناقض کی صورت پیدا ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دعوت اور اعلان میں کوئی جھجک اور رکاوٹ نہیں پائی جاتی بلکہ کمال جرأت اور پوری بے باکی سے وحی الٰہی کو ہر مجمع اور ہر مجلس میں سناتا اور پہنچاتا ہے۔ اس کے برعکس کاہن کو ہر وقت یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں اس کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے اور ساری ملمع سازی کا پول نہ کھل جائے، اس کو اپنی کسی بات پر اعتماد اور بھروسہ نہیں ہوتا، یہ صورت حال نبی کی صداقت پر ایک بہت بڑی دلیل ہے۔

دوسری قراءت ظنین

یعنی نبی ﷺ متہم نہیں ہیں۔ ان پر کسی خیانت اور بد دیانتی کی تہمت نہیں لگائی جا سکتی، وحی الٰہی کے ادا کرنے اور پہنچانے میں کچھ بھی کمی بیشی نہیں کرتے۔

ابو عبیدہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

اما و کتاب اللہ لاعن شناءۃ　　هجرت ولكن المحب ظنين

"سنو! اللہ کی کتاب کی قسم میں نے کسی بغض کی بنا پر جدائی اختیار

نہیں کی ہے بلکہ بات یہ ہے کہ دوست متہم ہے۔"

پہلے حضرت جبرائیل علیہ السلام کی صفت امانت بیان فرمائی اور اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت داری کو ظاہر فرمایا۔ ابو عبیدہ وغیرہ نے اس قراء ت کو چند وجھوں سے ترجیح دی ہے:

1 کفار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بخیل نہیں کہا تھا بلکہ یہ تہمت لگائی تھی کہ یہ الہام الٰہی نہیں ہے۔ بلکہ نبی کا خود ساختہ اپنا کلام ہے۔ اس تہمت کی نفی بخل کی نفی سے کہیں زیادہ یہاں مناسب ہے۔

2 علی الغیب میں علی کا لفظ اس بات پر قرینہ ہے کہ یہاں ظنین با لظاء زیادہ موزوں ہے، ضنین بالضاد کی صورت تو بالغیب باء کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔

3 اس قراء ت کی بنا پر یہ آیت حضرت جبرائیل علیہ السلام کی مذکورہ بالا صفتِ ثم امین کے ہم معنی ہوگی یعنی جبرائیل علیہ السلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں صفتِ امانت میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔

4 اس قراء ت کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ سے ہر قسم کے جھوٹ کی نفی ہوجائے گی۔

وحی کے جھوٹ ہونے کی چند صورتیں ہیں، یا تو نبی خود جھوٹ بولتا ہو یا اس کا معلم و استاد جھوٹا ہو۔ پہلی صورت میں جھوٹ قصداً ہوگا یا بلاقصد وارادہ۔ استاد کا جھوٹا ہونا تو اس آیت سے باطل ہے ﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ﴾ (۸۱/ التکویر:۲۵) "وہ راندے ہوئے شیطان کا قول نہیں ہے۔" باقی رہا نبی کا قصداً جھوٹ بولنا تو وہ ﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ﴾ (۸۱/ التکویر:۲۴) سے اس کی تردید ہوگئی یعنی نبی جھوٹ اور خیانت سے متہم نہیں ہے۔ بلکہ وہ ان داغوں سے پاک ہے۔

اسی طرح نبی بلاقصد بھی جھوٹ نہیں بولتا کیونکہ اس کی شان ہے: ﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ﴾ (۸۱/ التکویر:۲۲) "تمہارا صاحب مجنون پاگل نہیں ہے۔"

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ہر قسم کے جھوٹ سے بری کرتے ہوئے قرآن کے سلسلہ سند کی مضبوطی اور پاکیزگی ظاہر فرمادی۔ اسی لیے فرمایا:

﴿ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴾ (۸۱/ التکویر:۲۵)

یہی مضمون دوسری جگہ یوں ادا فرمایا ہے:

﴿ وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ۝ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴾

(۲٦/ الشعراء: ۲۱۰، ۲۱۱)

"اس قرآن کو لے کر شیطان نہیں اُترتے۔ نہ وہ اس کی صلاحیت و طاقت رکھتے ہیں۔"

جو لوگ شیاطین، مجانین اور متہمین کے احوال سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں اور انبیائے کرام کی سیرت پر ذرا بھی نظر رکھتے ہیں۔ اُن سے ان دونوں گروہوں کا فرق پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ ان دونوں میں اتنا واضح فرق ہے کہ کوئی سلیم الفطرت انسان اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ یہ فرق نور وظلمت کے امتیاز سے بھی کہیں زیادہ روشن ہے۔ اسی لیے اس کے بعد فرمایا:

﴿ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴾ (۸۱/ التکویر:۲٦) "تم کہا جارہے ہو؟"

یعنی دعوت شیاطین اور دعوت انبیا کے درمیان اس واضح فرق کے ہوتے ہوئے پھر تم کدھر بھٹکے جارہے ہو۔ یہ بہترین انداز خطاب ہے کہ پہلے حق کو باطل سے ممتاز کر کے بیان کر دیا جائے اور پھر مخاطب سے دریافت کیا جائے کہ اب اس کے خلاف کون سی راہ اختیار کر رہے ہو۔ حق و ہدایت کے سوا ہر راہ باطل اور فساد و تباہی کی طرف لے جانے والی ہے۔ اسی مفہوم کو ان آیات میں بھی بیان کیا گیا ہے:

﴿ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴾ (۷۷/ المرسلات: ۵۰)

"پھر تم کس بات پر اس کے بعد ایمان لاؤ گے؟" حق سے ہٹ کر باطل ہی باطل ہے تو پھر تم کدھر کا رخ کر رہے ہو؟"

دوسری جگہ فرمایا:

﴿فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ﴾ (۴۷/ محمد:۲۲)

یعنی قرآن اور رسول سے اعراض کی صورت میں فساد فی الارض قطع رحمی اور معصیت کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

سورۂ قٓ میں ارشاد ہوا:

﴿بَلْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَهُمْ فِي أَمْرٍ مَرِيجٍ﴾ (۵۰/ ق:۵)

"بلکہ انہوں نے حق کو جھٹلایا جبکہ وہ ان کے پاس آ گیا تو اب وہ ڈانواں ڈول ہیں۔"

حق کی تکذیب و انکار کا نتیجہ تردد اور بے اطمینانی کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے۔ ایسی حالت میں ان کا ہر قول باطل اور ہر عمل ضائع ہی ہو کر رہے گا۔ یہ ایک فطرتی اصول ہے کہ جو بھی منزل مقصود تک لے جانے والی راہ سے ہٹ گیا اس کو ناکامی ونامرادی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ اسی مفہوم کو ایک مقام پر یوں ادا فرمایا:

﴿فَإِنْ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ﴾ (۲۸/ القصص: ۵۰)

"اے نبی! اگر وہ کافر آپ کی بات نہ مانیں تو آپ جان لیں کہ وہ صرف اپنی خواہش کی پیروی کرتے ہیں۔"

حق سے روگردانی خواہش کی پیروی کا دوسرا نام ہے۔ دوسری جگہ یہی معنی نہایت واضح انداز میں ادا کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿فَذَلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ فَأَنَّى تُصْرَفُونَ﴾ (۱۰/ یونس: ۳۲)

"پس یہی اللہ تمہارا حق رب ہے۔ پھر اس حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا ہے۔ دیکھو تو سہی تم کہاں بھٹکائے جا رہے ہو۔"

﴿إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ﴾ (۸۱/ التکویر:۲۷)

''نہیں ہے وہ مگر ذکر جہانوں کے لیے۔''

قرآن کن کے لیے ذکر ونصیحت ہے۔اس سوال کا جواب قرآن نے متعدد پیرایوں میں دیا ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن تمام انسانوں کے لیے ذکر ہے۔ دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ ﴾ (٤٣/ الزخرف:٤٤)

''بیشک وہ ذکر ہے تمہارے اور تمہاری قوم کے لیے۔''

کہیں قرآن کو مطلق ذکر قرار دیا ہے کہیں فرمایا:

﴿ ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ ﴾ ''برکت والا ذکر۔''

کسی اور جگہ ارشاد ہے:﴿ ذُو الذِّكْرِ ﴾ ''ذکر والا''ان تمام آیات کے ملانے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن ذکر اور صاحب ذکر کس بنا پر ہے؟ یہ قرآن بندوں کے دنیا و آخرت کے مصالح و منافع ذکر کرتا ہے۔ مبدأ و معاد کی حقیقت ان کے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات، افعال اور بندوں پر جو اس کے حقوق واجب ہوتے ہیں ان سب کو بیان کرتا ہے۔خیر و سعادت کی باتیں بتلاتا ہے،تاکہ بندے اس پر عمل کریں۔ اور شر و شقاوت کی راہ ظاہر کرتا ہے، تاکہ ان سے بچیں۔ قرآن نفس انسانی کے حالات، آفات، اور ان تمام فضائل کو بیان کرتا ہے۔ جن سے نفس انسانی درجہ کمال تک پہنچتا ہے۔ بنی نوع انسان کے دشمن اور اس کی چالاکیوں، مکاریوں کو بھی بے نقاب کرتا ہے اور یہ بھی بتلاتا ہے کہ بندے اُسی ایک ذات کے محتاج ہیں۔ اُس سے ایک لمحہ کے لیے بھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ قرآن ان نعمتوں کا ذکر کرتا ہے جو اللہ نے بندوں پر نازل فرمائی ہیں اور ان سے زیادہ بڑی نعمتوں کے حصول کی طرف دعوت دیتا ہے۔ ثواب و عذاب اور خدائی انتقام کو بیان کرتا ہے اور بندوں کو حکم دیتا ہے کہ جو کچھ اس میں ہے اس پر پوری مضبوطی کے ساتھ کار بند ہو جائیں:

﴿ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾

(۲/ البقرۃ: ۶۳)

"لے لو جو ہم نے تم کو دیا ہے قوت کے ساتھ اور جو اس میں ہے
اسے یاد کرو، تاکہ متقی بن جاؤ۔"

جس قرآن کی یہ شان ہے وہ اس بات کے زیادہ لائق ہے کہ پہلے جس پر نازل ہوا ہے اس کے لیے اور پھر اس کی قوم اور پھر سارے جہان کے واسطے ذکر و نصیحت کا سرمایہ بنے۔ متقین کو اس لیے خاص کیا کہ قرآن سے اصل فائدہ اٹھانے والے یہی لوگ ہیں۔ قرآن کو ذوالذکر (ذکر والا) اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ ذکر پر مشتمل ہے، یہ قرآن ذکر والا ہے، اس سے ذکر حاصل ہوتا ہے، اس میں ذکر ہے اور یہ سراپا ذکر ہے۔ جیسا کہ وہ ہدایت ہے اور اس میں شفا ہے۔ وہ رحمت ہے اور اس میں رحمت ہے۔

﴿لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ﴾ (۸۱/ التکویر: ۲۸)

"ان کے لیے جو تم میں سے سیدھا ہونا چاہتا ہے۔"

لمن، للعالمین سے بدل ہے۔ دونوں آیتوں کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن عام طور پر بلحاظ قوت و صلاحیت سب کے لیے ذکر ہے اور باعتبار حصول نفع اہل استقامت اور اصحاب تقویٰ کے واسطے ذکر ہے۔

قدریہ اور جبریہ کا رد

لِمَنْ شَآءَ میں جبریہ کا رد ہے جو بندے کے لیے مشیت وارادہ کو نہیں مانتے بلکہ اُسے مجبور محض سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بندے کے ارادہ اور فعل کے درمیان محض عادت کے طور پر تعلق اور ملاپ ہو جاتا ہے۔ ارادہ و مشیت فعل کے وقوع کے لیے سبب و علت نہیں ہیں۔

﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (۸۱/ التکویر: ۲۹)

"اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔"

اس آیت میں فرقہ قدریہ کا رد ہے جو اس امر کے قائل ہیں کہ بندے کی

مشیت وارادہ مستقل طور پر خود بذاتہٖ وجود فعل کے لیے کافی ہیں۔ اس کے لیے مشیت الٰہیہ کی ضرورت نہیں ہے۔ جب بندہ کبھی کسی کام کو کرنا چاہتا ہے کر ڈالتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا بندے کے فعل سے تعلق ہی ناممکن ہے۔ ان دونوں آیتوں نے جبر و قدر کے قلعوں کو مسمار کر دیا ہے۔

جبریہ کا ایک شبہ

آیت لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ کے متعلق یہ شبہ پیش کرتے ہیں کہ اس آیت سے یہ کہاں معلوم ہوتا ہے کہ بندے کا فعل اس کی مشیت سے واقعہ ہوتا ہے؟ بلکہ صرف یہ بتلایا گیا ہے کہ مشیت کے وقت فعل حاصل ہو جاتا ہے اور اس سے ہم بھی انکار نہیں کرتے۔

جواب شبہ

اگر بندے کی مشیت کا فعل سے اقتران و تعلق محض عادتاً اسی طرح ہے جس طرح کہ دوسرے اغراض فعل سے وابستہ ہوتے ہیں تو پھر مشیت کا خصوصیت کے ساتھ ذکر یہاں بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی شکل اور اس کی دوسری غیر مؤثر اغراض یہی فعل سے اتصال و ملاپ رکھتی ہیں لیکن وہ فعل کے لیے سبب نہیں بنتیں۔ اگر یہی صورت حال مشیت وارادہ کی بھی ہے تو پھر اس آیت میں اس کا ذکر بلافائدہ ہی ہوگا (حالانکہ کلام الٰہی اس نقص سے پاک ہے۔) نتیجہ یہ نکلا کہ بندے کی مشیت کو وقوع فعل میں بہت بڑا دخل ہے۔ محض اتفاقاً و عادتاً ارادہ یا فعل کے درمیان تعلق ماننا قرآن کی روشنی میں درست نہیں ہے۔

قدریہ کی تاویل

قدریہ آیت وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ میں مشیت الٰہی کو امر الٰہی کے معنی میں لیتے ہیں۔ لیکن یہ درست نہیں ہے۔ قرآن میں مشیت بمعنی امر کہیں بھی

مستعمل نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اس سے مراد ہر جگہ مشیت تکوینی ہے۔ مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

① ﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ﴾ (٦/ الأنعام: ١١٢)

''اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ نہ کرتے۔''

② ﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا﴾ (٢/ البقرة: ٢٥٣)

''اور اگر اللہ چاہتا تو وہ نہ لڑتے۔''

③ ﴿وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا﴾ (٣٢/ السجدة: ١٣)

''اگر ہم چاہتے تو ہر نفس کو اس کی ہدایت عطا کر دیتے۔''

④ ﴿اَفَلَمْ يَايْــَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا﴾

 (١٣/ الرعد: ٣١)

''کیا پھر نہیں مایوس ہو گئے وہ لوگ جو ایمان لائے اگر اللہ چاہتا تو سارے لوگوں کو ہدایت دے دیتا۔''

ان آیات میں سے کسی میں بھی مشیت بمعنی امر نہیں مراد لے سکتے۔

دلائل توحید اور دلائل عقل اس بات کو واضح طور پر ثابت کرتے ہیں کہ بندے کی مشیت اس کائنات ومخلوقات کی ایک شاخ ہے جو بلا مشیت الٰہی وجود میں نہیں آسکتی۔ اس لیے جو اس نے چاہا ہو گیا اور جو نہ چاہا نہ ہوا۔

ایک ضروری امر کی تصریح

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا تعلق کبھی اپنے فعل سے ہوتا ہے اور کبھی بندے کے فعل سے۔ دوسرے تعلق کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ بذات خود کسی فعل پر بندے کی اعانت فرمائے، توفیق دے اور اس کے اسباب و ذرائع فراہم کر دے۔ اس مشیت الٰہیہ کی بنا پر بندے کی مشیت اور فعل کا وقوع ضروری و یقینی ہے۔ فعل کے وقوع وظہور کے لیے صرف یہ کافی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت بندے کے ارادہ سے متعلق ہے بلکہ اس کا

تعلق فعلِ عبد کے ساتھ بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے سے کبھی صرف ارادہ چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں بندہ محض فعل کا قصد کرتا ہے لیکن اس کو انجام نہیں دیتا۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی اعانت و توفیق اس کے فعل سے وابستہ نہیں ہوئی ہے۔ اس مضمون کو ان دو آیتوں میں ادا کیا گیا ہے:

﴿ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۝ ﴾

(۸۱/ التکویر:۲۹)

''اور تم بغیر پروردگار عالم کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے۔''

﴿ وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ﴾ (۷۴/ المدثر: ۵۶)

''اور وہ نہیں یاد کریں گے مگر یہ کہ چاہے اللہ۔''

﴿ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ۝ وَمَا تَشَآءُوْنَ ...... الخ ﴾

(۸۱/ التکویر: ۲۸۔۲۹)

یہ دونوں آیتیں حسب ذیل امور کو ثابت کرتی ہیں:

① شریعت ② تقدیر

③ سلسلہ اسباب و مسببات ④ فعلِ عبد اور اللہ کی طرف اس کی نسبت

⑤ عبودیت

پہلی آیت میں عبودیت کے معنی ہیں۔ رضائے الٰہی کے حصول کے لیے اپنی انتہائی کوشش صرف کرنا، مقاصد کے اسباب و ذرائع کے فراہم کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھنا۔ دوسری آیت میں عبودیت کا مطلب ہے۔ اللہ سے اعانت و توفیق چاہنا، اس پر بھروسہ کرنا، اس کی رحمت میں پناہ لینا اور اس بات کا یقین رکھنا کہ بندہ کا ارادہ و فعل اللہ کی مشیت کے بالکل تابع ہے۔ لفظ رب العالمین ان دونوں مطالب کو اپنے اندر پوری طرح سمیٹے ہوئے ہے۔ جس نے دونوں امور میں سے کسی کا انکار کیا اُس نے گویا اللہ کی کمال ربوبیت ہی کو تسلیم نہیں کیا۔ [1]

---

[1] التبیان:۷۲-۸۳۔

تفسیر سورة البروج

﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ﴾ (۸۵/ البروج:۱)

''قسم ہے برجوں والے آسمان کی۔''

اس سورت میں بھی جواب قسم مذکور ہے۔بروج کے بارے میں کئی اقوال ہیں:

1. وہ منازل جن میں سورج چاند اترتے ہیں۔
2. ستارے۔
3. بڑے محل۔

ان سب کو مراد لیا جاسکتا ہے۔ان میں سے ہر ایک اللہ کی قدرت وحدانیت کی بڑی نشانی ہے۔ آسمان کا گیند کی طرح گول ہونا کہ اس کا طول و عرض دریافت نہ ہوسکے، اس کے ہر جانب کا ٹیڑھے پن سے خالی ہونا، تمام اطراف کا ہموار اور یکساں ہونا، پھر اس میں مختلف قسم کی صورتوں، مقداروں والے برجوں کا پایا جانا۔ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس جہان کا وجود بلا خالق کے ہرگز نہیں ہوسکتا اور ایسا خالق مانا ہی نہیں جاسکتا جو قدرت، علم، ارادہ اور حکمت حیات سے خالی ہو اور مخلوق سے الگ کوئی امتیازی نشان نہ رکھتا ہو، اس آیت نے فلاسفہ ملاحدہ کے نظریہ کا تار پود بکھیر دیا۔ جو کہ جہان کے لیے کسی ایسے خالق کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے جو مخلوق سے الگ ممتاز، قادر، فاعل، بااختیار، مدبر اور تمام تفصیلات کا علم رکھتا ہو۔

خلاصہ یہ ہوا کہ بروج سے مراد یا تو آسمان کی منازل ہیں یا گردش کرنے والے ستاروں کی منازل ہیں جس میں وہ موجود ہیں۔ یہ اللہ کی بڑی نشانیوں میں سے ہیں۔ اسی برجوں والے آسمان کی قسم کھائی گئی ہے۔

﴿وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ﴾ (۸۵/ البروج:۲)

''وعدہ دیئے ہوئے دن کی قسم!(یعنی قیامت کا دن)۔''

قرآن میں قیامت ، مقسم علیہ اور مقسم بہ دونوں ہے۔ قرآن نے اس کے وقوع کی خبر دی ہے اور بتلایا ہے تمام انبیائے کرام اس پر متفق تھے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و عزت کے خلاف ہے کہ وہ اپنے بندوں کو بے کار چھوڑ دے۔ اس قسم کے بہت سے دلائل و براہین بیان کیے گئے ہیں۔ جن سے قیامت کا امکان اور وقوع ثابت ہوتا ہے اور اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے برپا کرنے سے عاجز ہے۔ ایمان داروں کے لیے اس کا ثبوت اسی طرح واضح ہے جس طرح نظر آنے والا آسمان، گویا قیامت بھی محسوس اشیاء کی طرح یقینی ہے۔ اسی لیے آسمان کے ساتھ قیامت کو ہی سلسلہ قسم میں بیان کیا ہے۔

﴿وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُودٍ﴾ (۸۵/ البروج:۳)

”حاضر ہونے والے اور حاضر کیے گئے کی قسم۔“

ان دونوں کا عام مطلق معنی لینا زیادہ مناسب ہے۔ یعنی عالم اور معلوم، دیکھنے والا اور دیکھی ہوئی چیز۔ دوسرے معنی جو کچھ بیان کیے گئے ہیں وہ بطور مثال ہیں خصوصیات کا لحاظ نہیں ہے۔

سلسلۂ کلمات قسم میں تعلق

پہلے عالم علوی (بلند جہان) کو بیان فرمایا جو تمام مکانوں سے بڑا اور کشادہ ہے۔ پھر اس دن کی قسم کھائی جو شان و رتبہ کے لحاظ سے تمام دنوں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ ان سے ربانی امرونہی ، ثواب و عذاب اور بادشاہت پوری طرح ظاہر ہوگی، صالحین اور فاسقین کا اجتماع ہوگا، علم و عدل کے مطابق فیصلے ہوں گے۔

تیسرے نمبر پر شاہد و مشہود قسم کی ذکر کی جو کہ پہلی دونوں قسموں سے عام ہے۔ اس قسم کی مناسبت مابعد کی عبارت سے بھی واضح ہے۔ اس کے ساتھ ہی اصحاب الاخدود کا ذکر ہے جو کہ اللہ کے صالحین بندوں کو عذاب دیتے تھے جیسا کہ فرمایا:

﴿وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ﴾ (۸۵/ البروج:۷)

''اور خندق والے اس عذاب پر شاہد تھے جو وہ مومنوں کو پہنچا رہے تھے۔''

یعنی اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے تھے۔ یہ لوگ مشہود ہی ہیں کیونکہ فرشتے اور انبیائے کرام ان پر گواہ ہیں۔ خود ان کے اعضا بھی قیامت کے دن ان کے مظالم پر شہادت دیں گے۔

شاہد کے معنی

واقف، خبرداراور نگران، مشہود کے معنی ہیں وہ شے جس پر اطلاع اور واقفیت حاصل کی جائے۔ پس جس ہستی نے مخلوق کو دو حصوں میں بانٹ دیا یعنی شاہد اور مشہود، اس سے بڑھ کر قادر اور کون ہوسکتا ہے۔جس طرح اس نے بعض چیزیں ایسی بنائیں جو مشاہدہ اور دیکھنے میں آتی ہیں اور بعض اس کے برعکس، فرمایا:

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۝﴾ (۶۹/ الحاقۃ: ۳۸، ۳۹)

''قسم ہے ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو اور قسم ہے ان چیزوں کی جن کو تم نہیں دیکھتے۔''

اور جس طرح کہ اس نے مخلوقات کو زمین و آسمان ، رات، دن اور نر مادہ میں تقسیم کیا ہے، اسی طرح اس نے شاہد و مشہود کی دو قسمیں بنائی ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی کھلی نشانیاں ہیں۔

ایک لطیف نکتہ

یہ تو سب جانتے ہیں کہ مخلوقات میں بعض چیزیں مشہود علیہ ہیں۔ یعنی ان پر دوسری مخلوق اطلاع پاتی ہے، یا نگرانی رکھتی ہے۔ [1] تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مخلوق تو ایک دوسرے کی شاہد، نگران اور محافظ بن سکے اور خالق تعالیٰ شاہد، رقیب اور حفیظ نہ ہوسکے ۔ مذکورہ بالا تفصیل کی بنا پر فرشتے، انبیائے کرام بھی مقسم بہ

[1] کیونکہ اس کے بغیر نظام عالم درست نہیں رہ سکتا۔

ہوگئے۔ کیونکہ وہ بھی بندوں کے بارے میں شہادت دیں گے۔ اس طرح مقسم علیہ اور مقسم بہ دونوں ایک ہوگئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے "الیوم الموعود" کی قسم بیان کی ہے جو کہ مقسم علیہ بھی ہے اور مقسم بہ بھی۔

یوم قیامت بھی مشہود ہے

قرآن میں ہے:

﴿ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ﴾

(۱۱/ ھود:۱۰۳)

"اور وہ دن ہے جس کے لیے لوگ جمع کیے جائیں گے اور وہ دن مشہود ہے۔"

لیکن اس روز اللہ تعالیٰ، فرشتے، انسان وجن اور حیوانات سب شاہد ومشہود ہوں گے، یہ انہی ربانی نشانیوں میں سے ایک ہے۔

قرآن بھی مشہود ہے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا﴾ (۱۷/ الاسراء: ۷۸)

"یعنی صبح کی تلاوت کلام الٰہی بھی مشہود ہے۔"

اس وقت رات و دن کے فرشتے شاہد و حاضر ہوتے ہیں۔ یہ مشہود بھی اس کی بڑی آیات و دلائل میں سے ہے، اسی طرح شاہد بھی اس کی نشانی ہے۔

الحاصل ہر وہ شے جس پر شاہد ومشہود کا اطلاق ہوسکے، یہاں مقسم بہ ہے۔

کتاب الابرار بھی مشہود ہے

صالحین کا اعمال نامہ جو علیین یعنی بلند دفتر میں ہے وہ بھی مشہود ہے، قرآن میں ہے:

﴿يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ (۸۳/ المطففین:۲۱)

"اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے اس کا مشاہدہ کریں گے۔"

پس کتاب مشہود ہوئی اور مقربین شاہد ہوئے۔

جواب قسم کیا ہے؟

بہتر یہ ہے کہ یہاں اس قسم کے سلسلہ کو جواب قسم سے بے نیاز ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ مقصود یہ ہے کہ مقسم بہ پر تنبیہ کی جائے اور بتلایا جائے کہ یہ حق تعالیٰ کی بڑی نشانیاں ہیں۔﴿ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝ ﴾ "قتل کیے گئے خندق والے (جنہوں نے نیک بندوں کو ستایا اور دہکتی آگ میں ڈالا۔) کو جواب قسم قرار دینا غیر مناسب ہے۔

﴿ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝ ﴾ (۸۵/ البروج:۴۔۷)

"دہکتی آگ والی خندق والے قتل کیے گئے۔ جبکہ وہ اس پر بیٹھتے تھے اور وہ جو مومنوں کے ساتھ کر رہے اس پر گواہ تھے۔"

ان آیات میں بتلایا گیا ہے کہ وہ اللہ کے نیک بندوں کو آگ میں اپنی آنکھوں کے سامنے جلا رہے تھے۔ ان کی بے کسی اور تکلیف پر ذرا بھی ان کو رحم نہ آیا اور ان کا جرم ہی کیا تھا، یہی نا کہ وہ عزیز وحمید اللہ پر ایمان لے آئے تھے جس کے لیے زمین و آسمان کی بادشاہت ہے۔

ایمان باللہ کی صفت تو ایسی تھی کہ ان کی عزت و تکریم کی جاتی، ان کے لیے نگاہیں فرش راہ ہوتیں اور دل ان کی محبت سے بھرپور ہوتے، لیکن خندق والے سرکشوں نے بالکل برعکس برتاؤ کیا۔ اللہ کے باغیوں کا اس کے وفاداروں کے ساتھ یہی شیوہ رہا ہے۔ فرمایا:

﴿ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ ﴾ (۵/ المائدۃ: ۵۹)

"کہہ دو اے اہل کتاب! کہ تم محض ہمیں اس بنا پر عیب لگاتے ہو

کہ ہم اللہ پر، جو ہماری طرف اتارا گیا ہے اور جو ہم سے پہلے اتارا گیا ہے اس پر ایمان لے آئے ہیں اور تم میں سے اکثر فاسق ہیں۔"

اس طرح قوم لوط کے سرکشوں نے بھی مومنوں کے بارے میں کہا تھا:

﴿ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴾ (۷/ الاعراف:۸۱)

"نکالو ان کو اپنی بستی سے یہ لوگ تو بڑے پاکباز بنتے ہیں۔"

اسی طرح مشرکین اہل توحید کو، توحید پر اور معطلہ (منکرین صفات الٰہیہ) اتباع سنت، محبت صحابہ اور اثبات صفات ربانی پر اہل سنت کو اور اہل الرائے عمل بالحدیث پر اہل الحدیث کو مجرم قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ کچھ نہ کچھ اصحاب الاخدود سے مشابہت رکھتے ہیں، کوئی کم اور کوئی زیادہ۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ﴾ (۸۵/ البروج:۱۰)

"بے شک جن لوگوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ستایا اور اس پر توبہ نہ کی ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلنے کا عذاب ہے۔"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ توبہ کر لیتے تو اللہ کی مغفرت و معافی کا دامن ان پر وسیع ہو جاتا، اس سے بڑھ کر مہربانی اور سخاوت کیا ہو سکتی ہے کہ وہ تو اللہ کے وفاداروں اور دوستوں کو آگ میں جلائیں اور طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں، اور وہ حلیم کریم اللہ ان کو توبہ کی طرف بلائے، تاکہ وہ دوزخ کی سزا سے بچ جائیں۔ اس آیت میں اس بات کا اعلان کیا جا رہا ہے کہ انسان کتنا ہی بڑا گناہ کیوں نہ کرے اسے مایوس نہ ہونا چاہیے۔ آخر اصحاب الاخدود سے زیادہ سنگین جرم اور کس کا ہو سکتا ہے۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

الْاَنْهٰرُ ۬ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ﴾ (۸۵/ البروج:۱۱)

''بے شک ایمان قبول کرنے والوں اور نیک کام کرنے والوں کے لیے وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، یہی بڑی کامیابی ہے۔''

اس آیت میں صالحین کی جزا وثواب کا ذکر ہے۔

﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ؕ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ۚ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۙ﴾ (۸۵/ البروج: ۱۲۔۱٤)

''بے شک تیرے رب کی گرفت سخت ہے۔ بے شک وہ پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ لوٹائے گا۔ اور بخشش کرنے والا محبت والا ہے۔''

ان آیات میں رب تعالیٰ کی گرفت کی سختی کو بتلایا گیا ہے اس سے وہ عاجز نہیں رہ سکتا ہے۔ کیونکہ وہ یبدئ اور یعید ہے، اور جو ہستی پہلی بار اور دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہو اس سے بڑھ کر گرفت میں سخت اور کون ہوسکتا ہے؟ لیکن ساتھ ہی وہ انتہائی مغفرت ومحبت والا ہے۔ [1]

ودود کے معنی

ودود محبّ اور محبوب دونوں پر بولا جاسکتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کا محبّ بھی ہے اور محبوب بھی۔

پہلا معنی وضعی ہے اور دوسرا لزومی۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ﴾ (۱۱/ ھود:۹۰)

''بے شک میرا رب مہربان محبت والا ہے۔''

رحیم اور غفور کے ساتھ ودود کا تعلق

رحیم وغفور کے ساتھ ودود کا تعلق عجیب حسن ولطافت پیدا کر رہا ہے۔ ایسا

---

[1] توبہ کرنے والوں کے لیے۔

بھی ہوتا ہے کہ انسان کسی دوسرے پر رحم کرتا ہے یا اسے معافی دے دیتا ہے لیکن دل اس کی محبت سے خالی ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی شان ہی دوسری ہے وہ بخشش و معافی کے ساتھ ساتھ توبہ کرنے والے گناہگار سے محبت بھی رکھتا ہے، اسی لیے فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۲۲)

''بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

﴿ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدُ ﴾ (۸۵/ البروج:۱۵) ''عرش والا بزرگ۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے عرش کی نسبت اپنی طرف کی ہے جس طرح کہ عظمت و شرف والی چیزوں کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ اس سے عرش کا شرف و عظمت اور رب تعالیٰ سے انتہائی قرب وخصوصیت معلوم ہوتی ہے ۔ وہ صفات جو ذاتِ الٰہی کے ساتھ قائم ہیں ان کو بھی اسی طرح بیان فرمایا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿ذوالنور ، ذوالجلال، ذوالملك، ذوالعزة﴾

اگر عرش کی حیثیت وہی ہے جو ساتویں آسمان کی ہے، تو پھر ذوالعرش اور ذوالارض میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

مجید کا معنی

مجید اس ذات کی صفت ہوسکتی ہے جو تمام کمالات اور افعال خیر کی جامع ہو۔مخلوق میں بھی مجد رب تعالیٰ کے اوصاف کی بنا پر ہی پیدا ہوتا ہے، لغت عرب میں مجد کے معنی ہیں: "کثرة اوصاف الکمال وکثرة افعال الخیر۔"

حمید و مجید کا تعلق

﴿ رَحْمَتُ اللّٰہِ وَبَرَکٰتُہٗ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ اِنَّہٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ﴾

(۱۱/ ھود:۷۳)

''اللہ کی رحمت اور برکتیں ہوں تم پر اے گھر والو! بے شک وہ حمد ومجد والا ہے۔''

التحیات میں بھی حمید و مجید یکجا پڑھا جاتا ہے، علی الاطلاق حمیدو مجید سوائے اللہ کے اور کسی پر نہیں بولا جاسکتا۔ حمید کے معنی ہیں جو تمام صفات و کمال کا مستحق ہو۔ مجید کے معنی ہیں عظمت ، وسعت، قدرت، غنی اور جلال و اکرام والا۔

بعض قراء توں میں المجید زیر کے ساتھ آیا ہے۔ اس قراء ت کی بنا پر مجید عرش کی صفت ہوئی۔ جب عرش مجد و بزرگی والا ہے تو اس کا خالق بدرجۂ اولیٰ مجد و احترام کے لائق ہوا۔ عرش اپنی وسعت، شان اور رونق و جمال کے لحاظ سے مجید کہلایا جاسکتا ہے، اس کا یہ مجد خالق تعالیٰ ہی سے حاصل کیا ہوا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ ساتویں آسمان والا عرش کریم، عظیم، مجید کیوں نہ ہوگا۔

﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ﴾ (۸۵/ البروج:۱٦)

''کرنے والا ہے جو چاہتا ہے۔''

اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں:

① اللہ تعالیٰ کا فعل اس کے ارادہ و مشیت سے واقع ہوتا ہے۔

② یہ اس کی صفت دائمی اور ابدی ہے اور یہاں اس کا ذکر مدح و ثنا کے مقام پر کیا گیا ہے اور یہ کہ ارادہ و اختیار کے ساتھ افعال کا صدور باری تعالیٰ کا ایسا کمال ہے جو کسی وقت بھی الگ نہیں ہوسکتا۔ فرمایا:

﴿أَفَمَن يَخْلُقُ كَمَن لَّا يَخْلُقُ ۗ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ﴾ (۱٦/ النحل: ۱۷)

''کیا پھر جو شخص پیدا کرتا ہے اس کی طرح ہوسکتا ہے جو پیدا نہیں کرتا؟ پھر تم نصیحت قبول نہیں کرتے۔''

ظاہر بات ہے کہ جو وصف اس کے ذاتی کمالات میں سے ہو وہ قدیم و دائمی ہوگا، حادث نہ ہوگا۔

③ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کر بھی ڈالتا ہے کیوں کہ لفظ ''ما''

آیت میں عام ہے کسی قسم کی تخصیص نہیں۔ یہ گفتگو تو اس ارادہ کے بارے میں ہے جس کا تعلق باری تعالیٰ کے اپنے فضل سے ہے۔ لیکن وہ ارادہ جس کا تعلق بندے کے افعال سے ہے اس کا معاملہ الگ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ فعل عبد کا ارادہ کرے لیکن اس فعل پر بندے کی اعانت کرنا نہ چاہے تو فعل واقع نہ ہوگا اور اگر فعل عبد کا ارادہ کرے اور ساتھ ہی بندے کو فاعل بننے کے مواقع و اسباب بھی فراہم کرنا چاہے تو فعل کا صدور یقینی ہے۔

یہی وہ نکتہ ہے جو قدریہ اور جبریہ سے اوجھل رہ گیا اور وہ ضلالت کی وادیوں میں بھٹک گئے، یہاں دراصل دو ارادے ہیں:

1. باری تعالیٰ فعل عبد کا ارادہ کرے۔
2. بندے کو کسی فعل کا فاعل بنانا چاہے۔

ان دونوں میں باہمی کوئی تلازم نہیں ہے، یعنی پہلے ارادہ کے وجود سے دوسرے کا وجود لازمی نہیں ہے۔ لیکن ہاں دوسرے کا وجود جب ہی ہوسکتا ہے جبکہ پہلا پایا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فعل عبد کا ارادہ کرے لیکن اس کے اسباب نہ پیدا کرے، ایسی صورت میں فعل واقع نہیں ہوسکتا۔

اس مسئلہ کو فہم سے قریب تر کرنے کے لیے اس حدیث پر غور کیجیے:

"اللہ تعالیٰ بندے سے قیامت کے روز فرمائے گا میں نے تجھ سے دنیا میں اس سے ہلکا مطالبہ کیا تھا جبکہ تو اپنے باپ کی پشت میں تھا کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا۔" [1]

یہ شرک نہ کرنا، یعنی توحید، الٰہی ضرور مراد ہے لیکن اس شخص سے اس کا صدور اس لیے نہ ہوا کہ اس کو اللہ کی اعانت اور توفیق حاصل نہ ہوئی تھی۔ (پس خلاصہ یہ ہوا کہ محض فعل عبد کے ارادہ سے فعل کا وقوع نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ اسباب و مواقع کی فراہمی اور اعانت و توفیق الٰہی بھی ضروری ہے۔)

[1] صحیح البخاری ٥/ ٢٣٩٩ (٦١٨٩) الرقاق: باب صفة الجنة والنار؛ صحیح مسلم ٤/ ٢١٦٠ (٢٨٠٥) صفات المنافقین و احکامهم: باب طلب الکافر الفداء بملء الأرض ذهبا۔

④ باری تعالیٰ کا ارادہ اور اس کا فعل دونوں باہمی لازم و ملزوم ہیں۔جس فعل کا ارادہ کرتا ہے اسے کر ہی ڈالتا ہے اور جو فعل کرتا ہے اس کا ارادہ بھی پہلے سے ہوتا ہے،بخلاف اس کے مخلوق کا حال دوسرا ہے۔ انسان کبھی کسی فعل کا ارادہ کرتا ہے لیکن فعل کے انجام دینے سے قاصر رہ جاتا ہے اور کبھی بلا ارادہ ہی کوئی کام کر ڈالتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ فعال لما یرید سوائے اللہ کے اور کوئی دوسرا نہیں ہے۔

⑤ جب افعال بہت سے ہیں تو ارادے بھی متعدد ہوں گے۔ کیونکہ ہر فعل کے لیے الگ ارادہ کی ضرورت ہے، فطرت سلیمہ اس کو چاہتی ہے۔باری تعالیٰ قطعی طور پر صاحب ارادہ ہے اور جو وہ چاہتا ہے اسے کر ڈالتا ہے۔

⑥ جس فعل کے ساتھ اس کے ارادے کا تعلق درست ہے تو اس کے کرنے میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہوسکتی، آسمان دنیا پر اس کا اترنا، قیامت کے دن فیصلے کے لیے تشریف لانا اور بندوں کو اپنے دیدار سے مشرف کرنا وغیرہ،افعال کا جب بھی ارادہ کرے، کوئی شے مانع نہیں ہوسکتی۔ صرف شرط یہ ہے کہ اس قسم کے افعال و صفات صحیح سند سے ثابت ہونے چاہییں اور جب ایسا ہو تو پھر اس پر تصدیق و ایمان واجب ہو جاتا ہے ۔ یہ ارادہ و فعل اس ذات مقدس کے کمالات میں سے ہیں۔ ان کا انکار اصل کمال کے انکار کا ہم معنی ہے۔

سورۃ البروج کی جامعیت

یہ سورۂ باوجود اختصار کے توحید اور اس کے لوازم پر پوری طرح مشتمل ہے۔اس کی صفت عزت، قدرت، قوت اور بے نظیر ہونے کو شامل ہے۔ اس کی صفت حمد بتلاتی ہے کہ وہ تمام صفات کمالیہ سے موصوف ہے اور اس کے خلاف پست اور عیب والی صفات سے اس کی ذات پاک ہے۔ اس سے اس کی محبت والوہیت بھی معلوم ہوتی ہے زمین و آسمان پر اس کی بادشاہت، ذات الٰہی کی تونگری، بے نیازی اور وسعت ملک کو ظاہر کرتی ہے، اس کا ہر شے پر شاہد ہونا

اس بات کا مقتضی ہے کہ اس سے کوئی چیز ظاہری یا باطنی پوشیدہ نہ رہے۔ اس کا وصف شدت بطش (سخت گرفت) چاہتا ہے کہ اس میں کمال عزت اور قدرت پایا جائے۔اس کے سوا کسی کو ابتداءً (پہلی بار پیدا کرنا) اِعادہ (دوسری بار پیدا کرنا) کا اختیار نہ ہو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ربوبیت اور قدرت میں یکتا اور بے نیاز ہے۔ اس کی قدرت کے سامنے کوئی پر بھی نہیں مار سکتا۔ اس کی صفت مغفرت، سخاوت، کرم، احسان، غنااور رحمت کو بتلاتی ہے۔ اس کا وصف ودود ظاہر کرتا ہے کہ وہ محبّ بھی ہے اور محبوب بھی۔ پھر فرمایا کہ وہ ایسے عرش والا ہے جس کے مرتبے کا اندازہ اس کے سوا اور کوئی نہیں کرسکتا اور یہ عرش اسی کے ساتھ خاص ہے، کوئی دوسرا اس پر نہیں بیٹھ سکتا۔ صفت مجد وسعت علم، قدرت اور احسان کو شامل ہے۔ وصف فعال لما یرید بتلاتا ہے کہ وہ حیات علم، قدرت اور ارادہ حکمت سے موصوف ہے، آخر سورت میں جھٹلانے والی قوموں کا تذکرہ فرمایا، تاکہ بندے ان کاموں سے بچیں جن سے گزشتہ قومیں تباہ ہوئیں۔ پھر فرمایا اس مخلوق سے بڑھ کر بدتر مخلوق اور کون سی ہوسکتی ہے جو ایسی ہستی کی نافرمانی کرتی ہے جس کے قبضہ میں اس کا سب کچھ ہے، اسی لیے فرمایا:

﴿بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ۝ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ مُّحِيْطٌ ۝ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝﴾ (۸۵/ البروج:۱۹۔۲۲)

''بلکہ جن لوگوں نے کفر کیا جھٹلانے کے مشغلہ میں لگے ہوئے ہیں اور اللہ ان کو اوپر سے گھیرے ہوئے ہے۔ بلکہ وہ بزرگی والا قرآن ہے، محفوظ لوح میں۔''

خالق تعالیٰ مجید اس کا کلام بھی مجید اور اس کا عرش بھی مجید۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ قرآن کریم و مجید ہے، اس لیے کہ وہ رب تعالیٰ کا کلام ہے۔ کفار کا اسے شعر، سحر اور کہانت قرار دینا قطعاً غلط ہے۔ پہلے یہ بتلایا جاچکا ہے کہ مجد کے معنی کثرت خیر کے ہیں۔ قرآن مجید کی ان گنت خوبیوں اور بھلائیوں کا اندازہ اس

کے بولنے والے کے سوا کون کرسکتا ہے۔

﴿ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴾ اکثر قراءمحفوظ زیر کے ساتھ پڑھتے ہیں یعنی قرآن ایسی جگہ سے نازل ہو رہا ہے جہاں شیاطین کی پہنچ ناممکن ہے۔ شیاطین اس میں کسی قسم کی زیادتی اور کمی نہیں کرسکتے، دوسری آیت میں فرمایا:

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ (۱۵/ الحجر:۹)

”اور بے شک ہم نے ذکر کو اتارا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔“

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ قرآن اور اس کا محل دونوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے۔ اس کے الفاظ کو تبدیلی سے اور معانی کو تحریف سے بچا لیا ہے اور اس کام پر ایسے لوگوں کو مقرر کر دیا جو اس منصب محافظت پر کام کر رہے ہیں۔ [1]

[1] التبیان:۵۶-۶۲۔

تفسیر سورۂ والفجر

﴿ وَالْفَجْرِ ۝ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۝ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ۝ ﴾ (۸۹/ الفجر:۱۔۵)

''قسم ہے صبح کی اور دس راتوں جفت اور طاق کی، اور رات کی جبکہ وہ چھا جائے۔''

یہ سورت بھی اُن سورتوں میں سے ہے۔ جن کا جواب قسم مذکور نہیں ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ ﴿ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝ ﴾ (۸۹/ الفجر:۱٤) جواب قسم ہے، لیکن یہ درست نہیں۔

اولاً: اس بنا پر کہ قسم اور جواب قسم میں کافی فاصلہ ہو جائے گا۔

ثانیاً: ﴿ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝ ﴾ (۸۹/ الفجر:۱٤) کو اس سے قبل ذکر شدہ سرکش قوموں، عاد وثمود کی سزا کی تائید کے لیے بیان کیا گیا ہے۔ پہلے جھٹلانے والوں کی سزا ذکر کی، پھر بطور تاکید وعید فرمایا:

﴿ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝ ﴾ (۸۹/ الفجر:۱٤)

''بیشک تمہارا رب گھات میں ہے۔''

اس کا تعلق قسم سے بالکل نظر نہیں آتا۔ بہترین توجیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن اوقات کی قسم کھائی ہے جن میں باعظمت مقامات پر نہایت اہم اعمال ادا کیے جاتے ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے شعائر (نشانیوں) میں سے ہیں۔ ان شعائر کا تقاضا ہے کہ بندہ اپنے رب کے لیے جھک جائے، حج اور قربانی کی ہر ادا سے بندگی، عاجزی اور اطاعت کے نقشے نظر آتے ہیں۔ یہ صفات ان تمام خصائل وعاوات کی ضد ہیں۔ جو اللہ نے عاد، ثمود اور فرعون کے ذکر میں بیان کی ہیں، یعنی سرکشی، غرور اور ظلم۔

ایامِ عشر کی فضیلت

صحیح بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا:

"عمل صالح جس قدر ذی الحج کے ابتدائی دنوں میں اللہ کو پیارا ہے، اُتنا دوسرے دنوں میں نہیں۔" کسی نے پوچھا کہ جہاد فی سبیل اللہ بھی اُس کے برابر نہیں ہوسکتا؟ آپ نے فرمایا: "ہاں، جہاد بھی اُس کے برابر نہیں ہوسکتا۔ ہاں! مگر وہ شخص جو اپنی جان و مال سب کچھ اللہ کی راہ میں قربان کردے۔" [1]

پس جو زمانہ اس قسم کے افضل اعمال کو شامل ہو وہ اس کا اہل ہے کہ اس کی قسم بیان کی جائے۔

الفجر کی تشریح

الفجر سے مراد عام صبح ہے، یا کوئی خاص۔

پہلی صورت میں یہ نمازِ صبح کا وقت ہے۔ قسم کی ابتدا ایسے وقت کے ساتھ کی گئی ہے جس میں پانچوں نمازوں میں سے پہلی نماز ادا ہوتی ہے۔ جیسا کہ ﴿ وَالَّيْلِ إِذَا يَسْرِ ﴾ نماز عشاء کو شامل ہے۔

دوسری صورت میں فجر سے مراد دسویں ذی الحج، یوم النحر کی صبح ہے اور واللیل سے دسویں شب مراد ہے جو کہ عرفہ کی شام سے شروع ہوتی ہے۔ یہ رات سال کی تمام راتوں سے افضل ہے۔ شیطان جس قدر ذلیل و حقیر اور غضب ناک اس رات میں دیکھا گیا ہے اتنا کبھی نہیں۔

اس طرح یوم النحر بھی تمام دنوں سے فضیلت و برتری میں بڑھا ہوا ہے۔ ابوداؤد کی صحیح الاسناد روایت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یوم النحر مراد ہے [2] یہی یوم الحج الاکبر (بڑے حج کا دن) ہے۔ (جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے۔) [3] یہی

---

[1] سنن ابوداود ۲/ ۸۱۵ (۲٤۳۸) الصوم: باب فی صوم العشر، سنن الترمذی ۳/ ۱۳۰ (۷۵۷) الصوم: باب ماجاء فی العمل فی أیام العشر۔

[2] مسند احمد ٤/ ۳۵۰، موارد الظمآن صفحہ ۲۵۸ حدیث (۱۰٤٤) کتاب الأضاحی۔

[3] سنن الترمذی ۳/ ۲۹۱ (۹۵۷-۹۵۸) الحج: باب ماجاء فی یوم الحج الأکبر۔ شیخ احمد محمد شاکر فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو اصحاب کتب ستہ میں سے صرف امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔

وہ دن ہے جس میں رسول ﷺ کے مؤذن نے اعلان عام کیا تھا کہ اللہ اوراس کارسول مشرکین سے بری اور بے زار ہیں۔اس سال کے بعد کوئی مشرک یا ننگا آدمی بیت اللہ کا طواف نہیں کرسکتا۔ [1] یہ اعلان قرآن کے حکم کے تحت ہوا تھا۔ نویں تاریخ عرفہ مراد لینادرست نہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ سلسلہ قسم مناسک (اعمال) حج اور نمازوں پر مشتمل ہے۔یہ دونوں رکن عبادت،عاجزی اوراللہ تعالیٰ کی عظمت کے اظہار کے لیے مخصوص ہیں۔اس لیے ابراہیم خلیل اللہ نے فرمایا تھا:

﴿ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴾

(٦/ الانعام:١٦٢)

”بیشک میری نماز،قربانی،زندگی اورموت سب کچھ جہانوں کے رب ہی کے لیے ہے۔“

اوراسی لیے رسول اللہ ﷺ کوحکم ہوا:

﴿ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ﴾ (١٠٨/ الکوثر:٢)

”پس نماز پڑھ اپنے رب کے لیے اورقربانی کر۔“

سرکش مشرکین کا حال اس کے برعکس ہے۔اُس کی عبادت میں مخلوق کو شریک ٹھہراتے ہیں اوراس کی بندگی سے غرور اورتکبر کی بنا پر کتراتے ہیں۔اس غرور و سرکشی کانمونہ قوم عادوثمود کی زندگیوں میں ملتاہے۔جن کے حالات اس سورت میں مذکور ہیں۔

﴿ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ﴾ (٨٩/ الفجر:٣) ”قسم ہے جفت اورطاق کی۔“

اللہ کی عظمت والے شعائر(نشانیاں)دو حال سے خالی نہیں،جفت یا طاق۔ حسب ذیل مقامات،زمانے اوراعمال طاق ہیں۔بیت اللہ جمرات،عرفہ،طواف کعبہ، طواف (درمیان صفاومروہ)ان میں کچھ جفت ہیں مثلاً:صفا ومروہ، عرفہ، مزدلفہ

---

[1] تفسیر الطبری، سورۃ التوبۃ ١٤/ ١٢٥ (رقم: ١٦٤٥)

اورطواف کی دو رکعتیں۔ مرکزی حیثیت وتر کو ہی حاصل ہے۔ جیسا کہ حدیث مبارکہ میں ہے:

((اِنَّ اللّٰهَ وِتْرٌ يُحِبُّ الْوِتْرَ)) [1]

''اللہ تعالیٰ وتر (طاق) ہے اوروتر کو پسند کرتا ہے۔''

یہ وتر جفت کو بھی طاق بنادیتا ہے۔جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رات کی نمازیں دودورکعتیں ہیں۔اگر صبح کا اندیشہ ہوتوایک وتر پڑھ لیا کر۔اس طرح پوری نماز وتر کے حکم میں ہوجائے گی۔ [2] اکثر مفسرین نے وتراورشفع کی یہی تفسیر بیان کی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کاقول ہے کہ وتر آدم (یہ ابتدائی حالت ہے۔) حضرت حواء کی پیدائش سے یہ وتر جفت بن گیا۔

دوسرا قول ہے کہ شفع آدم اورحواء،اور وتر اللہ رب العالمین۔

چند اقوال اوربھی ہیں:

① شفع یوم النحر اوروتر تیسرادن۔

② ان دونوں سے مراد نماز ہے، کوئی جفت اورکوئی طاق یہ عمران بن حصین اورقتادہ کاقول ہے۔اپنی تائید میں ایک مرفوع حدیث بھی پیش کرتے ہیں۔

③ شفع تمام مخلوق جیساکہ قرآن میں ہے ﴿وَخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا﴾ (۷۸/ النبا: ۸) اوروتر اللہ تعالیٰ ہے، مجاہد ومسروق کا یہی قول ہے۔

ان کے علاوہ اوربھی اقوال ہیں۔ان سب کامداردوباتوں پر ہے:

① شفع اور وتر مخلوقات ومأمورات ہی کی دوقسمیں ہیں۔

② وتر خالق اورشفع مخلوق ہے۔

دوسری صورت میں یہاں سلسلۂ قسم میں خالق ومخلوق دونوں کویکجا جمع کردیا

---

[1] صحیح مسلم ۴/ ۲۰۶۲(۲۶۷۷) الذکر والدعاء: باب فی اسماء اللہ تعالیٰ؛ مسند احمد ۱/ ۱۴۳۔ [2] صحیح البخاری ۱/ ۳۳۷(۹۴۶) الوتر: باب ماجاء فی الوتر؛ صحیح مسلم ۱/ ۵۱۶ (۷۴۹) صلاۃ المسافرین وقصرھا: باب صلاۃ اللیل مثنی مثنی۔

گیا ہے، اس کی نظیر اور ہم معنی یہ آیات ہیں:

﴿ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ...... وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ﴾ (۹۱/ الشمس:۱۔۲)

﴿ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ﴾ (۸۵/ البروج:۳)

﴿ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴾

(۹۲/ اللیل:۱۔۳)

﴿ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ﴾ (۸۹/ الفجر:٤)

''قسم ہے رات کی جب چھا جائے۔''

قرآن مجید میں رات کی تین حالتوں کو سلسلہ قسم میں پیش کیا گیا ہے:

① رات کا آنا، ﴿والیل اذا عسعس﴾ عسعس کی تفسیر میں دونوں اقوال ملتے ہیں اقبل اور ادبر ''قسم ہے رات کی جبکہ آئے اور جائے۔''

② ﴿ وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ﴾ (۷٤/ المدثر:۳۳) ''قسم ہے رات کی جب پشت پھیرے۔''

③ رات کا پھیلنا اور چھا جانا، اس حالت کو یہاں بیان کیا گیا ہے۔ رات کی تینوں حالتیں اللہ کی بڑی نشانیوں میں سے ہیں۔

''الفجر'' کو معرفہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کو ہر ایک پہچانتا ہے، عوام میں مشہور و معروف ہے۔ بخلاف ''لَيَالٍ عَشْرٍ'' کے اس کو نکرہ لایا گیا۔ ذی الحج کی دس راتوں کی ''الفجر'' کی طرح عام شہرت نہیں ہے۔ نیز ''لیالٍ'' کی تنوین تعظیم کے لیے بھی ہو سکتی ہے، یعنی بڑی عظمت والی راتیں۔ جبکہ یہ سلسلہ قسم ان احکام پر مشتمل ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے تو مقسم علیہ کا پتہ خود بخود چل گیا (اس کو صراحتاً ذکر کرنے کی ضرورت نہیں رہی) اس لیے اس قسم سے عبرت اور سبق لینے کی طرف توجہ دلائی، فرمایا:

﴿ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ﴾ (۸۹/ الفجر:۵)

''بیشک اس میں عقلمند کے لیے قسم ہے۔''

اس مقسم بہ کی عظمت شان نبوت ہی کے ذریعہ معلوم ہو سکتی ہے اور اس

کے لیے ایسی عقل کی ضرورت ہے جو انسان کو غفلت اور خواہش نفسانی کی پیروی سے روک دے اور اتباع رسول پر آمادہ کرے، تاکہ وہ مصائب نازل نہ ہوں جو گزشتہ انبیا کو جھٹلانے کی وجہ سے عاد وثمود جیسی قوموں پر اُترے تھے۔

متواضعین اور متکبرین کا مقابلہ

چونکہ اس سلسلۂ قسم سے عاجزی اور تواضع کرنے والوں کی مدح نکلتی ہے۔اس لیے اس کے بعد سرکش قوموں کا ذکر کیا گیا ہے،تاکہ دونوں طرح کے لوگوں کے اعمال ونتائج سامنے آجائیں۔

﴿فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ﴾ (۸۹/ الفجر:۱۳)

"پھر برسایا ان پر تیرے رب نے عذاب کا کوڑا۔"

عذاب کو نکرہ لانے کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں:

① عذاب پر تنوین تعظیم کے لیے ہے یعنی ہم نے بڑا عذاب نازل کیا۔

② یا یہ تنوین تحقیر کے لیے ہے،یعنی قدرت کے ذراسے کرشمے نے ان کی بستیوں کو تہ وبالا کردیا اوران کی شان وشوکت خاک میں ملادی کہ اب کوئی ان کا نام لیوا تک نظر نہیں آتا۔

﴿فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ۝ وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ﴾

(۸۹/ الفجر:۱۵-۱۶)

"(اب انسان کا حال یہ ہے)جب اُس کا رب اُسے آزماتے ہوئے عزت ونعمت سے نوازتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے رب نے میری عزت کی اورلیکن جب وہ آزماتے ہوئے روزی تنگ کردیتا ہے تو کہہ دیتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کرڈالا۔"

ان آیات میں بتلایا کہ انسان اپنی خوشحالی دیکھ کر خیال کر بیٹھتا ہے کہ وہ اللہ کے نزدیک عزت ومرتبہ والا ہے،اسی طرح انسان اپنی تنگدستی دیکھ کر یہ سمجھتا ہے

کہ اللہ نے اُسے ذلیل کردیا ہے۔حالانکہ یہ دونوں صورتیں محض آزمائش کے لیے ہیں وہ کبھی نعمت سے آزماتا ہے اور کبھی زحمت سے،ان کو عزت و ذلت کا معیار قرار دینا درست نہیں۔یہاں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو ظاہری دولت و حشمت اورقوت وحکومت کے فریب میں آکرسرکشی پرتُل جاتے ہیں۔ان کاانجام وہی ہوگاجوعادوثمود اورفرعون کاہوچکاہے۔ان کے باغات،سلطنت،فوج اورقوت سب برباد ہوئے،ان میں سے کوئی چیزبھی ان کوزوال وفنا سے نہ بچاسکی۔

﴿كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝ وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا ۝ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝﴾

(۸۹/ الفجر:۱۷۔۲۰)

”ہرگزنہیں بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اورنہ مسکین کو کھلانے پر ایک دوسرے کو ابھارتے ہو،تم میراث کا مال ہڑپ کر جاتے ہو اورتمہاری دولت کی محبت بہت بڑھی ہوئی ہے۔“

ان آیات میں انسانی خودغرضی کو بے نقاب کیاہے کہ وہ مال کی محبت اور دولت کی حرص میں ایسا اندھاہوگیاہے کہ اللہ کی کمزورمخلوق یتیم ومسکین کی پروا بھی نہیں کرتا اوران کے حقوق کی پامالی پرذرابھی نہیں شرماتا۔سورت کے خاتمہ پرنفس مطمئنہ کی تعریف فرمائی ہے یعنی ایسا نفس جو اللہ سے ڈرنے والا اوراُس کے حضورمیں جھکنے والا ہے۔ہرقسم کی رحمتیں اورعزتیں اُسی کے لیے ہیں۔اس سے قبل نفس امارہ کوبیان فرمایاہے اوراس کی نافرمانی کے نتائج کوظاہر کیاہے۔وہ کس سخت عذاب میں گرفتار ہوگا اورمضبوط بیڑیوں میں جکڑاجائے گا۔[1]

[1] التبیان:۱۸-۲۲۔

تفسیر سورة البلد

﴿لَآ أُقْسِمُ بِهَٰذَا الْبَلَدِ ①﴾ (۹۰/ البلد:۱)

''میں اس شہر کی قسم کھاتا ہوں۔''

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے جواب قسم بیان کردیا ہے یعنی:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي كَبَدٍ ④﴾ (۹۰/ البلد:٤)

''بیشک ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا۔''

فی کبد کی تفسیر

اس فقرہ کی شرح میں مفسرین سلف کے چند اقوال ہیں:

① قدوقامت کی ہمواری اور موزونیت۔

② اپنے قدموں پر سیدھا کھڑا ہونے والا۔

③ مشقت ومحنت، یہ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر ہے۔ایک روایت کی بنا پر یہی تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے۔

حسن رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مخلوقات میں سے جس قدر مشقت ومحنت انسان کو کرنی پڑتی ہے اتنی کسی اور کو نہیں۔

ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ انسان دنیا کی مصیبتیں اور آخرت کی سختیاں برداشت کرتا ہے۔

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ تم انسان کو ہر وقت دنیا یا آخرت کے معاملہ میں مشقت برداشت اور زور آزمائی کرتے ہوئے دیکھتے ہو۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انسان کا نو ماہ ماں کے پیٹ میں رہنا، ولادت، رضاعت (شیر خواری کا زمانہ) دودھ چھوڑنے کا مرحلہ، دانت نکلنے کا وقت اور زندگی موت کے حوادث یہ سب فی کبد کے تحت ہیں۔[1]

[1] تفسیر الطبری، سورة البلد۔

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ماں مشقت سے حمل کا زمانہ گزارتی ہے اور پھر نہایت دشواری سے وضع حمل کی منزل طے کرتی ہے۔پھر معاشی سلسلہ میں محنت وشدت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

ان اقوال کی بنا پرفی کبد، مکابدۃالأمر سے نکلا ہے۔یعنی کسی کام کی سختی اوردشواری کوبرداشت کرنا۔انسان کی پوری زندگی اسی میں گھری ہوئی ہے۔رات کی ہولناکیوں، سختیوں اورتاریکیوں کوبرداشت کرتا ہے۔

کبد کے معنی میں شدت اورسختی پائی جاتی ہے۔کہا کرتے ہیں تکبّداللبن، جب کہ دودھ گاڑھا ہوجاتا ہے اوراس پرملائی کی موٹی تہ جم جاتی ہے۔جگرکوکبد بھی اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ گاڑھا خون ہوتا ہے۔فی کبد کی تفسیرقدوقامت کی موزونیت سے کرنا بھی اسی بنا پرہے۔یہ حالت بھی قوت وشدت سے ہی پیدا ہوتی ہے۔انسان شروع سے آخرتک شدت وسختی کا نشانہ ہوتا ہے۔ماں کے پیٹ میں اس پر تین پردے ہوتے ہیں:(۱)رحم مادر (۲) جھلی(۳) بالائی(غلاف)بلوغت کے بعداس پرفرائض کی ادائیگی اورکسب معاش کی ذمہ داری آپڑتی ہے۔پھرموت کی شدت اورجان کنی کی سختی سے سامنا ہوتا ہے۔اس کے بعدبرزخ اورقیامت کی دہشت ناکیاں ہیں۔ان دونوں منزلوں کو طے کرلینے کے بعدآگ کے شعلے ہیں اورقسم قسم کے شدید عذاب،اگرراحت کہیں مل سکتی ہے تووہ صرف جنت میں۔

فی کبد سے یہی مراد لیا گیا ہے کہ ہم نے انسان کی ساخت نہایت مضبوط اورقوی بنائی ہے۔جیسا کہ لبید کا قول ہے:

عین ھلا بکیت اربد، اِذ قمنا وقام الخصوم فی کبد

''اے آنکھ تو اربد پر کیوں نہ روئی جبکہ ہم کھڑے ہوئے اور دشمن کھڑا ہوا قوت وشدت کے ساتھ۔''

اس معنی کی بنا پرآیت کا مضمون:

﴿ نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ ۚ ﴾ (۷٦/ الانسان:۲۸)

''ہم نے ان کو پیدا کیا اوران کی بناوٹ کو مضبوط بنایا۔''

کے ہم معنی ہوگا۔ ﴿شَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ﴾ کی شرح میں چند اقوال ہیں:

① ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے اَسْرَ یعنی پیدائش۔

② ابو عبیدہ کہتے ہیں اَسْرَ، پیدائش کی مضبوطی۔ کہا کرتے ہیں: فرس شدید الأسر، یعنی قوی تنومند گھوڑا۔ ہر وہ چیز جس کو آپ کیل وغیرہ سے پائیدار بنائیں وہ مأسور ہے۔

③ مبرد کے نزدیک ''اَسْرَ'' سے تمام قوائے انسانی مراد ہیں۔

④ لیث کے خیال میں رگ، پٹھوں اور جوڑوں کی قوت مراد ہے، یہی رائے حسن کی ہے۔

سلسلۂ قسم کی تشریح

اس سورت میں انسانی حالت کی ہر قسم کا سلسلہ لایا گیا ہے۔ البلد سے مراد مکہ معظّمہ ہے جو کہ تمام بستیوں کی اصل اور جڑ ہے۔

﴿وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ﴾ (۹۰/ البلد:۳)

''اور قسم ہے انسانی باپ اور اولاد کی۔''

اس سے آدم علیہ السلام اور اس کی اولاد کی طرف اشارہ ہے، جمہور مفسرین کی یہی رائے ہے۔ ان دونوں قسموں میں خاص تناسب اور تعلق ہے۔ مکہ تمام آبادیوں کی اصل ہے اور آدم علیہ السلام تمام انسانوں کی بنیاد ہیں۔

﴿وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ﴾ (۹۰/ البلد:۲)

''اور آپ اس شہر میں مقیم ہیں۔''

اس کی تفسیر میں تین قول ہیں:

① حلّ، احلال سے ہے جو کہ احرام کی ضد ہے یعنی آپ مکہ میں بغیر احرام کے مقیم ہیں۔ حج وعمرہ کرنے والے کی طرح آپ نے احرام نہیں باندھا ہوا ہے۔ مُحرم کو جو امن کی نعمت حاصل ہوتی ہے وہ اس کے فعل احرام کی بنا پر ملتی ہے، اس

سے مکہ کی فضیلت نہیں نکلتی۔ اس لیے فرمایا: ''نبی ﷺ بغیر احرام کے بھی امن میں ہیں۔'' اس سے مکان مقدس کی بڑی فضیلت نکلتی ہے ساتھ ہی اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ حلال حالت میں مکہ میں قیام فرما ہوتے ہیں۔ اس صورت میں مکہ کی یہ اہمیت ہے کہ اس کی قسم کھائی جاتی ہے تو اگر احرام کی حالت میں ہوں تب تو بدرجہ اولیٰ یہ مکہ لائق تعظیم ہے اور اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اسے گہوارہ امن قرار دیا جائے۔

② حلّ کے دوسرے معنی مقیم کے ہوسکتے ہیں، اس صورت میں اس کا ماخذ حلول ہوگا جس کے معنی ہیں کسی مقام میں اُترنا یا داخل ہونا۔ یعنی مکہ کی قسم ہے بحالیکہ وہ اشرف المخلوقات اور سید الانبیاء پر مشتمل ہے۔ اس حالت میں مکہ کا درجہ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ خود یہ بستی تمام بستیوں سے بہتر ہے اور اس میں رہائش کرنے والی ہستی تمام کائنات سے افضل تر۔

بیت اللہ (کعبہ) تمام انسانوں کے لیے مرکز ہدایت ہے اور اس کا نبی ﷺ تمام انسانوں کا راہنما اور امام ہے۔ اس نعمت سے بڑھ کر اور کون سی نعمت ہوسکتی ہے اور مخلوق پر اس سے زیادہ بڑا احسان اور کیا ہوسکتا ہے۔ جو شخص بھی اللہ کے گھر اور اس کے نبی ﷺ کی سیرت وحالت پر غور کرے گا۔ اس کے سامنے توحید وربوبیت کے روشن دلائل بے نقاب ہوجائیں گے۔

③ "حلّ" کے معنی ہیں کہ تم حلال الدم ہو، یعنی اس شہر کی قسم بحالیکہ اس میں تمہارے قتل کی سازشیں ہورہی ہیں۔ تمہیں جلاوطنی کی دھمکیاں دی جارہی ہیں اور لوگ تمہارے درپے آزار ہورہے ہیں۔ حالانکہ اسی شہر میں پرندوں کو امن حاصل ہے، قاتل خونی کو پناہ مل جاتی ہے، جانوروں کے شکار سے لوگ باز رہتے ہیں اور درختوں کے کاٹنے سے پرہیز کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر امن وراحت نہیں ہے تو صرف اس کے لیے نہیں ہے جو لوگوں کو حق کی دعوت دے رہا ہے۔ یہ شرجیل بن سعد کا قول ہے۔

بہر حال ان تینوں معانی میں سے جو معنی بھی لیا جائے ﴿ وَأَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ ﴾ (۹۰/ البلد:۲) کو جملہ معترضہ ماننا پڑتا ہے۔ اس کا یہاں ذکر نہایت ہی حسن ولطافت پیدا کر رہا ہے اور اس قسم سے بیت اللہ اور رسول اللہ ﷺ دونوں کی شان وعظمت ظاہر ہو رہی ہے۔

﴿ أَيَحْسَبُ أَنْ لَنْ يَقْدِرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ ﴾ (۹۰/ البلد:۵)

''کیا وہ گمان کرتا ہے کہ اس پر کوئی قادر ہی نہ ہوگا۔''

ایسا خیال کرنا درست نہیں، جس ربّ نے شدت وقوت کے ساتھ انسان کو پیدا کیا کہ وہ ہر قسم کی سختیاں برداشت کر لیتا ہے۔ کیا وہ اس پر قادر نہیں ہو سکتا؟ اگر خالق ہی کو مخلوق پر قدرت حاصل نہیں تو کسی دوسرے کو پھر کیا حاصل ہو سکتی ہے جو کہ خود ہی محتاج وبے بس ہے۔ یہ ایک مستقل دلیل ہے اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اعمال کا بدلہ ضرور ملے گا۔ جزا کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں، علم اور قدرت۔ قدرت کا بیان اس آیت میں ہے اور علم کا ذکر ﴿ أَيَحْسَبُ أَنْ لَمْ يَرَهُ أَحَدٌ ﴾ (۹۰/ البلد:۷) ''کیا انسان گمان کرتا ہے کہ اُسے کسی نے نہیں دیکھا؟'' میں ہے۔ (اللہ تعالیٰ کے پاس اس کی صفت علم کی بنا پر ہر ایک کی نیکی، بدی کا ریکارڈ موجود ہے۔) وہ اپنی صفتِ قدرت کی وجہ سے ہر ایک کو جزا وسزا دے گا۔ اس کے خلاف گمان کرنا عقل کے منافی ہے۔

﴿ يَقُولُ أَهْلَكْتُ مَالًا لُبَدًا ﴾ (۹۰/ البلد:۶)

''کہتا ہے کہ میں نے بہت سا مال لٹایا۔''

''لبد'' سے مراد وہ مال ہے جو زیادتی کی وجہ سے تہ بتہ ہو جائے۔ انسان غیر شرعی راہ میں اپنا مال خرچ کر کے فخر کرتا ہے۔ اگر بجائے اس کے یہی مال اللہ کی خوشنودی کے لیے جائز کاموں میں صرف ہوتا تو اللہ کے تقرب اور حصول ثواب کا ذریعہ بن جاتا اور تباہی وبربادی سے بچ جاتا۔ یہ بات اللہ کو ناپسند ہے کہ انسان اللہ کا دیا ہوا مال شہوت پرستیوں اور ہوس رانیوں میں خرچ کرے۔ اسی حرکت پر ان

الفاظ میں تنبیہ فرمائی ہے:

﴿ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗۤ اَحَدٌ ؕ﴾ (۹۰/ البلد:۷)

''کیا (یوں) سمجھتا ہے کہ کسی نے اسے دیکھا (ہی) نہیں؟''

یہاں پر ماضی کا صیغہ لایا گیا ہے یعنی لم یرہ۔ کیونکہ اس کا ذکر اَهْلَكْتُ کے مقابلہ میں ہوا ہے جو کہ گزشتہ زمانہ میں مال کے برباد کرنے کو بتلاتا ہے۔

﴿ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِۙ۝ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِۙ۝﴾ (۹۰/ البلد:۸۔۹)

''کیا ہم نے اس کے لیے دو آنکھیں، ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے؟''

یہاں سے دوسری دلیل شروع ہوتی ہے۔ جو ہستی دوسروں کو دیکھنے کے لیے آنکھ، بولنے کے لیے زبان اور ہونٹ عطا کرتی ہے۔ کیا وہ خود دیکھنے، حکم دینے سے اور منع کرنے سے عاجز ہوگی؟ (کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے؟) حقیقت یہ ہے کہ مخلوق اپنا ہر کمال اپنے خالق ہی سے حاصل کرتی ہے۔

﴿ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِۚ۝﴾ (۹۰/ البلد:۱۰)

''اور بتلائے اس کو دو راستے۔''

جو ذات دوسروں کو خیر و شر کا عالم بناتی ہے کیا وہ خود بے علم ہوسکتی ہے؟ جو انسانوں کو ہدایت وضلالت کی راہ سے آگاہ کرے کیا وہ ان کو اس طرح بے کار، مہمل چھوڑ سکتی ہے کہ ان کو اس بات کی بھی خبر نہ ہو کہ دنیا و آخرت میں کون سی چیز ان کے لیے مفید ہے اور کون سی نقصان پہنچانے والی۔ یہ نبوت ورسالت کا سلسلہ اسی لیے مقرر کیا گیا ہے کہ انسان خیر و شر کو پہچان کر ہدایت کی راہ لے اور کمال کو پہنچ جائے۔

اس دلیل وتفصیل سے خالق کا وجود اس کی کامل صفات اور اس کے رسولوں اور وعید کی سچائی ثابت ہوگئی۔ یہی امور ایمان کی بنیادیں ہیں جن کو لے کر تمام انبیائے کرام دنیا میں تشریف لائے تھے۔ انسان اگر اپنی حالت، سلسلہ پیدائش

اور بدن کی ساخت پر غور کرے تو مذکورہ بالا باتوں کے ماننے سے انکار نہیں کر سکتا۔ خالق کے وجود اور اس کی صفات کا اقرار تو انسان کی فطرت میں پیوست ہے۔ انبیائے کرام اسی لیے آتے ہیں کہ فطرت و عقل کے اس تقاضے کی طرف یاد دہانی کرتے ہوئے غفلت و نفسانیت کے پردے اُٹھائیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی حجت فطرت و رسالت دونوں طریقوں سے بندوں پر پوری ہو جاتی ہے۔

﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ﴾ (۹۰/ البلد:۱۱)

''پھر وہ نہیں داخل ہوا گھاٹی میں۔''

یعنی فطرت ورسالت کے ذریعے حجت تمام ہو جانے کے باوجود پھر بھی انسان گھاٹی میں داخل نہ ہوا۔ یہ گھاٹی بندے اور اس کے رب کے درمیان ہے اس کو طے کیے بغیر اللہ تک پہنچنا ناممکن ہے۔ اس گھاٹی کو پار کرنے کے لیے چند باتوں کی ضرورت ہے:

① اللہ کی مخلوق کے ساتھ احسان وسلوک سے پیش آنا۔ مثلاً غلام کو آزاد کرنا، تاکہ اللہ تعالیٰ اس کو نفس کی اور دشمن کو غلامی سے نجات دے اور یتیم و مسکین کو قحط کے زمانہ میں کھانا کھلانا۔

① اللہ تعالیٰ پر کمال اخلاص کے ساتھ ایمان لانا۔ یہ اللہ کا ایسا حق ہے جس سے بندہ کسی حالت میں بھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ ایمان کے معنی ہیں، اللہ کی کتاب کی تصدیق، اس کے احکام کی اطاعت اور ہر معاملہ میں اُس کی خوشنودی چاہنا۔

③ دوسروں کو نیکی اور نرمی کی تلقین کرنا اور دوسروں کی نصیحت کو خندہ پیشانی سے قبول کرنا۔ اس طرح انسان اپنی ذات کے اعتبار سے بھی رحیم وصابر ہوتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی صبر ورحمت کے معاملہ میں مددگار بن جاتا ہے۔ لیکن انسان کا یہ حال ہے کہ وہ گھاٹی کے پار کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا اور اپنے رب سے کٹ کر اُس کی رحمت سے دُور رہتے ہوئے ہلاک ہو جاتا ہے۔

انسانوں کی دو قسمیں

① جنہوں نے گھاٹی کو پار کر کے نجات حاصل کی۔

② جو گھاٹی کے اس طرف ہی رہ گئے اور اپنے آپ کو ہلاکت وتباہی کے غار میں گرا دیا۔

اس گھاٹی کو وہی لوگ پار کر سکتے ہیں جو (گناہوں سے) ہلکے ہوں۔کیونکہ یہ گھاٹی نہایت مشقت اور محنت چاہتی ہے۔اس گھاٹی کو پار کرنے والے ہی اصحاب المیمنة (دائیں والے) کہلاتے ہیں اور جنہوں نے کتاب الٰہی کی تصدیق نہیں کی اور اس کے احکام کو تسلیم نہیں کیا یہی لوگ أصحاب المشئمة ہیں،جن پر چاروں طرف سے آگ بند کر دی جائے گی کہ وہ نکل نہ سکیں گے۔ جس طرح دنیا میں گندے عقائد اور برے اعمال نے اُن لوگوں کو گھیرے میں لے رکھا تھا کہ پاک فضا اُن کو میسر نہ ہوتی تھی۔بالکل اُسی طرح جہنم میں آگ اُن پر چھا جائے گی کہ اُن کے دلوں کا کوئی گوشہ بھی محفوظ نہ رہ سکے گا اور نہ وہ ایک لمحہ کے لیے نجات پا سکیں گے۔

اسرار سورت

اس سورت میں غور وتدبر کرنے سے بہت لطائف ونکات معلوم ہوتے ہیں:

① یہ سورت باوجود اختصار کے علم وایمان کے مطالبہ عالیہ پر مشتمل ہے۔

② قرآن کا یہ عام انداز بیان ہے کہ وہ ڈرانے اور دھمکانے کے لیے اللہکی صفات علم وقدرت کو بیان کرتا ہے۔کیونکہ جزا کا دارومدار ان دونوں پر ہی ہے۔ چند نظائر ملاحظہ ہوں:

① ﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰٓ أَن يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّن فَوْقِكُمْ﴾

(٦/ الانعام:٦٥)

”وہ قادر ہے کہ تم پر اوپر سے عذاب نازل کرے۔“

② ﴿أَرَءَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ ۝ عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰٓ ۝ ...... أَلَمْ يَعْلَم بِأَنَّ اللَّهَ يَرَىٰ ۝﴾

(٩٦/ العلق:٩۔١٤)

''کیا تونے اس شخص کو دیکھا جو ایک بندہ کو روکتا ہے جبکہ وہ نماز پڑھتا ہے..... کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے؟''

③ ﴿ وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ ﴾

(۹/ التوبة:۱۰۵)

''اور کہہ دیجیے! عمل کرو۔عنقریب اللہ تعالیٰ تمہارے عمل کو دیکھیں گے اور اس کے رسول اور مومن۔''

④ ﴿ أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ ۚ بَلَىٰ وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ ﴾ (۴۳/ الزخرف:۸۰)

''کیا وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم اُن کے راز و نیاز اور سرگوشی کو نہیں سنتے؟ کیوں نہیں! ہمارے قاصد (فرشتے) اُن کے پاس لکھتے ہیں۔''

اس قسم کی مثالیں قرآن میں بہت سی مل سکتی ہیں۔ان آیات میں قدرت اور علم کے بارے میں صرف خبر دینا مقصود نہیں۔بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی بتلانا مطلوب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان صفات کی بنا پر منصفانہ جزا دے گا جو ہر قسم کے شائبہ ظلم سے پاک ہوگی۔وہ قادر ہے اس لیے جزا دینا اُس کے لیے ممکن ہے اور عالم ہے اس لیے یہ جزا دائرہ عدل سے باہر نہیں ہوسکتی۔عدم قدرت کی صورت میں جزا ممکن نہیں اور بے علمی کی حالت میں انصاف کا دامن چھوٹنا یقینی ہے۔ظاہر بات ہے کہ جو عالم نہیں وہ تمام اعمال کی تفصیل اور جزا کی مناسب مقدار کو کیسے جان سکتا ہے۔ایسی صورت میں اُس سے عدل کا صدور ناممکن ہے۔

رب تعالیٰ علم اور کمال قدرت کے ساتھ موصوف ہے۔وہ جب چاہے اور جس طرح چاہے سزا دے سکتا ہے اسی کے ارادہ ومشیت پر سب کچھ موقوف ہے۔اس لیے ہر عاقل پر فرض ہے کہ وہ اخلاص واحسان کے ذریعہ نجات کی راہ تلاش کرے۔یہ راہ سخت دشوار گزار گھاٹی میں سے ہوکر گزرتی ہے۔تاوقتیکہ کامل توبہ اور مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کی عادت نہ ڈال لی جائے، اس گھاٹی سے پار

ہونا دشوار ہے۔

﴿ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝﴾ (۹۰/ البلد: ۱۱۔۱۲)

''پھر نہیں داخل ہوا گھاٹی میں اور تمہیں کیا خبر ہے کیا ہے عقبہ۔''

"وماأدراك" وہاں لایا جاتا ہے جہاں کسی شے کی اہمیت اور عظمت دکھلانا مقصود ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ۝﴾ (۱۰۱/ القارعة: ۱۰)

''اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ جہنم کیا ہے؟''

﴿ اَلْحَآقَّةُ ۝ مَا الْحَآقَّةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ۝﴾ (۶۹/ الحاقة: ۱۔۳)

''ثابت ہونے والی، ثابت ہونے والی کیا ہے؟ اور تجھے کیا معلوم کہ وہ ثابت شدہ کیا ہے؟''

﴿ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝﴾ (۸۲/ الانفطار: ۱۸)

''اور تمہیں کیا معلوم کہ فیصلہ کا دن کیا ہے؟''

"وماادراك" یہ جملہ معترضہ ہے جو مُفسَّر (جس کی تفسیر بیان کی جائے۔) "اقتحم العقبة" اور مفسِر "فك رقبة" کے درمیان واقع ہے۔ یہ "فك رقبة" محض "عقبة" کی تفسیر نہیں ہے بلکہ "اِقتحام فی العقبة" (گھاٹی میں داخل ہونے) کی تفسیر ہے۔ جیسا کہ ﴿ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ (۹۰/ البلد: ۱۷) سے ظاہر ہوتا ہے۔ عقبہ تو محض گھاٹی کا نام ہے جس میں داخل ہو کر جنت تک پہنچا جا سکتا ہے۔

اس توجیہ کی بنا پر ﴿ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝﴾ (۹۰/ البلد: ۱۲) کے معنی ہوئے "وماادراك مااقتحم العقبة" تمہیں معلوم ہے کیا ہے گھاٹی میں داخل ہونا؟ بعض قراء توں میں فك رقبة بصورت فعل ماضی آیا ہے۔ اس صورت میں تفسیر اور مفسر میں ظاہراً بھی مطابقت معلوم ہوتی ہے (بعض غیر ضروری مباحث کو حذف کر دیا گیا ہے۔....مترجم)

"العقبة" کہاں ہے؟ اب اس میں اختلاف ہے کہ "عقبة" دنیا میں ہے

یا آخرت میں۔ اس سلسلہ میں چند اقوال نقل کیے جاتے ہیں:

① حسن رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ عقبۃ کو اللہ تعالیٰ نے بطور مثال بیان فرمایا ہے۔اس سے انسان کا اپنے نفس، خواہش، دشمن اور شیطان سے مقابلہ وجہاد کرنا مراد ہے اور یہ ایک سخت گھاٹی ہے۔

② مقاتل رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مثال کے ذریعہ سمجھایا ہے کہ جو شخص غلام آزاد کرتا ہے اور یتیم ومسکین کو کھانا کھلاتا ہے وہ اپنے نفس وشیطان سے زور آزمائی کرتا ہے،یہ زور آزمائی اور مقابلہ دشوار گھاٹی پر چڑھائی سے کم نہیں۔

③ واقعتًا ایک "عقبة" ہے جس پر لوگ چڑھیں گے۔یہ "عقبة" جہنم میں ہے یا دوزخ اور جنت کے درمیان، یا دوزخ کے راستہ میں ہے۔جس کو یہ مشقت طے کرکے جہنمی جہنم میں داخل ہوں گے۔عطا ، مجاہد، کلبی رحمہم اللہ کی رائے یہی ہے۔عقل ونقل اور لغت کے لحاظ سے یہ قول درست ہے۔

قتادہ کا قول ہے کہ یہ "عقبة" نہایت دشوار گزار ہے اس کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ طے کرو۔ایک مشہور روایت میں ہے کہ تمہارے سامنے ایک سخت "عقبة" ہے جس کو وہی لوگ پار کرسکتے ہیں جو گناہوں سے ہلکے پھلکے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے ایمان واطاعت کو "عقبة" فرمایا ہے۔

سلف صالحین کی وصیتوں میں "اقتحام عقبة" کا ذکر بکثرت موجود ہے۔بعض صحابہ موت کے وقت یہ کہتے ہوئے رو پڑے کہ میں کیوں نہ روؤں حالانکہ میرے سامنے سخت مشقت والی گھاٹی ہے۔اُسے پار کرکے یا تو جنت کا راستہ ملے گا یا جہنم کا۔

"عقبة" کی یہ تفسیر اصل حقیقت سے زیادہ قریب اور اقوال سلف کے مطابق ہے اور قرآن کے اندازِ بیان سے بھی یہی پتہ چلتا ہے۔"وما ادراك" کا استعمال اشیائے غائبہ (بن دیکھی باتوں) میں کیا گیا ہے۔ [1]

---

[1] التبیان:۲۲-۲۸۔

تفسیر سورۃ والشمس

﴿ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۝ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۝ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۝ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ۝ ﴾ (۹۱/ الشمس: ۱۔۴)

"قسم ہے سورج کی اور اس کی دھوپ کی، قسم ہے چاند کی جب اس کے پیچھے آئے، قسم ہے دن کی جب سورج کو نمایاں کرے، قسم ہے رات کی جب اسے ڈھانپ لے۔"

قرآن کریم میں مختلف چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے کہیں پر جواب قسم مذکور ہے اور کہیں محذوف، زجاج رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اس سورت میں جواب قسم ﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ ﴾ (۹۱/ الشمس:۹) ہے۔ دو قسم کے سلسلہ میں کلام طویل ہوگیا تھا، اس لیے لام قسم محذوف کردیا گیا۔ آسمان اور اس کے بنانے والے، زمین اور اس کے بچھانے والے، نفس اور اس کے درست کرنے والے کی قسم کھائی گئی ہے یعنی خالق کی بھی اور مخلوق کی بھی۔ بعض مفسرین کے نزدیک ما مصدریہ ہے۔ اس صورت میں مخلوقات اور نفسِ فعل کی قسم کا بیان ہوگا۔

یہ دونوں خالق کے وجود، کمالِ علم، قدرت، حکمت اور وحدت پر دلالت کر رہے ہیں۔

وجودِ خالق پر استدلال

چاند، سورج کی حرکت اور شب و روز کی گردش بتلا رہی ہے کہ یہ سب انقلابات بغیر خالق اور فاعل کے ناممکن ہیں۔ جب خالق اور مخلوق کی قسم سے خالق وفاعل کا علم ہوگیا تو اب مستقل طور پر خالق کی قسم کھانے کی ضرورت نہ رہی۔

علما کی ایک جماعت نے مخلوقات کے وجود سے خالق کے وجود پر استدلال کیا ہے۔ استدلال کا یہ طریقہ درست ہے۔ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر اسی طریقہ کو بیان کیا ہے۔

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۹۰)

''بلاشبہ زمین وآسمان کی پیدائش میں عقل مندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

بہت سے لوگ آسمان، زمین اورنفس کے قدیم ہونے کے قائل ہیں اس لیے ساتھ ہی ساتھ اُن کے خالق وبانی کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔

فائدہ: یہ اس صورت میں جبکہ ﴿وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا﴾ (۹۱/ الشمس:۵) میں ما کوموصولہ قرار دیا جائے اس صورت میں ترجمہ یوں ہوگا:

''قسم ہے آسمان کی اورجس نے اسے بنایا۔''

اگر ما مصدریہ مانا جائے تو اس حالت میں معنی یہ ہوں گے:

''قسم ہے آسمان کی اوراس کی بناوٹ کی۔''

محتاج، قدیم نہیں ہوسکتا

ظاہر ہے کہ جو اپنے وجود میں خالق کا محتاج ہو وہ قدیم کیسے ہوسکتا ہے۔ یہاں یہ نکتہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ آسمان کے لیے تسویہ (موزوں طور پر بنانا) ذکر کیے گئے ہیں۔ بتلانا یہ مقصود ہے کہ حق تعالیٰ اپنی مخلوقات پر کس قدر مہربان ہے۔ ہر چیز کی پیدائش اور بناوٹ میں انسانوں کا فائدہ مدنظر ہے۔

آسمان کے لیے لفظ بناء کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس عالم کے لیے بلند قبہ کی چھت کی طرح ہے۔ "طحوالأرض" کے معنی زمین کے پھیلانے اور ہموار کرنے کے ہیں۔

زمین کا آباد حصہ

زمین کو اس صورت میں اس لیے پیدا کیا گیا کہ انسان وحیوان سب اس پر قرار پاسکیں اور عمارتیں، باغات اور کشتیاں وجود میں آسکیں۔ قدرت ربانی نے زمین کے ایک حصہ کو پانی سے الگ کردیا، تاکہ مخلوق آباد ہوسکے اس حقیقت کو

فلاسفر اور علمائے طبیعت دیکھ کر حیران وششدر ہیں۔طبیعت کا اقتضا تو یہ تھا کہ پانی تمام زمین پر پھیل جاتا لیکن خلاف طبیعت زمین کا ایک حصہ خشک اور باقی تین حصے تہ آب ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب زمین کے تمام حصے برابر ہیں تو بعض کا زیر آب رہنا اور بعض کا خشک رہنا کس بنا پر ہے۔

اس کے جواب میں علمائے طبیعت (فلاسفر) سوائے اس کے اور کچھ نہ کہہ سکے کہ خالق اور صانع کی مشیت نے ایسا ہی چاہا۔یہ جواب بتلاتا ہے کہ خالق مختار باارادہ ہستی ہے نہ کہ غیر مختار اور مجبور جیسا کہ ان کا مسلک ہے۔

خالق کائنات مختار کل ہے

جب یہ مان لیا گیا کہ حق تعالیٰ کی عنایت وتوجہ سے زمین کا ایک حصہ آبادی کے لیے مقرر ہوا تو ضروری ہے کہ اس کے لیے صفات کمال اور صفات جلال کا اقرار کیا جائے اور یہ بھی مانا جائے کہ وہ اپنے کام میں مختار ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے اور اس کو روکنے والا کوئی نہیں ہے۔

جس طرح بعض کا خیال ہے کہ نفس قدیم ہے اسی طرح بعض کا یہ گمان ہے کہ نفس خود نیکی اور بدی کا موجد ہے۔اس کو یوں رد کیا:

﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا﴾ (۹۱/ الشمس:۸)

"یعنی حق تعالیٰ نے نفس میں نیکی اور بدی کو ڈالا ہے۔"

ظاہر ہوا کہ ہمارا اور ہمارے اعمال وافعال کا خالق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔نفس کے لیے "تسویہ" بیان کیا گیا ہے، جیسا کہ دوسری آیات میں ہے:

﴿مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ۝ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ۝﴾

(۸۲/ الانفطار:۶، ۷)

"یعنی اے انسان! تجھے اپنے کریم پروردگار سے کس چیز نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔جس نے تیرے اعضا کو درست کیا اور تجھ کو

مناسب اعتدال کے ساتھ بنایا۔“

﴿ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي ﴾ (۱۵/ الحجر: ۲۹)

”جب میں نے اس کو درست کرلیا تو اس میں میں نے اپنی روح پھونک دی۔“

نفس سے مراد

پس معلوم ہوا کہ نفس کا اطلاق روح اور بدن دونوں پر ہوتا ہے اس قسم کی بہت سی آیات ہیں:

① ﴿ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۸۹)

”اس نے تم کو نفس واحد سے پیدا کیا۔“

② ﴿ فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ ﴾ (۲٤/ النور:٦١)

”اپنے نفسوں کو سلام کرو۔“

③ ﴿ وَلَا تَقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ ﴾ (٤/ النساء:۲۹)

”اپنے نفسوں کو مت قتل کرو۔“

④ ﴿ لَّوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا ﴾

(۲٤/ لنور:۱۲)

”جبکہ تم نے اس کو سنا تو کیوں نہیں مسلمان مردوں اور عورتوں نے ان کے نفس کے بارے میں اچھا گمان کیا۔“

﴿ قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا ۝ ﴾ (۹۱/ الشمس:۹۔۱۰)

فائدہ: آیت کا نظم طبعی اس بات کا مقتضی ہے کہ زکیّ کی ضمیر ”من“ کی طرف اور ضمیر منصوب مؤنث، نفس کی طرف راجع ہو۔ بخلاف اس کے زکیّ کی ضمیر مَاسواھا میں ”ما“ کی طرف راجع کرنا بجائے ”من“ کے، حالانکہ ”من“ قریب ہے۔ پھر ضمیر مؤنث کو بجائے نفس کے، جو مؤنث ہے۔ ”من“ کی طرف عائد کرنا، جو کہ مذکور ہے۔ اُسی صورت میں مناسب ہوسکتا ہے جبکہ آیت کے لیے اس سے اچھا

معنی نہ ظاہر ہو سکے۔ اور جبکہ "زکیّ" کی ضمیر "من" کی طرف راجع کرنے سے بآسانی اچھے معنی بن سکتے ہیں تو پھر خواہ مخواہ "ما" کی طرف عائد کرکے تکلف کرنے سے کیا فائدہ۔

یہاں "زکیّٰ" اور "دسیّٰ" کی ضمیر "من" کی طرف راجع ہے اس صورت میں ترجمہ یوں ہوگا: "بلاشبہ اس نے فلاح پائی جس نے نفس کو پاک کیا۔" یہی ترجمہ زیادہ مناسب اور بہتر ہے۔

اس طرزِ بیان کی نظیر ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ﴾ (۸۷/ الاعلیٰ:۱٤) ہے، بعض نے ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ "فلاح پائی اس نے جس کو اللہ نے پاک کیا۔" یہ طرزِ بیان نحوی قواعد کے لحاظ سے مرجوح (ضعیف) ہے۔

فلاح، انسان کے اعمال پر موقوف ہے

اللہ تعالیٰ نے جہاں کہیں فلاح وکامیابی کا ذکر کیا ہے۔ وہاں اس کو مفلح (کامیاب) کے فعل پر معلق رکھا ہے۔ یعنی فلاح وکامرانی خود انسان کے اعمال و افعال پر موقوف ہے۔ فرمایا:

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝﴾

(۲۳/ المؤمنون:۱، ۲)

"وہ مومنین کامیاب ہیں جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں۔"

﴿الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۝ وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۝ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِنْ رَبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝﴾

(۲/ البقرۃ:۳۔۵)

"جو غیب پر ایمان لاتے اور نماز قائم کرتے اور اس مال سے جو ہم نے ان کو دیا ہے خرچ کرتے ہیں اور جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو اتارا گیا آپ کی طرف اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے اتارا گیا

اورآخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں تو یہی لوگ ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔''

﴿ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾

(۲۴/ النور:۵۱)

''جب مومنوں کو اللہ اور رسول کی طرف فیصلہ کے لیے لایا جائے تو اس وقت ان کا قول بس یہی ہونا چاہیے کہ ہم نے سنا اور مان لیا یہی لوگ فلاح یاب ہیں۔''

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ﴾ (۹۱/ الشمس:۹) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس نے فلاح پائی جس نے نفس کو پاک کیا اور اس کو اطاعت خالق پر ابھارا اور ناکام ہوا وہ شخص جس نے اس کو ہلاک کیا اور نافرمانی پر آمادہ کیا۔ یہی قول ابن قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ جس نے نفس کو حسن سلوک ، صدقات اور اطاعت الٰہی کے ذریعہ بلند کیا اور بڑھایا وہ کامیاب ہے اور جس نے گناہوں اور نافرمانیوں سے نفس کو چھپایا اور گھٹایا وہ نامراد ہے۔

فاجر، بدکار ہمیشہ گمنام، پست ہمت، بدخلق اور بے مروت ہوتا ہے۔ گویا اس نے بدکاریوں اور معصیتوں کے پردہ میں اپنے آپ کو چھپالیا اور فنا کردیا اور نیک آدمی نے حسن سلوک، سخاوت کے ذریعہ اپنے نفس کو شہرت دی اور بلند کیا۔

سخی اور بخیل کے درمیان فرق

عرب کے سخی اور فیاض بلندیوں اور اونچی جگہوں پر ٹھہرا کرتے تھے، تاکہ ان کی شخصیت گمنام نہ رہے اور حاجت مند، فقرا ومساکین بآسانی ان سے ملاقات کر سکیں اور رات کے وقت آنے والے مہمانوں کے لیے بلندیوں پر آگ روشن کی جاتی، تاکہ کسی کو مکان کے تلاش کرنے میں زحمت نہ ہو۔ اور اس کے برعکس بخیل

کنجوس اور تنگ دل ہمیشہ غاروں اور نشیبی زمین میں اترا کرتے، تا کہ کوئی ضرورت مندان کا پتہ نہ چلا سکے۔

پہلے گروہ نے اپنے نفسوں کو بلند کیا اور بخل کی گندگی سے پاک رکھا اور دوسرے گروہ نے اپنے آپ کو چھپالیا اور گمنامی میں روپوش ہو گیا۔

﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾ (۹۱/ الشمس:۱۰)

ابوالعباس رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن الاعرابی سے ﴿قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾ (۹۱/ الشمس:۱۰) کی تفسیر دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ:

"دَسّٰها اَیْ دَسَّ نَفْسَهٗ مَعَ الصَّالِحِیْنَ وَلَیْسَ مِنْهُمْ ...... الخ"

''جس نے اپنے نفس کو خفیہ طریقہ سے صالحین کے گروہ میں شامل کرلیا حالانکہ وہ ان میں سے نہیں ہے لوگ ظاہری حالت سے یہ گمان کرتے کہ یہی صالح اور نیک ہے لیکن حقیقت میں ان کے اور صالحین کے اعمال واخلاق میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔''

مفسرین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ "زکّٰھا" کی ضمیر "من" کی طرف نہیں بلکہ "مَاسَوّٰھَا" میں "ما" کی طرف راجع ہے "ما" سے مراد باری تعالیٰ ہے۔

بروایت عطاء رحمۃ اللہ علیہ یہی قول ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے اسی طرف مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہم کا رجحان ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جس نفس کو اللہ تعالیٰ نے صالح بنایا، پاک کیا اور اطاعت کی توفیق بخشی وہ کامیاب ہے اور جس نفس کو اللہ نے گمراہ کر دیا وہ ناکام ہے۔

تقدیر کا اثبات

اس قول کی تائید میں کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا چیزوں کی قسم کھا کر ان کو اپنی وحدانیت کے لیے بطور شاہد کے پیش کیا ہے اور بتلایا ہے کہ انسان کی کامیابی اور ناکامی نیکی اور بدی سب اللہ کی طرف سے ہے۔ اس طرز بیان سے

ان لوگوں کارد کرنا مقصود ہے جو تقدیر کے منکر ہیں اور صرف انسان کو مختار کل مانتے ہیں۔اس سورت کا نزول توحید کے اثبات کے لیے ہوا ہے۔لہٰذا اس مطلب کی بنا پر یہ مقصد پوری طرح حاصل ہوگا اس لیے فرمایا:

﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا﴾ (۹۱/ الشمس:۸)

دعائے نبوی

احادیث سے بھی اس مطلب کی تائید ہوتی ہے چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک شب میں بیدار ہوئی تو آپ کو یہ پڑھتے ہوئے پایا:

((رَبِّ اَعْطِ نَفْسِیْ تَقْوٰھَا وَزَکِّھَا اَنْتَ خَیْرُ مَنْ زَکّٰھَا اَنْتَ وَلِیُّھَا وَمَوْلٰھَا)) [1]

''اے پروردگار!میرے نفس کو پرہیز گاری عطا فرما اور اسے پاک کر، تو تمام پاک کرنے والوں سے بہتر ہے۔''

یہ دعا اسی آیت کی تفسیر ہے۔

دوسری حدیث میں ہے کہ جب آپ ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا﴾ (۹۱/ الشمس: ۹) لاوت فرماتے تو وقف کرتے اور یہ دعا پڑھتے:

((اَللّٰھُمَّ اٰتِ نَفْسِیْ تَقْوٰھَا،اَنْتَ وَلِیُّھَا وَمَوْلَاھَا،وَزَکِّھَا اَنْتَ خَیْرُ مَنْ زَکّٰھَا)) [2]

فائدہ: یہ دونوں روایتیں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں نقل کی ہیں۔ [3]

راجح مطلب

اب یہ بات ظاہر ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ ہی نفس کا خالق ہے، وہی نفس میں نیکی اور بدی کا ڈالنے والا ہے اور بندہ اپنے افعال کا خود خالق نہیں۔''زکّی''کی ضمیر''من'' کی طرف چند وجوہ کی بنا پر راجع کرنا راجح اور زیادہ مناسب ہے:

① فلاح اور کامیابی بندے کے فعل اور اختیار پر موقوف ہے جیسا کہ پہلے بیان

[1] مسند احمد ٦/ ٢٠٩۔ [2] المعجم الکبیر للطبرانی ١١/ ١٠٦۔ [3] ابن کثیر ٤/ ٥١٦۔

ہو چکا۔

② اس صورت میں معنی میں وسعت ہوگی۔ بندے کا فعل اور کسب اور اس پر جزاو سزا کا ترتب ہوگا اور "فالھمھا فجورھا" سے مسئلہ تقدیر بھی واضح ہوجائے گا۔

تقدیر اور انسانی اختیار کے حدود

اس انداز بیان سے یہ دونوں آیتیں دو بڑے اصول کو شامل ہوں گی:

① اختیار عبد، ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝﴾ (۹۱/ المشس: ۹، ۱۰)

② قضا وقدر، ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝﴾ (۹۱/ المشس:۸)

قرآن مجید میں متعدد جگہ یہ دونوں اصول ایک ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

مثلاً:

﴿كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝ وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ﴾

(۷۴/ المدثر:۵۴ـ۵۶)

"یعنی بلاشبہ قرآن نصیحت ہے جو اسے چاہے یاد کرے اور نہیں یاد کریں گے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے۔"

﴿لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ۝ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (۸۱/ التکویر:۲۸ـ۲۹)

"اس کے لیے جو تم میں سے سیدھی راہ پر چلنا چاہے، اور تم بغیر پروردگار عالم کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے۔"

اس سے انسان کو مجبور محض ماننے والے اور منکرین تقدیر دونوں کا رد ہوگیا۔

جب "قد افلح" کہا گیا تو تقدیر اور اختیار عبد دونوں کا ثبوت ہوگیا۔

خلاصہ کلام یہ ہے جب "زکی" کا فاعل "من" کو قرار دیں گے جس سے مراد انسان ہے تو مذکورہ بالا دونوں مسئلے ثابت ہوجائیں گے اور اگر مَا کو فاعل قرار دیا جائے جس سے مراد حق تعالیٰ کی ذات ہے تو اس صورت میں صرف مسئلہ تقدیر

ثابت ہوگا نہ کہ اختیار عبد۔لہٰذا پہلا مطلب زیادہ معنی خیز اور راجح ہے۔

تخصیص قوم ثمود

اس سورت میں صرف قوم ثمود کا تذکرہ ہے۔دوسری نافرمان قوموں کا بیان نہیں، یہاں ادنیٰ سے اعلیٰ پر تنبیہ کرنی مقصود ہے۔تمام گزشتہ اقوام قوم ثمود سے جرم اورعذاب کے اعتبار سے بڑھی ہوئی ہیں۔جس قدر گناہ قوم عاد،مدین اورقوم لوط کے قرآن نے بیان کیے ہیں اتنے قوم ثمود کے نہیں ظاہر کیے۔

قوم عاد

﴿فَأَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۖ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَهُمْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۖ وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ﴾ (٤١/ فصّلت:١٥)

''قوم عاد نے زمین میں ناحق سرکشی کی اور کہا کہ ہم سے زیادہ قوی کون ہے۔کیاوہ نہیں دیکھتے کہ جس اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ طاقتور ہے اوروہ ہماری نشانیوں کاانکار کرتے تھے۔''

﴿وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمَىٰ عَلَى الْهُدَىٰ﴾

(٤١/ فصّلت:١٧)

''ہم نے قوم ثمود کوراہ دکھلائی (لیکن)انہوں نے بجائے ہدایت کے ضلالت کو پسند کیا۔''

پہلی قوموں کی برائیاں

تکبر،غرور،لواطت،فساد،سرکشی اورکم تولنا،یہ برائیاں دوسری قوموں کے حالات میں مذکور ہیں۔قوم ثمود کوان برائیوں سے آسودہ نہیں بتلایا گیا۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں سورۂ ہود اور شعراء۔

① قوم لوط میں شرک کے ساتھ ساتھ ایسی حیاسوز اورتباہ کن بدکاری تھی جواس

سے پہلے کسی قوم میں نہیں پائی گئی۔

② قوم عاد میں شرک وغرور، ظلم اور عیاشی کا زور تھا۔

③ قوم مدین کو شرک، حق تلفی کا چسکا پڑا ہوا تھا۔

④ قوم فرعون مشرک وفسادی، خود پسند اور متکبر تھی۔

ہر قوم پر اس کے گناہوں کے مطابق عذاب نازل ہوا۔

جیسا گناہ ویسا عذاب

① قوم لوط پر ایسا عذاب آیا جو کسی دوسری قوم پر نہیں آیا تھا کیونکہ ان کا جرم بھی انوکھا تھا۔ آسمان سے پتھر برسے، آنکھوں کی روشنی چھینی گئی اور بستیاں الٹادی گئیں، پھر ان کو دھنسا دیا گیا۔

② قوم عاد تیز تند ہوا سے برباد کردی گئی، آج صفحہ ہستی پر اس کا نام ونشان بھی باقی نہیں۔

③ قوم مدین پر آگ کا عذاب آیا جس نے اس کو اور ظلم وستم سے حاصل کیے ہوئے مال کو راکھ کا ڈھیر کر دیا۔

④ قوم ثمود کو دیکھیے! بس ایک چیخ نے ان کا کام تمام کر دیا کہ وہ کروٹ بھی نہ لے سکے انہوں نے شرک کیا اور اللہ کی نشانی (اونٹنی) کو کاٹ ڈالا۔

اس تفصیل سے نتیجہ ظاہر ہے کہ جس نے اللہ کی حدود کو توڑا اور احکام شریعت کو ہلکا سمجھا، بے گناہوں کا خون بہایا اس پر عذاب بھی ویسا ہی سخت آیا۔ جنہوں نے گزشتہ اور موجودہ قوموں کے حالات کا مشاہدہ کیا ہے ان کے لیے عبرت ہے کہ دنیا اور آخرت کی نجات وسعادت انہی کے لیے ہے جن کے دل ایمان کی روشنی سے جگمگا رہے ہیں۔

قوم عاد اور قوم ثمود میں فرق

اس سورت میں قوم ثمود کے تذکرہ سے یہ نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود نے جان بوجھ کر ہدایت کی بجائے ضلالت کو پسند کیا۔ فرمایا:

﴿ وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمَىٰ عَلَى الْهُدَىٰ ﴾

(٤١/ فصلت :١٧)

''اور جو ثمود تھے تو ہم نے انہیں سیدھا راستہ دکھایا مگر انہوں نے ہدایت کے مقابلہ میں اندھا رہنا پسند کیا۔''

﴿ وَآتَيْنَا ثَمُودَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً ﴾ (١٧/ الاسراء:٥٩)

''یعنی قوم ثمود کوایسی نشانی دی جواس کے لیے بصیرت ویقین کی روشنی پیدا کرنے والی تھی۔''

بخلاف قوم عاد کے،اس کے لیے یہ صورت حال نہیں تھی۔اسی لیے اس کومقابلہ اورردوکد کی جرأت ہوئی اس نے کہا:

﴿ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ ﴾ (١١/ هود:٥٣)

''یعنی تم ہمارے پاس کھلی ہوئی نشانی لے کرنہیں آئے۔''

قوم ثمود نے اللہ کی نشانی آفتاب کی طرح چمکتی ہوئی دیکھی لیکن گمراہی کی تاریکی سے نہ نکلے۔

پس اس سورت میں ان کے لیے تنبیہ وعبرت ہے جوحق کو جان بوجھ کر چھوڑ دیتے ہیں اورآباء واجداد کے رسم ورواج کی بیڑیاں نہیں اتارپھینکتے۔ [1]

فاعتبر وایااُولی الأبصار

[1] التبیان:١٣-١٨۔

تفسیر سورۃ اللیل

جن سورتوں میں جواب قسم مذکور ہے، ان میں سے ایک سورت یہ بھی ہے۔

﴿ وَالَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ ۝ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ ۝ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ۝ ﴾

(۹۲/ اللیل ۱۔۳)

''قسم ہے رات کی جب چھا جائے، اور قسم ہے دن کی جب روشن ہو، اور قسم ہے اس ذات کی جس نے نر و مادہ کو پیدا کیا۔''

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں رات کی تمام حالتوں پر قسم کھائی ہے، اس لیے کہ یہ باری تعالیٰ کی کھلی ہوئی نشانی ہے۔ اس سورت میں اس حالت کی قسم مذکور ہے جبکہ رات کی تاریکی دنیا والوں پر چھانے لگتی ہے۔ "یغشی" فعل مضارع لایا گیا کیونکہ یہ حالت آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہے۔ بخلاف دن کے کہ اس کی روشنی سورج کے طلوع ہوتے ہی یکبارگی نمودار ہوجاتی ہے۔ اس لیے اس کے ذکر میں ماضی کا صیغہ لایا گیا۔

﴿ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ ۝ ﴾ (۹۲/ اللیل:۲) اور

﴿ وَالنَّهَارِ إِذَا جَلَّاهَا ۝ ﴾ (۹۱/ الشمس:۳)

''قسم ہے دن کی جب سورج کو نمایاں کرے۔''

کہیں اس حالت کی قسم مذکور ہے، جبکہ رات کی تاریکی چھٹنے لگتی ہے۔ فرمایا:

﴿ وَالَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ ۝ ﴾ (۸۱/ التکویر:۱۷)

''یعنی قسم ہے رات کی جبکہ پلٹے۔''

جبکہ یہی معنی ہیں:

﴿ وَالَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ۝ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ ۝ ﴾ (۷۴/ المدثر:۳۳۔۳۴) کے۔

''قسم ہے رات کی جب وہ پیچھے ہٹے اور صبح کی جبکہ روشن ہو جائے۔''

بعض نے یوں ترجمہ کیا ہے: ''قسم ہے رات کی جبکہ آئے۔'' یعنی "عسعس"

بمعنی "أقبل"۔ اب یہ معنی ﴿ وَالَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى ﴾ کے مطابق ہوگا۔

یہ دونوں حالتیں باری تعالیٰ کی ربوبیت اور پروردگاری کو آشکارا کرتی ہیں۔
پھر نر مادہ کی پیدائش کی قسم کھائی ہے، یہ قسم تمام حیوانات کے نر مادہ کو شامل ہے۔
نر مادہ کو بالمقابل ذکر کیا، جس طرح دن رات کا مقابلہ دکھلایا۔ اس تغیر وانقلاب میں بھی عقل مندوں کے لیے درس عبرت ہے۔ دن رات کی نمود آسمانی اجسام کے ذریعہ ہے۔ جس طرح نر مادہ کی پیدائش زمین کے اجزا سے ہے۔ زمین سے قسم قسم کے نر مادہ پیدا کیے اور آسمان سے سورج کے ذریعہ دن رات کے انقلابات کو ظاہر فرمایا۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے کوشش کے زمانے یعنی شب وروز اور کوشش کرنے والے یعنی ذکر وانثی (مرد وعورت) کی کوشش کے اختلاف پر قسم کھائی ہے۔ جس طرح شب وروز اور نر مادہ مختلف ہیں، اسی طرح انسانی کوششیں بھی مختلف ہیں۔ یہ اختلافات اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہیں کہ جزا وسزا میں بھی اختلاف ضروری ہے۔ یہ اللہ کے انصاف سے دور ہے کہ کوششوں کے اختلاف کے باوجود، سب کو ایک قسم کا بدلہ دے۔ اسی لیے فرمایا:

﴿ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ﴾ (٩٢/ الليل:٤)

"بلاشبہ تمہاری کوششیں مختلف ہیں۔"

یہ جواب قسم ہے۔ لیل ونہار کی گردش اور نر مادہ کے اختلاف کو بتلا کر انسانی کوششوں کی جداگانہ حالتوں کو ظاہر کیا گیا ہے۔ سعی کے معنی عمل کے ہیں، محض عمل نہیں بلکہ وہ عمل جس کو پوری تڑپ اور ولولہ سے انجام دیا جائے اور اس میں مقدور بھر قوت خرچ کی جائے۔ اگر عمل کی تکمیل کے لیے دوڑنا پڑے تو دوڑے اگر نوکروں، مددگاروں کے جمع کرنے کی ضرورت ہو تو ان سب کو اکٹھا کرے۔ اگر فراغت اور یکجہتی کی ضرورت ہے تو اسے مہیا کرے۔

قرآن مجید میں جہاں کہیں یہ لفظ آیا ہے، وہاں مذکورہ بالا معنی مراد ہیں۔

جنہوں نے اس کوعمل کا ہم معنی سمجھا ہے وہ غلطی پر ہیں۔ بلکہ وہ عمل جس کو پوری کوشش اور توجہ سے کیا جائے۔فرمایا:

﴿فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (٦٢/ الجمعة:٩)

''تم اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو۔''

ایک قراءت میں ہے''فامضوا الی ذکر اللّٰہ''لیکن پہلی قراءت زیادہ بہتر ہے۔

صحیحین کی روایت ہے:

((اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا تاتوھا تسعون واتوھا تمشون وعلیکم بالسکینۃ)) [1]

''جب نماز ہورہی ہوتو دوڑ کرمت آؤ بلکہ سکون واطمینان کے ساتھ آؤ۔''

بظاہر لوگوں کو آیت اور حدیث میں تعارض معلوم ہوتا ہے،حالانکہ یہاں صورت حال دوسری ہے۔آپ نے''سعی الی الصلوۃ''سے نہیں روکا،کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو اس کا حکم ہی دیا ہے،بلکہ''اتیان مع السعی''سے منع فرمایا ہے۔آنا یہ بدن کا فعل ہے اور اس کی سعی دوڑنا ہے،اسی سے روکا گیا ہے۔باقی رہا آیت میں جس سعی کا حکم دیا گیا ہے،اس کے معنی ہیں کہ تمام مشاغل سے خالی ہوکر پورے اہتمام اوردل کی توجہ کے ساتھ نماز کے لیے جانا۔سعی کے یہی معنی فرعون کے قصہ میں مراد ہیں جبکہ موسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا:

﴿فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝ فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ۝ فَكَذَّبَ وَعَصٰى ۝ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ۝ فَحَشَرَ فَنَادٰى ۝﴾

(٧٩/ النازعات: ١٨۔٢٣)

''کیا تو اپنی درستگی اوراصلاح چاہتا ہے اور یہ کہ میں تجھے تیرے

[1] صحیح البخاری ١/ ٣٠٨ (٨٦٦) الجمعة: باب المشي إلى الجمعة؛ صحیح مسلم ١/ ٤٢٠ (١٠١) المساجد: باب استحباب اتیان الصلاة بوقار وسکینة۔

رب کی راہ دکھاؤں، تاکہ تو (اس سے) ڈرنے لگے۔ پس اسے بڑی نشانی دکھائی۔ تو اس نے جھٹلایا اور نافرمانی کی۔ پھر پلٹا دوڑ دھوپ کرتے ہوئے۔ پھر سب کو جمع کر کے پکارا۔''

یہ سعی کیا ہے! رعایا کو اعلان واہتمام کے ساتھ ایک مقام پر جمع کرنا۔ اسی طرح دوسرے مقام پر ہے:

﴿ وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۰۵)

''جب وہ لوٹ کر جاتا ہے تو زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔''

اس طرح صدقہ کے عامل کو "ساعی علی الصدقة" اور یتیموں، بیواؤں کی خبر گیری کرنے والے کو "ساعی علی الارملة والیتیم" کہا جاتا ہے۔ یہی معنی ﴿ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ﴾ (۹۲/ اللیل:۴) میں ملحوظ ہے، یعنی وہ عمل جس کو انسان پوری توجہ اور پختہ ارادے کے ساتھ انجام دیتا ہے۔ عام مباح افعال جو انسانی عادت میں داخل نہیں، اُن کے انجام دینے کو سعی نہ کہا جائے گا اسی سعی پر ثواب و عتاب کا دارومدار ہے۔ اسی طرح:

﴿ وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ ﴾ (۱۷/ الاسراء:۱۹)

''اور جس کا ارادہ آخرت کا ہو اور جیسی کوشش اس کے لیے ہونی چاہیے، وہ کرتا بھی ہو اور وہ باایمان بھی ہو۔''

اور ﴿ إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا ﴾ (۵/ المائدۃ:۳۳)

''جو اللہ تعالیٰ سے اور اُس کے رسول سے لڑیں اور زمین میں فساد کرتے پھریں ان کی سزا یہی ہے۔''

میں سعی کے یہی معنی مراد ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ نیکوں اور بدوں کی کوششوں کے نتائج ایک طرح کے نہیں ہیں، بلکہ زمین وآسمان کا فرق ہے۔

﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝﴾

(۹۲/ اللیل:۵۔۱۰)

ان آیات میں اعمال اوراُن کی جزااورمسئلہ تقدیر کوحل کیا گیا ہے۔

تیسیر یسریٰ کے تین اسباب بیان کیے ہیں:

① اعطاء العبد، بندے کا دینا ،کیادے اس کونہیں بیان کیا۔یہاں عموم مقصود ہے،یعنی جن چیزوں کے دینے کااللہ نے حکم دیاہے ان کوفراخ دلی سے عطا کیا۔اپنے نفس کے ایمان،اطاعت،توبہ اوراخلاص پر کاربند رہنا یہ بھی نفس کااعطا ہے۔

لوگوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا،مال،بدن،زبان اورنیت ہرطرح سے مخلوق کونفع پہنچانا بھی اعطیٰ میں داخل ہے۔ایسانفس فرمانبرداراورخرچ کرنے والا ہوگا۔نافرمان اورکنجوس نہ ہوگا،یہی نفس نفع پہنچانے والا ہے،اسی نفس کواللہ تعالیٰ نے حسن سلوک پر پیداکیاہے۔اس کافائدہ صرف اپنی ذات تک سمٹا ہوانہیں ہے بلکہ چشمہ کی طرح تمام انسان اس سے سیراب ہوتے ہیں، کھیتیاں لہلہاتی ہیں،جانور اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔وہ جہاں کہیں بھی ہوتا ہے اس کانفع بآسانی سب تک پہنچتاہے۔جناب باری تعالیٰ کی طرف سے اس کوبدلہ یہ ملتاہے کہ وہ یسریٰ (آسانی کی حالت) سے ہمکنار ہوتا ہے۔

② تقویٰ،یعنی ان باتوں سے بچناجن سے اللہ نے روکاہے۔تیسیر یسریٰ کا بڑاسبب یہی ہے،اس کی ضد سے تعسیر (دشواری) پیدا ہوتی ہے۔متقی پر دُنیا آخرت کے تمام کام آسان ہوتے ہیں۔ جس کادل تقویٰ کی روشنی سے خالی ہوتاہے وہ اگرچہ دُنیاوی کاموں میں کچھ آسانی پالیتاہے لیکن آخرت کی مشکلات اس کی راہ میں برابرحائل رہتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر ایسا شخص تقویٰ، پرہیز گاری اختیار کرے تو دُنیاوی کام اوربھی سہل ہوجائیں اورنفع بھی پہلے سے زیادہ پائے۔

زندگی کی خوشحالی، دل کا سکون، روح کی فرحت، یہ نعمتیں انہیں کہاں حاصل ہیں جنہیں دنیاوی لذتوں اور خواہشوں نے فریب میں ڈالا ہوا ہے۔ فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَّهُ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ﴾

(٦٥/ الطلاق:٢-٣)

”جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے نجات کی راہ پیدا کر دیتا ہے اور ایسی جگہ سے روزی پہنچاتا ہے جہاں سے گمان بھی نہیں ہوتا۔“

یہ آسانی بھی تقویٰ ہی کے ذریعہ حاصل ہوئی۔ پھر فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَّهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا ۝ ﴾ (٦٥/ الطلاق:٤)

”اور جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کے ہر کام میں آسانی کردے گا۔“

اس آیت سے معلوم ہوا کہ متقی پر بہت سے کام آسان ہوجاتے ہیں جسے دوسرے انجام نہیں دے سکتے اور اس کا دل مصائب کے ہجوم میں بھی مایوسی سے آشنا نہیں ہوتا۔

﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهِ وَيُعْظِمْ لَهُ أَجْرًا ۝ ﴾ (٦٥/ الطلاق:٥)

”اور جو شخص اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کے گناہ مٹا دے گا اور اسے بڑا بھاری اجر دے گا۔“

برائیوں کا ازالہ اور اجر کا اضافہ بھی تقویٰ کے بدولت حاصل ہوتا ہے، اور فرمایا:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ﴾ (٨/ الانفال:٢٩)

”اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو ایک فیصلہ کی چیز دے گا اور تم سے تمہارے گناہ دور کردے گا اور تم کو بخش دے گا۔“

اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ تقویٰ کے ذریعہ فرقان (حق و باطل میں تمیز کر دینے والے روشنی)، نجات، مدد، نور، علم، برائیوں کا ازالہ اور گناہوں کی بخشش ہوتی ہے، یہ انتہائی درجہ کی آسانی ہے۔ نیز فرمایا:

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۳۰)

"اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، تاکہ تمہیں نجات ملے۔"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ تقویٰ فلاح وکامیابی کا سبب ہے، جس طرح کہ بدبختی، ناکامی، دشواری کا آخری مرحلہ ہے جو کامیاب ہوگیا اس نے آسانی کے انتہائی درجہ کو پا لیا۔ ایک مقام پر ارشاد ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ﴾

(۵۷/ الحدید: ۲۸)

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرتے رہا کرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اللہ تمہیں اپنی نعمت کا دوسرا حصہ دے گا اور تمہیں نور دے گا جس کی روشنی میں تم چلو پھرو گے اور تمہارے گناہ بھی معاف فرمادے گا۔"

یہاں اللہ تعالیٰ نے اصحاب تقویٰ کے لیے تین نعمتوں کا ذکر کیا ہے:

1. رحمت ربانی کا دوہرا حصہ ان کو ملے گا، ایک حصہ دنیا میں دوسرا حصہ آخرت میں، پھر اُخروی حصہ دوچند نے سہ چند ہی ہوگا۔
2. اُن کو ایسی روشنی ملے گی جس کی مدد سے تاریکیوں کے جنگل بآسانی طے کرلیں گے۔
3. گناہوں کی بخشش اور یہ آسانی کا بہت بڑا درجہ ہے۔

ان آیات سے صاف روشن ہوگیا کہ تقویٰ سے ہر قسم کی آسانی حاصل ہو سکتی ہے اور ترک تقویٰ ہر طرح کی دشواریوں اور سختیوں کا پیغام ہے۔

تیسیر یسریٰ کے تین اسباب میں سے دوگزر چکے ہیں۔

③ تصدیق حسنیٰ (اچھائی کو ماننا) حسنیٰ کی تفسیر میں تین اقوال ہیں:

1 بعض نے کہا کلمہ توحید لا الہ الا اللہ۔

2 کسی کا قول ہے جنت۔

3 بعض کا خیال ہے خلف یعنی اچھا بدلہ یا اولاد صالح۔

یُسریٰ سے پہلے الخصلة الیُسریٰ (آسان خصلت یا عادات) موصوف محذوف ہے۔ان تینوں اقوال میں کوئی اختلاف نہیں،کسی نے افضل اعمال کو،کسی نے افضل جزا کو حسنیٰ کی تفسیر میں بیان کیا ہے۔جس نے کلمہ توحید کے ساتھ حسنیٰ کی تفسیر ہے اس نے تمام بھلائیوں اور سعادتوں کو حسنیٰ میں سمیٹ لیا ہے۔کیونکہ لا الہ الا اللہ کی حقیقی تصدیق کے معنی یہ ہیں کہ دین کے تمام اصول وفروع پر پختہ ایمان ہو۔باری تعالیٰ اور اس جلالی کمالی صفتوں،فرشتوں،کتابوں،رسولوں اور دیدار الٰہی،معراج اور رفع مسیح پر پورا یقین ہو۔

اس باعظمت کلمہ کا صحیح اقرار کرنے والا وہی ہوسکتا ہے جو ربانی اوصاف کو صرف اللہ کے ساتھ خاص جانے اور کسی مخلوق کو اس میں شریک نہ ٹھہرائے۔

جو شخص باری تعالیٰ کی صفاتِ عالیہ کی نفی کرتا ہے،کلام الٰہی اور استواء علی العرش کو نہیں مانتا،وہ صدق بالحسنیٰ سے خارج ہے۔اسی طرح وہ لوگ جو اس کے علم کی وسعت و قدرت کے منکر ہیں، موت کے بعد جی اٹھنے کو نہیں مانتے اور جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ سزا وجزا کوئی چیز نہیں،انسان کی پیدائش سے کوئی خاص مقصد نہیں۔اس قسم کے لوگ بھی دائرہ اسلام سے باہر ہیں۔اس دائرہ میں وہی داخل ہیں جو اسلام کے تمام عقائد اور احکام کو تفصیلی طور پر مانتے ہیں۔ان کو یقین ہے کہ کلمات طیبہ اور اعمال صالحہ آسمان کی طرف بلند ہوتے ہیں اور رفع مسیح علیہ السلام اور معراج نبوی کی تصدیق کرتے ہیں۔

پس حقیقی مصدق وہی ہے جو تمام احکام کی اطاعت اور تمام منہیات سے

پرہیز کرتا ہے اسی طرح دنیا میں مال وجان کی حفاظت اسی کلمہ کے اقرار وعمل سے ہوتی ہے اور آخر میں بھی عذاب وثواب کا دارومدار بھی اسی کے کرنے اور چھوڑنے پر ہے۔

جنہوں نے حسنیٰ کی تفسیر جنت کے ساتھ کی ہے انہوں نے جزا کی بہترین نوع کو بیان کیا ہے اور جنہوں نے حلف کے ساتھ تفسیر کی ہے انہوں نے بھی دنیاوی جزا کی ایک قسم کو لیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تصدیق بالحسنیٰ، ایمان اور جزا اُخروی ودنیوی سب کو شامل ہے۔غور کریں یہ تینوں کلمات (اعطاء، تقویٰ اور تصدیق بالحسنیٰ) علم وعمل اور ہدایت وسعادت کی تمام وسعتیں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔

نفس میں اللہ تعالیٰ نے تین قسم کی قوتیں رکھی ہیں:

① قوت بذل واعطاء (خرچ کرنے کی قوت)۔

② قوت کف وامتناع (روکنے اور باز رہنے کی قوت)۔

③ قوت ادراك وفهم (سمجھنے بوجھنے کی قوت)۔

انہی تینوں قوتوں کو قوت علم وشعور، قوت محبت وارادہ اور قوت بغض ونفرت سے تعبیر کرسکتے ہیں۔انہی تینوں قوتوں پر انسان کی صلاح وسعادت کا دارو مدار ہے اور انہی کے بگڑنے سے دنیا وآخرت بگڑ جاتی ہیں۔

① قوتِ علم کے فساد سے انسان حسنیٰ (کلمہ توحید یا جنت) کے جھٹلانے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔

② قوت محبت وارادہ کے فساد سے سخاوت واعطاء کے دائرہ سے باہر نکل جاتا ہے۔

③ بغض ونفرت کی قوت کے بگڑنے سے تقویٰ کی راہ سے ہٹ جاتا ہے۔

جب اللہ کی راہ میں خرچ کرنے، قوت محبت اور ممنوعات سے پرہیز کرنے، قوتِ نفرت اور کلمہ اسلام پر پختہ یقین کرنے سے قوتِ علم درجہ کمال کو پہنچ جاتی ہے تب نفس کو اصل پاکیزگی حاصل ہوتی ہے اور انسان اس کو ہر حالت یسریٰ

(آسانی) کے لیے تیار کرلیتا ہے:

دین کی ساری عمارت تین بنیادوں پر کھڑی ہے۔

① فعل مامور (جس کا حکم دیا گیا ہے اس کو بجالانا۔) یعنی اس پیغام کو ماننا جس کو نبی کریم ﷺ لے کر آئے۔

② ترک ممنوع (جس سے روکا ہے اس سے رک جانا۔)

③ تصدیق خبر۔

اسی مضمون کو یوں بھی ادا کرسکتے ہیں کہ دین کی دوشاخیں ہیں، طلب اور خبر۔ پھر طلب کی بھی دو قسمیں ہیں، طلب فعل اور طلب ترک۔ اس سورت کے یہ تینوں کلمے دین کے تمام مراتب کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اعطاء، فعل مامور، تقویٰ، ترک ممنوع اور تصدیق بالحسنٰی، تصدیق خبر کو شامل ہے۔

بہترین اور کامل انسان وہ ہے جس میں یہ تینوں قوتیں پوری تابانی کے ساتھ پائی جائیں اور جس میں جو قوت کم ہوگی اسی درجہ اس میں کمزوری پائی جائے گی۔ [1] اسی طرح انسانی آبادی چند مختلف قسموں میں بٹ گئی ہے۔ بعض تو ایسے ہیں جن میں سخاوت کا جذبہ پرہیز گاری سے زیادہ ہے، کچھ ایسے ہیں جن میں تقویٰ کا احساس اعطاء اور انفاق سے بڑھ کر ہے۔ ایک گروہ ایسا ہے جس میں ولولہ تصدیق، پرہیز گاری اور سخاوت سے زیادہ ہے۔

﴿فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرٰى﴾ (۹۲/ اللیل:۷) کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم اس کو آمادہ کرتے ہیں عمل خیر کے لیے، اس طرح کہ اُسے اعمال صالح نہایت سہل معلوم ہوتے ہیں۔

مقاتل، کلبی اور فراء کا قول ہے کہ نیسرہ للعود الی العمل الصالح ''یعنی عمل صالح کی طرف پلٹنے کے لیے ہم آسانی کی راہیں اس پر کھول دیتے ہیں۔''

پس یُسرٰی سے وہ خصلت اور حالت مراد ہے، جو نہایت آسان اور نفع

[1] لیکن جس میں یہ تینوں قوتیں درجہ کمال تک پہنچی ہوں گی وہ اپنے آپ کو ہر آسانی کے لیے آمادہ پائے گا۔

بخش ہے اس کی ضد عُسری ہے۔جس پرآسانی کے راہیں کھل جاتی ہیں اس پر بھلائیاں اورنیکیاں گراں نہیں گزرتیں۔ اس کا دل، اس کے تمام اعضا اعمال صالحہ کو نہایت بے تکلفی سے انجام دیتے ہیں۔کسی قسم کا بوجھ اورطبیعت پر جبر معلوم نہیں ہوتا۔نیکی کی راہیں اس کے لیے ہموار اور سہل ہوجاتی ہیں۔اسی لیے کہا گیا ہے:

مبارك الطلعة ميمونها   يصلح للدنيا وللدين

﴿وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ﴾(۹۲/ اللیل:۸)یعنی جس نے قوتِ ارادہ واعطا کو بے کار کردیا اوراحکام الٰہی کو اپنی سرتابیوں اور سرکشیوں سے پامال کیا۔ ﴿وَاسْتَغْنٰى﴾ یعنی جس نے تقویٰ کو چھوڑ کر بے پرواہی اور بے نیازی کی اورقوتِ نفرت کو معطل کیا۔ ﴿وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى﴾(۹۲/ اللیل:۹) جس نے ایمان اوراس کی جزا سے انکار کرکے قوتِ علم وشعور کو باطل کردیا۔

﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى﴾(۹۲/ اللیل:۱۰)عطاء کا قول ہے، یعنی میں عنقریب اس کے دل اورایمان کے درمیان آڑ بن جاؤں گا۔مقاتل کا بیان ہے کہ بھلائی کا پانااس پر دشوار ہوجائے گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے "نیسره للشر"یعنی برائی کی راہ ہم اس کے لیے آسان کردیں گے۔جس کی وجہ سے برائیاں نہایت آسانی سے انجام پائیں گی۔جس طرح خیرکثیرآسانی سے ہمکنارکرتی ہے اسی طرح شرعذاب الٰہی کے آتش کدہ میں جھونکتاہے۔فراء کا قول ہے کہ عربوں کا محاورہ ہے:"یسرت غنم فلان" یعنی جبکہ بکری بچہ جننے کے لیے آمادہ ہو۔اسی طرح جبکہ وہ بچہ جَن دے اوردودھ خوب فراوانی کے ساتھ دے۔اس صورت میں بکری کے مالک کوآسانی اورخوشحالی حاصل ہوتی ہے۔

تیسیر عسرٰی کے دو سبب ہیں:

① بندے اوراسباب خیر کے درمیان روک پیداہوجائے جس کی بنا پر شر دل،زبان اورتمام اعضا پر بآسانی قبضہ کرلے اورریشہ ریشہ میں رچ جائے۔

② اس کے اورجنت کے درمیان آڑکردی جائے۔جس طرح کہ اسباب جنت

اور اس کے درمیان آڑ کی گئی تھی۔

سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اتقی اور استغنٰی کا مقابلہ کیسا؟ کیا بندہ ایک لمحہ کے لیے اللہ سے بے نیاز اور بے پروا رہ سکتا ہے؟

جواب یہ ہے کہ یہ حُسنِ مقابلہ کی بے نظیر صورت ہے۔ متقی جب اپنے فقر وفاقہ، محتاجی اور مشکلات کا اندازہ کرتا ہے تو تقویٰ قائم رہتا ہے۔ ایسا کام نہیں کرتا جس سے اللہ کے غصے کا سزاوار ٹھہرے۔ بلکہ اپنی پوری کوشش اطاعت اور گناہوں سے بچنے میں خرچ کر ڈالتا ہے۔ تقویٰ کے مقابلے میں استغنا کے ذکر سے اشارہ ہے کہ جس نے تقویٰ کو چھوڑا اور اللہ کی نافرمانی کی گویا اس نے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھا۔ ورنہ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اللہ کے دربار میں گڑگڑاتا، اسی کو اپنا ملجا وماویٰ سمجھتا اور اس بات کا یقین کرتا، کہ وہ پلک بھر بھی اس کے فضل وکرم سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ غور کریں اس تقابل میں کیسی مٹھاس اور لذت ہے۔ ان دونوں آیتوں نے کس خوبی اور چاہت کے ساتھ تمام بھلائیوں، برائیوں اور ان کے اسباب کو بے نقاب کردیا ہے۔

پاک اور بے عیب ہے وہ ذات جس نے اپنے کلام کے ذریعہ اپنے بندوں کے خصائص واوصاف کھول کھول کر بیان کیے۔ اس کے نیک بندے وہی ہیں جو اصل کے بعد نقل کے پیچھے نہیں پڑتے، جو حق کو باطل سے اور سچ کو جھوٹ سے نہیں بدلنا چاہتے۔

انہی دو آیتوں نے مسئلہ قضا وقدر کی گتھی سلجھادی اور ہر قسم کے شک وشبہ کی ظلمتوں کے پردے چاک کردیئے۔

صحیحین کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((ما منكم من احد الا وقد علم مقعده من الجنة والنار)) قيل: يارسول الله! أفلا ندع العمل، ونتكل على الكتاب؟ قال: ((اعملوا، فكل ميسر لما خلق له)) ثم قرأ:

﴿ فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ۝ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ ۝ ﴾

(٨٢/ الليل: ٥، ٦، ٧) [1]

''تم میں ہرایک کا مقام جنت یا دوزخ میں مقرر ہے۔'' اس پر صحابہ نے کہا اے اللہ کے رسول! کیا ہم عمل کرنا چھوڑ نہ دیں اور لکھے گئے پر بھروسہ کریں؟ تو آپ نے فرمایا: ''تم عمل کرو، ہر شخص جس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے وہ اس کے لیے آسان کر دیا جاتا ہے۔'' پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی: ''جس نے دیا (اللہ کی راہ میں) اور ڈرا (اپنے رب سے) اور نیک بات کی تصدیق کرتا رہے گا۔ تو ہم بھی اس کو آسان راستے کی طرف سہولت دیں گے۔''

اس روایت سے منکرین تقدیر اور قائلین جبر دونوں کارد ہوگیا اور یہ بات واضح ہوگئی کہ شریعت اور تقدیر دونوں اپنی جگہ ثابت ہیں ان میں کسی قسم کا تصادم نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ نے وہی لفظ ارشاد فرمایا جو قرآن میں مذکور ہے یعنی تیسیر، جبر اور اس قسم کے دوسرے الفاظ اہل بدعت کے ایجاد کردہ ہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی خوب واضح ہوگیا کہ صحابہ کرام دین کے اصول وقواعد سے زیادہ واقف تھے۔ انہیں جب بھی کوئی بات سمجھنی ہوتی تو اعلم الناس نبی کریم ﷺ سے دریافت کر لیتے، اور آپ ایسا جواب دیتے کہ ان کے دل ایمان کی روشنی سے چمک اُٹھتے۔ یہ معرفت اور کمال علم اہل بدعت، نفس پرست اور متکلمین کو کہاں حاصل، جنہوں نے اپنی تاویلوں اور موشگافیوں سے شریعت کو ایک معمہ بنا دیا ہے۔

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے اصول دین کو ثابت کرنے کے لیے قرآنی آیت کو پیش کیا، اس سے اشارہ ہے کہ دین کے اصول وقواعد کا ثبوت قرآن سے معلوم کرنا چاہیے۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ قرآن سے اصول دین

[1] صحيح البخاري ٤/ ١٨٩١ (٤٦٦٦) التفسير: باب ﴿فسنيسره للعسرى﴾؛ صحيح مسلم ٤/ ٢٠٤٠ (٢٦٤٧) القدر: باب كيفية خلق الآدمي-

ثابت نہیں ہوسکتے، وہ سخت غلطی پر ہیں ان کے پاس سوائے ظن ووہم کے کوئی قطعی دلیل نہیں ہے۔اور یہ بھی ثابت ہوا کہ بعض لوگ سعادت کے لیے اور بعض شقاوت (ناکامی) کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ یہ نہیں کہ سب کی پیدائش سعادت کے لیے ہوتی ہے اور بعد میں کچھ لوگ شقاوت پسند کر لیتے ہیں۔

اس روایت سے اسباب کا وجود بھی ثابت ہوا،اور یہ کہ بندہ جس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس کی راہیں اور اسباب اس کے لیے آسان کر دیئے جاتے ہیں۔

اس روایت سے یہ بھی روشن ہوگیا کہ حدیث نبوی قرآن سے مأخوذ ہے، اس کا کوئی حصہ کتاب مبین کے مخالف نہیں ہے۔یہ جو کچھ نبی کریم ﷺ نے فرمایا فطرت انسانی وحیوانی کے عین مطابق ہے اسی پر دنیا کا نظام اور کاروبار قائم ہے۔ اگر کوئی شخص اس فطرتی اصول کو چھوڑ کر یہ کہے کہ یہ جو تقدیر میں لکھا ہوگا وہ اپنے آپ ہی ہو جائے گا،ہمیں کھانے کمانے کی کیا ضرورت؟ تو ساری دنیا اسے احمق کہے گی۔جب دنیاوی معاملات کے انجام دینے میں تقدیر حائل نہیں ہوتی تو پھر شریعت کے احکام بجالانے میں یہ حیلے بہانے کیسے؟ حالانکہ دنیا اور آخرت کا رب ایک ہی ہے، اگر اسی طرح انسان تقدیر پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائے تو دین و دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔

یہ حیلے وہی کر سکتے ہیں جو اپنی نفس پرستیوں اور ہوس رانیوں کے لیے تقدیر کی آڑ لے کر شریعت کی پابندیوں سے چھوٹنا چاہتے ہیں۔قرآن میں مشرکین کی ان چالوں کو بارہا جگہ بے نقاب کیا گیا ہے۔فرمایا:

﴿ سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ۝ قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۖ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ

أَجْمَعِينَ﴾ (٦/ الانعام:١٤٨۔١٤٩)

"یہ مشرکین (یوں) کہیں گے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام کہہ سکتے۔اس طرح جو لوگ ان سے پہلے ہو چکے ہیں انہوں نے بھی تکذیب کی تھی یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے عذاب کا مزا چکھا۔آپ کہیے! کہ کیا تمہارے پاس کوئی دلیل ہے تو اس کو ہمارے روبرو ظاہر کرو۔تم لوگ محض خیالی باتوں پر چلتے ہو اور تم بالکل اٹکل سے باتیں بناتے ہو۔"

دوسرے مقام پر ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ نَحْنُ وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ﴾ (١٦/ النحل:٣٥)

"مشرک لوگوں نے کہا کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا اس کے سوا کسی اور کی عبادت ہی نہ کرتے، نہ اس کے فرمان کے بغیر کسی چیز کو حرام کرتے۔یہی فعل ان سے پہلے لوگوں کا رہا تو رسولوں پر تو صرف کھلم کھلا پیغام کا پہنچا دینا ہے۔"

ایک جگہ فرمایا:

﴿وَقَالُوا لَوْ شَاءَ الرَّحْمَٰنُ مَا عَبَدْنَاهُمْ﴾ (٤٣/ الزخرف:٢٠)

"اور یعنی کافروں نے کہا اگر اللہ چاہتا تو ہم غیر اللہ کی پوجا نہ کرتے۔"

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَنْ لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ﴾ (٣٦/ یٰسین:٤٧)

"یعنی جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے میں

سے خرچ کرو، تو یہ کفار ایمان والوں کو جواب دیتے ہیں کہ ہم انہیں کیوں کھلائیں؟ جنہیں اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو خود کھلا پلا دیتا۔"

اگر یہ سوال کیا جائے کہ یسرٰی اور عسرٰی اور دونوں کے اسباب کو ابتداءً کس نے پیدا کیا؟

تو جواب یہی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہی نے بندے کے لیے خیروشر کی راہیں کھول دی ہیں اور اس کے اسباب آسان کردیئے ہیں۔اس نے اپنی مخلوق کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔اہل سعادت، جو اپنے دلوں میں صلاحیت وتقویٰ کی راہوں کو آسان پاتے ہیں۔دوسرے اہل شقاوت، جن پر برائیوں کے راستے کھول دیئے گئے ہیں۔جو مخلوق جس کام کے لیے پیدا ہوئی ہے۔اسی کے اسباب اس کے لیے فراہم کردیئے گئے ہیں۔

اللہ کی حکمت سے بعید ہے کہ جو سزا کے لائق نہ ہوں ان کو سزا اور جو انعام کے مستحق نہ ہوں انہیں ثواب عطا فرمائے۔بلکہ ایسا تو کوئی مخلوق میں سے بھی نہیں کرسکتا۔کیا مشک، عنبر اور گوبر کا درجہ ایک ہی ہے؟ایسا کرنا عقل کی موت ہے۔اگر یہ شبہ ہوکہ جو اہل سعادت ہیں اُن کو شقاوت کے لیے اور اصحاب شقاوت کو سعادت کے لیے کیوں نہ پیدا کیا گیا؟اس قسم کا اعتراض ایک جاہل ہی کرسکتا ہے گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس مخلوق کو اس طرح اور اس طرح کیوں پیدا کیا؟ ظاہر ہے اس قسم کے سوال کا جواب سوائے خاموشی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

اگر پھر کوئی کہے کہ کیا جاہل کے لیے ایسا جواب نہیں کہ وہ جہالت سے شفا پاسکے۔تو کہا جائے گا،ہاں!اللہ کی شان الوہیت نے ایسا ہی چاہا کہ اس نے تمام چیزوں کو ان کی ضدوں اور لوازم کے ملحوظات کے ساتھ پیدا کیا۔یہ بھی ایک کمال ہے جس میں اللہ کا کوئی شریک نہیں۔بلندی اور پستی، دن اور رات، سردی اور گرمی، تندرستی اور بیماری، بہار اور خزاں یہ سب ساتھ پائے جاتے ہیں، قدرت کی

نیرنگیاں اسی طرح ہیں۔اگر کائنات کا سلسلہ اس طرح نہ ہوتا تو پھر رب کی قدرت ومشیت کے کمال کی معرفت کیسے حاصل ہوتی۔ جب تم نے اس کو اپنا بادشاہ اور مالک مان لیا تو پھر اس کے افعال پر نکتہ چینی کیسی؟

ملک ہونے کی صفت تو یہ چاہتی ہے کہ ثواب وعقاب،موت وحیات سب اسی کے اختیار میں ہو۔اوراسی صفت کا تقاضا ہے کہ اس نے کتابیں اُتاریں، رسول بھیجے اورحلال وحرام کی حدیں قائم کردیں۔

جوعزت کے لائق ہے اس کوعزت بخشی اورجو ذلت کا مستحق ہے اس کوذلت کی پستیوں میں ڈالا۔کیونکہ وہ عالم،سمیع،بصیر،مدبر،حي،صاحب کلام اور غضب ورحمت والا ہے۔

یہاں صرف اشارہ کردیا گیا ہے کہ غور کیا جائے تومعرفت کے خزانے اور حکمت وعلم کی سرسبز وشاداب وادیاں سامنے آجائیں۔

پھر فرمایا: ﴿اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى﴾ (۹۲/ اللیل: ۱۲)

اس آیت کی تفسیر میں بعض نے کہا کہ راہ ہدایت کو راہ ضلالت سے الگ کردینا ہمارا ہی کام ہے۔ قتادہ اوربعض مفسرین کا قول ہے کہ حلال وحرام اور اطاعت ومعصیت کے امور کو بیان کرنا ہمارے ذمہ ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کونیک راہ دکھلاتا ہے اورنافرمانوں اوراعمال صالح کے درمیان آڑ پیدا ہوجاتی ہے۔فراء کہتے ہیں یہاں ہدایت کا بیان ہے،اضلال کوچھوڑ دیا جس طرح ﴿سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ﴾ (۱٦/ النحل:۸۱) ''تمہارے لیے کرتے بنائے جوتمہیں گرمی سے بچائیں۔'' میں ''البرد''کونظر انداز کردیا گیا ہے۔

مجاہد کا قول ہے کہ جس نے ہدایت کی راہ اختیار کرلی تواب اس راہ کا ذمہ اللہ پر ہے۔اب یہی ہدایت اس کواللہ کی طرف اوردائمی نعمتوں کی طرف پہنچائے گی۔تمام اقوال میں یہی قول زیادہ درست ہے۔

اس قسم کا مضمون قرآن میں تین جگہ ادا کیا گیا ہے۔سورۂ نحل میں فرمایا:

﴿ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ ﴾ (١٦/ النحل:٩)

''اوراللہ پرسیدھی راہ کا بتا دینا ہے۔''

﴿ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴾ (١٥/ الحجر:٤١)

''یہی مجھ تک پہنچنے کی سیدھی راہ ہے۔''

اس تفصیل سے صاف ظاہر ہوگیا کہ جوہدایت کی راہ پر چلنے والا ہے،اس کو یہ ہدایت ضرور اللہ تک پہنچادے گی۔یہی ھدی،صراط مستقیم ہے۔یہاں پر دو چیزوں کا ذکر ہے،ایک راہ اوردوسری غایت (غرض) راہ،وہی ہدایت ہے اور غایت، باری تعالیٰ تک پہنچناہے۔سالک الی اللہ(اللہ کی طرف قدم بڑھانے والا) کا مطلوب صرف یہی ہے کہ وہ دنیاوآخرت کی سعادتوں سے ہمکنار ہوجائے۔تو یہ اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے جبکہ طلب بھی ایک اورمطلوب بھی ایک،یعنی ہر بات میں توحید کاخیال ہو۔سو اب پوری طرح جاننا چاہیے کہ دنیاوآخرت کی تمام کائنات کامالک وہی ہے اوراس ملکیت میں کوئی اس کاشریک نہیں ہے:

یہ دونوں مختصر آیتیں چاراہم مطالب کوشامل ہیں:

① بلندترین غایت(وصول إلی اللہ)۔

② غایت(مقصود)تک پہنچنے کے لیے نزدیک ترین راستہ،یعنی ہدایت۔

③ توحید طریق،یعنی راہ صرف ایک ہونی چاہیے۔

④ توحید مطلوب،یعنی حق،اس سے ہٹ کردوسری طرف قدم نہیں اُٹھانا چاہیے۔

کامل ہدایت توحید مطلوب،توحید طلب، توحید طریق سب کوشامل ہے۔ مقصد اورمطلوب تک پہنچنے میں ناکامی اسی وقت ہوسکتی ہے، جبکہ ان امور میں بجائے توحید کے شرکت پیدا ہو جائے۔

مطلوب اورمقصود میں شرکت توحیدواخلاص کے مخالف ہے۔طلب میں

شرکت سچائی اور ارادہ کی پختگی کے خلاف ہے،اور راستہ میں شرکت اتباع واطاعت کے منافی ہے۔پہلی صورت میں شرکت ریاکاری،دوسری میں نافرمانی،تیسری صورت میں بدعت اور سنت سے جدائی پیدا ہوتی ہے۔

نتیجہ ظاہر ہے کہ توحید مطلوب شرک سے،توحید طلب نافرمانی سے،توحید طریق بدعت سے بچاتی ہے۔یہی وہ تین راہیں ہیں۔جن پر شیطان انسانوں کو پھانسنے کے لیے اپنے جال لگاتا ہے۔جب اللہ تعالیٰ نے راہیں ہموار کردیں،تو جھٹلانے والوں کو ڈرایا اور ان کو اشقی (بدترین) قرار دیا اور اصحاب تقویٰ واحسان کو عذاب سے نجات پانے کی بشارت دی۔فرمایا:

﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ۝ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ۝﴾

(۹۲/ اللیل ۱۷۔۱۸)

متقی محسن جو کچھ بھی کرتا ہے،صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے کرتا ہے اس کے دل میں ریا کا شائبہ تک بھی نہیں ہوتا۔آخری آیتوں میں بتلایا گیا ہے کہ متقی کسی احسان کو برداشت نہیں کرسکتا،اگر کوئی احسان بھی کرتا ہے تو بدلہ دیئے بغیر چین سے نہیں بیٹھتا،اور یہ صرف اس لیے کہ کسی کا احسان اس کے ذمہ باقی نہ رہے اور اس کے تمام اعمال اور ساری زندگی صرف اللہ کے لیے ہو،لفظ تجزی سے بتلایا کہ نبی کریم ﷺ نے جو اس متقی پر نعمت اسلام کا احسان کیا ہے اس کا بدلہ نہیں ہوسکتا۔ہر محسن کے احسان کا بدلہ اُتارا جاسکتا ہے لیکن نعمت اسلام کا بدلہ ممکن نہیں۔

اس تفصیل سے صاف ظاہر ہوا کہ اس آیت کے پہلے مصداق صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں اور اس فضیلت عظمیٰ کے زیادہ لائق وہی ہیں۔حضرت علی رضی اللہ عنہ اس آیت کا مصداق نہیں بن سکتے،کیونکہ ان پر تو نبی کریم ﷺ کا اسلام کے علاوہ دوسرا احسان بھی تھا جس کا بدلہ اُتارنا ممکن ہے۔

﴿إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَى ۝﴾ (۹۲/ اللیل:۲۰) سے صاف بتلادیا کہ جس پر مخلوق کا احسان نہ ہو اس کے تمام کام صرف اللہ کی مرضی کے لیے وقف ہوتے

ہیں۔اس کے برعکس جس کے گلے میں دوسروں کے احسانوں اورنعمتوں کا طوق ہوتا ہے،اس کا عمل بھی انہی کے لیے ہوتا ہے اور مجبوراًاسے ایسا کرنا پڑتا ہے۔

لہٰذا کمال اخلاص اسی کا نام ہے کہ مخلوق کے احسان کا زیر بار نہ ہو،تا کہ اس کی تمام کوششیں صرف اللہ کے لیے انجام پائیں۔یہ غرض نہایت بلندترین اور پاکیزہ ترغرض ہے،اسی طرح جو نزدیک تر راہ اس تک پہنچاتی ہے وہ بھی نہایت درست اور صحیح راہ ہوگی۔[1]

[1] التبیان:۳۵-۴۵۔

تفسیر سورۃ الضحیٰ

﴿وَالضُّحٰى ۙ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ﴾ (۹۳/ الضحی ۱۔۲)

''قسم ہے چاشت کے وقت کی، اور قسم ہے رات کی جب چھا جائے۔''

اس مبارک سورت میں نبی کریم ﷺ پر جو انعامات کیے گئے ہیں۔ان پر قسم کھائی ہے اور ضمناً نبوت کی صحت اور اُخروی جزا و سزا پر قسم کھائی گئی ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے رات اور دن کی قسم کھائی ہے، یہ دونوں اللہ کی بڑی نشانیاں ہیں اور اس کی پروردگاری اور حکمت ورحمت کو آشکارا کرتی ہیں۔

غور کریں! قسم اور جوابِ قسم میں کیسی لطیف مناسبت ہے۔جس طرح آفتاب کی روشنی رات کی تاریکیوں کے بعد چمکتی ہے بالکل اسی طرح نورِ وحی کی شعاعیں کچھ عرصہ غائب رہنے کے بعد نبی کریم ﷺ کے سینہ صافی پر چمکیں۔ جبکہ دشمنوں نے طعنے دینے شروع کر دیئے کہ محمد ﷺ کو اس کے ربّ نے چھوڑ دیا۔ایک نکتہ یہ بھی سامنے رہے کہ جس اللہ نے رات کے پردوں کو دن کی روشنی سے چاک کیا، اسی نے جہالت وشرک کی تاریکیوں کو وحی ونبوت کی روشنی سے چھانٹ دیا(زائل کیا)۔پہلی دونوں چیزیں حسی اور ظاہری ہیں اور شرک ووحی کا تعلق عقل سے ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ جس رب کی رحمت اپنے بندوں کو ہمیشہ اندھیرے میں نہیں رکھتی، بلکہ دن کی روشنی سے اُن کو اُن کی ضرورت کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔وہ کب یہ گوارا کرتی کہ ہمیشہ اس کے بندے جہالت وگمراہی کی تاریکیوں میں بھٹکتے رہیں۔اسی لیے اس نے نورِ وحی سے انسانوں کے لیے دنیا و آخرت کے مصالح وفوائد بے نقاب کر دیئے۔

غور کریں! ان معانی میں کیسی مٹھاس ہے اور الفاظ میں کیا رونق ہے اور قسم

کے جواب کے تعلق، مناسبت میں کیسی خوبی ہے کہ طبیعت جھوم اٹھتی ہے۔

ابتدائی وحی کی بندش کے بعد کافروں نے طعنے دینے شروع کیے محمد (ﷺ) کواس کے رب نے چھوڑ دیااوراس سے ناراض ہوگیا۔اللہ تعالیٰ نے اس کی نفی فرمائی کہ جب سے میں نے اسے اپنی آغوش رحمت میں لیا ہے،کبھی الگ نہیں کیا۔جب سے اپنا محبوب بنایاہے،کبھی ناراض نہیں ہوا،اس کے بعد فرمایا:

﴿ وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ ﴾ (۹۳/ الضحیٰ:٤)

''یعنی آخرت اُولیٰ سے بہتر ہے۔''

یہ آیت اپنے اندر مطالب کاایک سمندر رکھتی ہے۔یعنی ہر وہ حالت جس کی طرف آپ ترقی کررہے ہیں پہلی حالت سے بہتر ہے،جس طرح کہ دارآخرت دنیا سے اچھا ہے۔ پھر ایسا وعدہ فرمایا جوآنکھوں کی ٹھنڈک،دل کے سرور اور سینے کی کشادگی کاسبب بنا۔یعنی اللہ تعالیٰ آپ پراپنے عطیوں اوربخششوں کی بارش کرے گا کہ آپ راضی ہوجائیں۔

﴿ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ﴾ (۹۳/ الضحیٰ:٥)

''تجھے تیرارب بہت جلد(انعام)دے گا اور تو راضی (وخوش) ہو جائے گا۔''

یہ آیت قرآن،ہدایت،مدد،اُمت کی کثرت،ذکرکی بلندی،حق کا غلبہ اور آخرت کی تمام دائمی نعمتوں کوشامل ہے۔بہت سے نادان اسی فریب میں مبتلا ہیں کہ جب تک جہنم میں ایک بھی اُمتی رہے گا،آپ راضی نہ ہوں گے۔یہ خیال حقیقت سے کوسوں دور اورشیطانی دھوکاہے،آپ بھی اسی پرراضی ہوں گے جس پر اللہ تعالیٰ راضی ہوگا۔آپ کی رضامندی اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے تابع ہوگی اور آپ اسی کے لیے سفارش کریں گے،جس کے لیے اللہ کی طرف سے اجازت ملے گی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ﴿ أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ﴾(۹۳/ الضحیٰ٦)

"کیا اس نے تجھے یتیم پاکر جگہ نہیں دی ہے؟" سے اپنے احسانات کو بیان کیا ہے کہ اسی نے اے محمد ﷺ! تم کو یتیمی میں اپنی پناہ میں لیا اور تمہاری دستگیری کی، اسی نے حیرانی وتردد کی وادیوں سے نکال کر ہدایت کی شاہراہ دکھلائی، اسی نے تنگی کے بعد خوشحالی اور فارغ البالی بخشی۔ان تین نعمتوں کا شکریہ یہ ہے کہ یتیم کو قہر آلودنگاہوں سے نہ دیکھو، سائل کو مت جھڑکو، رب کی دی ہوئی نعمتوں کو مت چھپاؤ۔

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو یتیموں، ناداروں اور طالب علموں کی طرف خاص توجہ دلائی ہے۔مجاہد ومقاتل نے اس کی تفسیر میں کہا ہے:

"لاتحقر الیتیم ، فقدکنت یتیماً۔"

"یتیم کو بنظر حقارت مت دیکھنا، تم خود یتیم رہ چکے ہو۔"

فراء نے کہا ہے، یتیم کے مال پر ناجائز قبضہ مت رکھو، اس کی حق تلفی نہ کرو۔یتیموں کے معاملہ میں عربوں کی ایسی ہی عادت تھی۔ان کے مال چھین لیتے اور ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتے، اللہ نے اس سے روکا ہے۔

یتیموں ہی پر کیا منحصر ہے، ہر بے کس، نادار سے حسن سلوک سے پیش آؤ۔بظاہر یہ حکم نبی کریم ﷺ کو ہے، لیکن حقیقت میں اُمت کا ہر فرد اس حکم کا مکلّف ہے۔

﴿وَاَمَّا السَّآىِٕلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ (۹۳/ الضحی:۱۰)

"اور نہ تو سوال کرنے والے کو ڈانٹ ڈپٹ۔"

اکثر مفسرین کی رائے ہے کہ سائل سے مراد طالب صدقہ ہے، یعنی جب تمہارے پاس کوئی فقیر، نادار مانگتا ہوا آئے تو اس کو جھڑکو نہیں بلکہ اس کی حاجت پوری کرو، یا نرمی سے جواب دے دو۔

حسن بصری اور یحییٰ بن آدم کے نزدیک سائل سے مراد طالب علم ہے، یعنی جب کوئی علم وحکمت کے سرچشمہ کو ڈھونڈتا ہوا تمہارے پاس آئے تو اس کی پیاس

کو شفقت ومہربانی سے بجھا دو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ لفظ اپنے معنی کی وسعت کے لحاظ سے دونوں معنی کو شامل ہے۔

﴿ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴾ (۹۳/ الضحی:۱۱)

''اور اپنے رب کی نعمتوں کو بیان کرتا رہ۔''

مجاہد اور کلبی کا قول ہے کہ اس آیت میں نعمت سے مراد قرآن ہے، یعنی خوب پڑھو اور پڑھاؤ اور اللہ تعالیٰ کی اس پرعظمت نعمت کو دوسروں تک پہنچاؤ۔

زجاج کے نزدیک نعمت سے مراد نبوت ہے، یعنی اپنی نبوت اور رسالت کا اعلان کرو اور ربانی احکام پوری کوشش کے ساتھ لوگوں تک پہنچاؤ۔

مقاتل نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس نعمت کا شکریہ ادا کرو، جس کا ذکر اس سورت میں ہو چکا ہے۔

تحقیق یہ ہے کہ یہ آیت دنیا و آخرت کی تمام نعمتوں کو شامل ہے۔ [1]

[1] التبیان: ۴۶، ۴۷۔

تفسیر سورة التین

﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝﴾

(۹۵/ التین:۱-۳)

''قسم ہے انجیر اور زیتون کی اور طور سینین کی اور اس امن والے شہر کی۔''

جن سورتوں میں جواب قسم مذکور ہے اُن میں سے ایک یہ بھی ہے۔یہاں تین مقدس مقامات کی قسم کھائی گئی ہے۔جہاں انبیائے کرام کا ظہور ہوا،اوراللہ کی بے پایاں نعمتوں اوررحمتوں کے سرچشمے اُبلے۔تین اورزیتون سے دونوں مشہور درخت بھی مراد ہیں اوروہ جگہ بھی جہاں یہ بکثرت پیدا ہوتے ہیں،یعنی بیت المقدس۔مفسرین کی ایک جماعت نے کہا کہ انجیر اورزیتون کی قسم ان کے فوائد اورمنافع کی بنا پرکھائی ہے۔

انجیر، تر لقمہ کے برابر ایک فائدہ مند پھل ہے،اس میں نہ کوئی ضرر ہے اورنہ گٹھلی۔اس میں میوں کی سی لذت بھی ہے اورغذا کافائدہ بھی،علاج میں بھی کام آتاہے اورسالن میں بھی پڑتاہے۔اس کے مزاج میں اعتدال ہے،نہ بہت سرد نہ بہت گرم۔اس کی طبیعت،زندگی کی طبیعت کے بالکل موافق ہے یعنی حرارت اوررطوبت۔ظاہری شکل خوش نما ہے۔اس کے کھانے اوردیکھنے سے دل میں فرحت اورتازگی پیداہوتی ہے۔اس کی لذت تمام میوؤں سے ممتاز ہے،قوت کوبڑھاتاہے اورباہ کوتقویت بخشتاہے۔بواسیر اور نقرس میں مفید ہے،تراورخشک دونوں حالتوں میں کھایاجاتاہے۔

زیتون بھی فوائد کے لحاظ سے کچھ کم نہیں اس میں بھی قدرت ربانی کے عجائبات موجود ہیں۔اس کی شاخ پھل بن کرنمودار ہوتی ہے اوراس سے روغن نچوڑاجاتاہے جو روشنی کے کام آتاہے اورکھانوں میں پڑتاہے،یہ خوشبو بھی ہے

اور دوا بھی۔اس کا درخت عرصہ دراز تک باقی رہتا ہے اور پتا نہیں جھڑتا۔اس کے علاوہ اور بہت سے فوائد ہیں جو اہل حکمت سے پوشیدہ نہیں۔

یہ جو کچھ کہا گیا ہے درست ہے لیکن لائق یہ ہے کہ درخت اور اُن کی پیدائش کی جگہ دونوں مراد لی جائیں۔

یہ مقام بیت المقدس ہے،جہاں مسیح علیہ السلام (کلمۃ اللہ،روح اللہ، عبداللہ، رسول اللہ) کا ظہور ہوا۔جس طرح کہ"طور سینین " پر موسیٰ علیہ السلام کے لیے ربانی تجلیات اور آیات روشن ہوئیں۔یہی وہ پہاڑ ہے جہاں موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ربّ سے سرگوشیاں کیں اور فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے۔

اس کے بعد "بلدامین" کی قسم کھائی،یہ مکہ مکرمہ ہے جہاں سید الانبیاء خاتم المرسلین کی بعثت ہوئی اور رسالت کا آفتاب اپنی پوری تابانیوں اور تجلیوں کے ساتھ چمکا۔

یہاں مقامات کی ترتیب میں فاضل سے افضل کی طرف انتقال کیا گیا ہے، ابتدا میں مسیح علیہ السلام کے مقام ظہور کو بیان کیا اور بیچ میں موسیٰ کلیم اللہ کے مقام شرف کو ذکر کیا،اور آخر کا مضمون تورات میں بھی مذکور ہے:

"جاء الله من طورسيناء واشرق من ساعير واستعلن من فاران۔"

"یعنی اللہ کوہ طور سے آیا اور ساعیر سے چمکا اور فاران کی چوٹیوں سے اس نے آواز بلند کی۔"

طور سیناء سے موسیٰ علیہ السلام اور ساعیر سے مسیح علیہ السلام اور فاران سے محمد ﷺ کی بعثت مراد ہے۔یہاں زمانہ کے لحاظ سے انبیائے کرام کا ذکر ہوا ہے۔موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو صبح سے اور نبوت مسیح کو طلوع آفتاب سے اور نبوت محمدیہ کو آفتاب نصف النہار سے تشبیہ دی ہے۔بنی اسرائیل میں زیادہ تر محسوسات کی طرف توجہ رہتی تھی اس لیے ترتیب حسی اور واقعی بیان کی گئی ہے، اور اُمت محمدیہ کو عقل ودانائی میں

کمال بخشا گیا ہے اس لیے ترتیب عقلی ذکر کی گئی ہے۔

یہاں انسانی پیدائش اور اس کے انجام پر قسم کھائی گئی ہے، فرمایا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾ (۹۵/ التین:٤)

''یعنی ہم نے انسان کو بہترین صورت، بناوٹ، اعتدال اور کمالِ حسن کے ساتھ پیدا کیا۔ اور اس کی شکل کو تمام حیوانوں کی شکلوں سے زیادہ ممتاز اور خوش نما بنایا۔''

بھلا جس رب نے انسان کو ایک مٹی بھر مٹی اور پانی کے قطرے سے پیدا کر کے کمالِ حسن اور جمال فطرت بخشا۔ کیا اس کی قدرت، حکمت، علم اور اوصافِ کمال سے انکار کیا جاسکتا ہے؟

اسی عبرت کے لیے قرآن مجید میں انسانی پیدائش کو بار بار بیان کیا گیا ہے اور اسی سے توحید اور مبدأ و معاد پر استدلال کیا گیا ہے۔

ان تینوں مقدس مقامات کی قسم کھانے سے حق تعالیٰ کی عنایت و مہربانی کی طرف اشارہ ہوگیا کہ وہ اپنی مخلوق پر کیسا مہربان ہے، اس کی ابدی سعادتوں اور راحتوں کے لیے انبیائے کرام کو مبعوث فرمایا، کتابیں نازل کیں، عذاب وثواب سے آگاہ کیا، تاکہ بندے اپنے رب کے حقوق کو پہچانیں اور اس کی اطاعت سے دنیا و آخرت کی نعمتیں سمیٹیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دو فریق کا ذکر کیا:

1. وہ جس نے اللہ کی پکار کو سنا اور تسلیم کیا۔
2. وہ جس نے سرکشی کی اور حق سے منہ موڑا۔

زیادہ اکثریت اسی فریق کی ہے۔

﴿ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ﴾ (۹۵/ التین:٥)

''پھر ہم نے اُن کو اسفل سافلین میں لوٹا دیا۔''

اسفل سافلین کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ یہاں مراد جہنم ہے، مجاہد، حسن اور ابو العالیہ کا یہی مسلک ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جہنم کے کئی طبقے ہیں، بعض بعض سے پست ہیں قتادہ، عکرمہ، عطاء وغیرہ کے نزدیک اسفل سافلین سے مراد، ارذل العمر (انتہائی بڑھاپا) ہے۔ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف بھی منسوب ہے۔

لیکن چند وجوہ کی بنا پر قول اوّل ہی درست ہے:

① ارذل العمر کا نام اسفل السافلین رکھنا نہ کسی لغت سے ثابت ہے نہ عرف عام میں مستعمل ہے۔

② ارذل العمر تک پہنچنے میں مومن اور کافر سب برابر ہیں۔ کافروں کے ساتھ اس حالت کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ پھر استثنا "الا الذین آمنوا" کی کیا ضرورت تھی؟

③ قرآن نے ارذل العمر کو بنی آدم کے لیے (بلا تخصیص کافر) بیان کیا ہے:

﴿ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ﴾ (۲۲/ الحج:۵)

"اور تم میں سے بعض تو وہ ہیں جو فوت کر لیے جاتے ہیں اور بعض بے غرض عمر کی طرف لوٹا دیئے جاتے ہیں کہ وہ ایک چیز سے باخبر ہونے کے بعد پھر بے خبر ہو جائے۔"

یہاں انسانوں کے دو فریق بیان کیے ہیں، ایک وہ جو بڑھاپے سے پہلے مر جاتے ہیں اور دوسرے وہ جو بڑھاپے کی سرحد عبور کر کے قبر تک پہنچتے ہیں۔ یہاں اس فریق پر اسفل السافلین نہیں بولا گیا:

④ ارذل العمر اور آجر غیر ممنون دونوں کا مقابلہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

⑤ اسفل السافلین مراد لینے کی صورت میں آیت کا کفار کی سزا کے ذکر سے خالی ہونا لازم آئے گا، اور ایسی چیز مذکور ہوگی جو حس اور مشاہدہ میں آتی ہے۔ اس حالت میں معنی کی بلندی اور برتری باقی نہیں رہتی۔

⑥ یہاں اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش اور اس کے انجام کو بیان کیا ہے۔ اس

کاانجام دوحال سے خالی نہیں یاتو دوزخ یادائمی ثواب۔یہی انداز بیان قرآن کے تمام حصوں میں پھیلا ہوا ہے کہ وہ انسانی پیدائش سے معاد(روز جزا)کو ثابت کرتا ہے۔اب یہاں ارذل العمر مراد لے کر معنی بے جوڑ ہوجاتا ہے۔

⑦ ارذل العمر کی تفسیر کی بنا پر بہت تاویل اور تکلف کرنا پڑے گا۔صورت حال دوامر سے خالی نہیں۔ارذل العمر کے لوٹنے والے اگر صرف کفار ہیں تو یہ مشاہدہ کے خلاف ہے اوراگر مومن کافردونوں مراد ہیں توپھر استثنا بے معنی ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ان لوگوں نے یہاں محذوف ماناہے، یعنی:

"الذین آمنواوعملواالصالحات لاتبطل اعمالھم اذا ردوا الی ارذل العمر۔"

''جولوگ ایمان لائے اورعمل صالح سے آراستہ ہوئے ان کے اعمال بڑھاپے کی حالت میں ضائع نہ ہوں گے۔(بلکہ تندرسی اور قوت کی حالت میں جوعمل کرتے تھے اس کا ثواب برابر ان کو پہنچتا رہے گا)۔"

یہ مضمون درست ہے،لیکن اس آیت سے بلاتکلف ظاہر نہیں ہوتا۔ان لوگوں کے نزدیک یہاں استثنا رد ہے نہ کہ اجرعمل۔بعض کا خیال ہے کہ "الذین آمنوا"سے مراد قراء(قرآن پڑھنے والے)ہیں یعنی قرآن پڑھنے والاارذل العمر تک نہ پہنچے گا۔یہ خیال دووجہوں سے کمزور ہے:

1 یہاں استثنا عام ہے جوقاری اوران پڑھ سب کوشامل ہے،صرف قاری کی تخصیص بےمحل ہے۔

2 اس دعویٰ کی کوئی دلیل بھی نہیں پیش کی جاسکتی۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت بیان فرمائی ہے کہ اس نے انسان کو احسن تقویم سے نوازا۔اس نعمت کاشکرہی ہے کہ ایمان اورعمل صالح کے لیے دل میں تڑپ پیدا کی جائے۔جس نے ایسا کیااس کے لیے اعلیٰ علیین ہے اورجس نے

شرک کیا، نافرمانی کی وہ اسفل السافلین کی دلدلوں میں پھنسا اور احسن تقویم کے شرف سے محروم ہوا۔

⑧ اس آیت کی نظیر سورۂ انشقاق میں ہے، وہاں بجائے اسفل السافلین کے عذاب الیم کہا گیا ہے، فرمایا:

﴿ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ ﴾ (۸۴/ الانشقاق:۲۴-۲۵)

''انہیں الم ناک عذابوں کی خوشخبری سنادو۔ہاں ایمان والوں اور نیک اعمال والوں کے لیے بے شمار اور نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔''

پس معلوم ہوا کہ ''اسفل السافلین '' سے ''عذاب الیم'' (جہنم) ہی مراد ہے۔

﴿ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ ﴾ ''غیر مقطوع'' یعنی نہ منقطع ہونے والا دائمی اجر، جو ہر قسم کی کدورت اور مصیبت سے پاک ہوگا۔بعض نے اس لفظ کی تفسیر میں کہا ہے:

''غیر ممنون به علیهم، بل هو جزاء اعمالهم۔''

''آخرت کا ثواب ان کے اعمال کا بدلہ ہوگا، اللہ کا احسان نہ ہوگا۔''

قدریہ کا خیال ہے کہ احسان جتلانا نعمت کے مکلّف کو بے راہ کر دیتا ہے اسی لیے جنت والے اس بدمزگی سے پاک ہوں گے۔

یہ خیال بالکل غلط ہے، اللہ کے فضل وکرم کو بندے کے احسان پر قیاس کرنا ہرگز درست نہیں ہوسکتا۔ایک انسان دوسرے پر احسان کرے پھر اس کا اظہار کرے، تو یہ عیب ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ تو حقیقی منعم ہے، اگر وہ اپنی نعمتوں کا اظہار فرماتا ہے تو اس سے بجائے کدورت کے لذت اور خوشی حاصل ہوتی ہے، فرمایا:

﴿ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ۭ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ ﴾ (۴۹/ الحجرات:۱۷)

''اپنے مسلمان ہونے کا آپ پر احسان جتاتے ہیں۔آپ کہہ دیجیے کہ اپنے مسلمان ہونے کا احسان مجھ پر نہ رکھو، بلکہ دراصل اللہ کا تم

پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت کی اگر تم راست گو ہو۔“

﴿وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۝ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۝﴾ (۳۷/ الصافات:۱۱۴-۱۱۵)

”یقیناً ہم نے موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) پر بڑا احسان کیا، اور انہیں اور ان کی قوم کو بہت بڑے دکھ درد سے نجات دی۔“

یہاں اللہ تعالیٰ نے دنیوی نعمت کا اظہار کیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے لیے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ۝﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۳۷)

”ہم نے تجھ پر ایک اور بھی بڑا احسان کیا ہے۔“

جنت والے کہیں گے:

﴿فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ۝﴾ (۵۲/ الطور: ۲۸)

”پس اللہ تعالیٰ نے ہم پر بڑا احسان کیا اور ہمیں تیز و تند گرم ہواؤں کے عذاب سے بچا لیا۔“

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾

(۳/ آل عمران:۱۶۴)

”بے شک مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ ان ہی میں سے ایک رسول ان میں بھیجا۔“

﴿وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ (۲۸/ القصص:۵)

”پھر ہماری چاہت ہوئی کہ ہم ان پر کرم فرمائیں جنہیں زمین میں بے حد کمزور کر دیا گیا تھا، اور ہم انہیں کو پیشوا اور (زمین کا) وارث بنائیں گے۔“

صحیح روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((الم اجدکم ضلالا فهداکم الله بی؟الم اجدکم عالة فاغناکم الله بی؟))

’’کیا میں نے تمہیں گمراہی میں نہیں پایا پھر اللہ نے میرے ذریعے تمہیں ہدایت دی؟ کیا میں نے تمہیں محتاج نہیں پایا پھر اللہ نے میرے ذریعے تمہیں غنی کردیا؟‘‘

تو سب نے جواب میں کہا کہ ’’اللّٰہ ورسوله أمن‘‘ اللہ اوراس کا رسول بہت احسان کرنے والے ہیں۔ [1]

اللہ اور رسول کے درجہ کی حقیقی معرفت رکھنے والے اسی قسم کا جواب دیتے ہیں۔ دُنیا کی تمام نعمتیں اللہ کی طرف سے ہیں اگر وہ ان کا اظہار کرتا ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ بلکہ اس سے تو منعم علیہ کو عزت ومسرت حاصل ہوتی ہے۔ ہاں اگر محسن بجائے خالق کے مخلوق ہے تو اس کا احسان وانعام پر فخر کرنا اوراس کا اظہار کرنا سخت معیوب ہے۔ کیونکہ اس کے پاس جو کچھ نعمتیں ہیں وہ اس کی نہیں ہیں، بلکہ اللہ کی طرف سے اس کے پاس امانت ہیں۔ اب اگر وہ دوسروں تک پہنچاتا ہے تو اس میں کمال ہی کون سا ہے، جس پر اظہار اور فخر کیا جائے۔ پس یہ کہنا کہ مسلمانوں کا جنت میں داخلہ اپنے اعمال کی بنا پر ہے، اللہ کے فضل وکرم کو اس میں دخل نہیں، سخت غلطی ہے۔

بعض لوگوں نے مذکورہ بالا قول کی توجیہ یوں کی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن یا جنت میں اپنا احسان ان پر جتلائے گا نہیں، بلکہ یہ فرمائے گا یہ جو کچھ تم کو ملا ہے وہ تمہارے اعمال کا بدلہ ہے، ہم کسی قسم کا احسان نہیں رکھنا چاہتے۔ لیکن یہ توجیہ درست نہیں، بندوں کے اعمال جنت کا عوض نہیں ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے صاف اعلان کردیا:

((لن يدخل احد منكم الجنة بعمله)) قالوا: ولا انت يارسول الله؟ قال: ((ولا أنا الاان يتغمدني الله برحمة منه وفضل)) [2]

---

[1] صحیح البخاری ٤/ ١٥٧٤ (٤٠٧٥) المغازی: باب غزوة الطائف؛ صحیح مسلم ٢/ ٧٣٨ (١٠٦١) الزكاة: باب اعطاء المؤلفة قلوبهم على الاسلام۔ [2] المعجم الكبير للطبرانی ٧/ ٣٦٩ (٧٢١٨)؛ صحیح مسلم میں ’’یدخل‘‘ کے بجائے ’’ینجی‘‘ کا لفظ ہے[٤/ ٢١٦٩ (٢٨١٦)]

''تم میں سے کوئی بھی ہرگز اپنے اعمال کی وجہ سے جنت میں داخل نہیں ہوگا۔''صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا۔اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ بھی نہیں؟تو آپ نے فرمایا:''میں بھی نہیں، مگر یہ کہ اللہ اپنی رحمت اور فضل سے ڈھانپ لے۔''

اس حدیث سے واضح ہوگیا کہ آخرت کی نعمتوں کا حصول محض اس کے فضل وکرم کی بنا پر ہوگا،کسی کا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔اگر یہ شبہ ہوکہ حدیث میں صاف موجود ہے کہ اگر بندے توحید پر قائم رہیں اور اس کی عبادت کریں،تو اُن کو عذاب میں مبتلا نہ کرے۔ [1] اسی طرح اللہ نے فرمایا:

﴿حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۳۰/ الرّوم: ٤٧)

''ہم پر مومنوں کی مدد کرنا لازم ہے۔''

تو اس کا ازالہ اس طرح ہے کہ یہ تو اس کا بہت بڑا فضل واحسان ہے کہ اس نے اپنے فرمانبرداروں سے دائمی ثواب کا وعدہ فرمایا ہے۔ ورنہ اگر وہ زمین و آسمان کی تمام مخلوق کو بھی عذاب دے تو وہ ظالم نہ ہوگا۔کسی نے کیا خوب کہا ہے:

ماللعباد عليه حق واجب　　كلا، ولا سعي لديه ضائع
ان عذبوا فبعدله، اونعموا　　فبفضله، فهو الكريم الواسع

اس کے بعد فرمایا:

﴿فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ﴾ (۹٥/ التين: ۷)

''پس تجھے اب روز جزا کے جھٹلانے پر کون سی چیز آمادہ کرتی ہے۔''

صحیح قول یہی ہے کہ یہاں خطاب انسان کو ہے نہ کہ نبی کریم ﷺ کو، جیسا کہ بعض مفسرین کی رائے ہے۔ یعنی اے انسان!ان کھلی نشانیوں اور قدرتوں کے سن لینے کے بعد کون سی چیز تمہیں جزا اورمعاد کے جھٹلانے پر آمادہ کرتی ہے؟

---

[1] صحيح البخاري ٥/ ٢٣٨٤ (٦١٣٥) الرقاق: باب من جاهد نفسه في طاعة الله؛ صحيح مسلم ١/ ٥٨ (٤٨) الايمان: باب الدليل على أن من مات على التوحيد دخل الجنة قطعا۔

کیا تم نے اپنی پیدائش اور بدن کی ساخت میں غور نہیں کیا۔جس نے تمہیں بہترین بناوٹ عطا کی،کیا وہ دوبارہ نہیں پیدا کرسکتا؟ کیا وہ جس نے تمہیں ذلیل پانی سے سمجھ بوجھ والا انسان بنایا،کیا وہ تمہیں بے کار چھوڑ دے گا اور تمہاری روحانی تربیت کے لیے کچھ نہ کرے گا،اور کیا وہ دوسرے عالم میں تمہاری بدکاریوں اور نیکیوں پر ثواب وعقاب نہ کرے گا؟

احکم الحاکمین کی حکمت تو ضرور اس کو چاہتی ہے،اسی لیے اس نے روزِ حساب مقرر کیا ہے۔مجاہد کی یہی رائے ہے۔

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس آیت میں خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے،اس صورت میں "ما" بمعنی "من" ہوگا مطلب یہ ہوا کہ اس برہان کے پیش کردینے کے بعد اے محمد ﷺ! کون آپ کو جھٹلائے گا؟ یعنی ایسا نہیں ہونا چاہیے۔یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی سرکشی کی وجہ سے انکار کردے۔اسی کو دوسری آیت میں یوں فرمایا:

﴿ فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۸٤)

"پھر بھی اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلائیں تو آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے گئے ہیں۔"

دوسری آیت میں ہے:

﴿ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴾ (٦/ الانعام:۳۳)

"یہ لوگ آپ کو جھوٹا نہیں کہتے لیکن یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔"

﴿ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ ﴾ (۹۵/ التین:۸)

"کیا اللہ تعالیٰ (سب) حاکموں کا حاکم نہیں ہے؟"

یہ آیت پوری سورت کے مضمون کی تاکید ہے۔اسی سے نبوت،توحید،معاد کا اثبات ہوتا ہے۔جب وہ احکم الحاکمین ہے تو مکذبین کے مقابلہ میں رسول کی مدد

پر بھی قادر ہے اور اپنے بندوں کی سعادت کے لیے شریعت بھی اُتارتا ہے، اور آخرت میں ثواب و عذاب دے سکتا ہے۔ جس رب نے انسانوں کو مختلف حالتوں میں رکھا اور احسن تقویم کی عزت بخشی، کیا وہ اس کو بے کار چھوڑ سکتا ہے؟

یہ مختصر سی سورت ہے لیکن معانی و مطالب کے لحاظ سے سمندرِ ناپیدا کنار ہے۔ [1]

[1] التبیان: ۲۸-۳۵۔

تفسیر سورۃ العادیات

﴿وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ﴿۱﴾ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۙ﴿۲﴾ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۙ﴿۳﴾ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ﴿۴﴾ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۙ﴿۵﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۚ﴿۶﴾﴾

(۱۰۰/ العادیات:۱۔۶)

''قسم ہے دوڑنے والے گھوڑوں کی ہانپتے ہوئے اور آگ نکالنے والوں کی ٹاپ مارتے ہوئے اور حملہ کرنے والے صبح کے وقت، پھر اڑایا صبح کے وقت غبار اور پھر اس غبار کے ساتھ لشکر کے بیچ میں گھس گئے۔ بے شک انسان اپنے رب کا سخت ناشکرا ہے۔''

اس بارے میں اختلاف ہے کہ ''عادیات'' سے مراد گھوڑے ہیں یا اونٹ۔ حضرت علی، ابن مسعود اور محمد بن کعب رضی اللہ عنہم وغیرہ کا خیال ہے کہ اس سے مراد حاجیوں کے اونٹ ہیں جو عرفہ سے مزدلفہ اور مزدلفہ سے منیٰ دوڑتے پھرتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن رحمۃ اللہ علیہ اور فراء کے نزدیک اس سے مجاہدین کے گھوڑے مراد ہیں۔ دوسرا قول درج ذیل چند وجوہ کی بنا پر صحیح ہے:

① ضَبْح: لغت میں گھوڑے کے ہانپنے کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب تیز رفتاری اور دوڑ کی وجہ سے گھوڑے کا سانس پھول جاتا ہے اور ایک قسم کی آواز اس کے سینے سے نکلتی ہوئی سنی جاتی ہے۔ یہ آواز صهیل، حمحمه (ہنہنانے) کے علاوہ ہے۔

② ﴿فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۙ﴾ (۱۰۰/ العادیات:۲) ٹاپوں سے آگ نکالنا بھی گھوڑے کے ساتھ خاص ہے۔ اونٹ کے قدم اپنی نرمی اور ڈھیلے پن کی بنا پر دوڑتے ہوئے آگ نکال ہی نہیں سکتے۔

③ تیز روی میں گھوڑوں سے غبار زیادہ اڑتا ہے۔

اَثَرْنَ بِهٖ: میں بِهٖ کی ضمیر سے مراد وہ مکان ہے جس میں گھوڑے دوڑتے ہیں۔

یہ غبار زیادہ تر اس وقت اڑتا ہے جبکہ گھوڑے دشمن کی صفیں چیرتے ہوئے لشکر کے قلب (درمیان) میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس وقت حرکت و جولانی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔وادی محشر میں بوقت جنگ غبار اُڑانا،مراد لینا درست نہیں۔کیونکہ اس مقام کی سختی کی وجہ سے وہاں غبار اُڑ ہی نہیں سکتا۔گھوڑوں سے مراد لڑنے والے گھوڑے ہیں جن کو عرب اپنی لڑائیوں میں استعمال کرتے تھے۔ خاص مجاہدین کے گھوڑے بطورِ مثال کے یہاں بیان کیے جاسکتے ہیں۔بلکہ مجاہدین کی سواریاں اپنے شرف وفضل کی بنا پر "العادیات" کے مصداق بننے کی زیادہ مستحق ہیں۔ سلسلہ قسم میں گھوڑے کے ذکر سے مقصود یہ ہے کہ اس جانور کی پیدائش بھی اللہ تعالیٰ کی روشن نشانیوں میں سے ہے۔ اس کے ذریعہ سے عزت و نصرت اور فتح و کامرانی حاصل ہوتی ہے۔ اس کی تیز رفتاری سے انسان اپنے مطلوب کو حاصل کرلیتا ہے۔ دشمنوں پر قابو پالیتا اور جنگوں میں اس سے خوب کام لیتا ہے۔

قرآن میں دوسری جگہ اونٹوں کا ذکر بطورِ نعمت کیا گیا ہے کہ وہ ایک شہر سے دوسرے شہر تک تمہارے سامان کو لیے پھرتے ہیں۔ اونٹ زیادہ تر بوجھ اٹھانے کے لیے ہیں اور گھوڑے فتح ونصرت دلانے کے لیے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی دونوں نعمتوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔

﴿فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۝﴾ (۱۰۰/ العادیات:۳) حملہ کرنے کے لیے صبح کے وقت کو خاص طور پر اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ اس وقت دشمن اپنی جگہ سے منتشر نہیں ہوسکتا کیونکہ دشمن پر ایسے وقت میں غفلت و سستی چھائی ہوتی ہے۔ جبکہ حملہ آور آرام و راحت کے بعد حملہ کے لیے پوری طرح چاق و چوبند ہو جاتا ہے اور دشمن پر ایسے وقت میں غفلت اور سستی چھائی ہوتی ہے۔

اسی لیے حدیث میں بھی ہے:

"رسول اللہ ﷺ جب کسی بستی پر حملہ کا ارادہ رکھتے تو صبح تک انتظار کرتے ۔اگر مؤذن کی آواز سنائی دیتی تو حملہ سے رک جاتے ورنہ حملہ کر دیتے۔" [1]

[1] صحیح البخاری ۱/ ۲۲۱ (۵۸۵) الأذان: باب مایحقن بالأذان من الدماء۔

(جو حضرات "العادیات" سے اونٹ مراد لیتے ہیں، انہوں نے اپنے معنی کو درست قرار دینے کے لیے کئی تاویلیں کی ہیں جن کو بغرض اختصار حذف کر دیا گیا ہے۔مترجم)

"العادیات" کی تفسیر میں چند اقوال اور بھی ملتے ہیں جو اپنے مفہوم و مطلب کے لحاظ سے ضعف سے خالی نہیں۔

اسی طرح "موریات" کی تفسیر میں بھی متعدد اقوال ملتے ہیں:

① قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ "موریات" سے مراد یہ ہے کہ گھوڑے لڑنے والوں کے درمیان عداوت کی آگ بھڑکا دیتے ہیں۔

② عکرمہ کی تفسیر ہے کہ "موریات" سے مراد وہ زبانیں ہیں، جو اپنی تیز گفتاری سے دشمن کے انتقامی شعلوں کو تیز کر دیتی ہیں۔

③ انسانوں کی افکار و آرا مراد ہیں جو مکروفریب کی آگ کو ہوا دیتی ہیں۔

یہ تشریحات آیت کے ظاہری الفاظ سے تو سمجھ میں نہیں آتیں۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ قیاس و اشارہ سے یہ معانی نکالے جاتے ہیں تو کچھ صحت مانی جا سکتی ہے۔

مفسرین اور طریق تفسیر

اب تک سلف و خلف کی تمام تفسیریں تین اصولوں پر مبنی رہی ہیں:

① ظاہری الفاظ کو مدار قرار دینا، یہ متاخرین مفسرین کا طریقہ ہے۔

② معانی کا لحاظ، اس طرز کو سلف نے اختیار کیا ہے۔

③ اشارہ وقیاس سے معانی و مطالب کا استنباط، یہ طریقہ صوفیا کے حلقہ میں رائج ہے۔ یہ صورت بھی جائز ہے بشرطیکہ چند باتوں کا لحاظ رکھا جائے:

1. آیت کے معنی سے تصادم اور ٹکراؤ پیدا نہ ہو۔
2. وہ قیاس یا اشارہ سے سمجھا ہوا معنی فی نفسہٖ درست ہو۔
3. ظاہر لفظ میں اس معنی کے لیے کچھ گنجائش موجود ہو۔

④ ظاہر لفظ سے جو معنی سمجھے جاتے ہیں۔ اس میں اور قیاسی معنی میں کوئی تعلق اور مناسبت ہو۔ جب یہ چار شرطیں پائی جائیں، تب اس قسم کی تفسیر کو قبول کیا جا سکتا ہے۔

عَادِیَات/ مُوْرِیَاتِ اور اَثَرْنَ/ وَسَطْنَ میں فرق

اللہ تعالیٰ نے انسانی افعال کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے:

① وسائل و ذرائع ② اغراض و مقاصد

گھوڑوں کا دوڑنا، دوڑتے ہوئے آگ نکالنا اور دشمن پر حملہ کرنا یہ سب افعال اصل غرض کے لیے ذریعہ ہیں اور دشمن کی صفوں میں غبار اڑاتے ہوئے گھس جانا اصل مقصد ہے۔ اسی بنا پر ذرائع کے لیے اسم فاعل اور اظہار مقصد و غرض کے لیے فعل کو بیان کیا گیا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی طریقہ بیان یہاں مناسب تھا۔ [1]

﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝ ﴾ (۱۰۰/ العادیات:۶)

"یقیناً انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔"

کنود کے معنی میں کئی اقوال ہیں:

① کنود، اللہ کی نعمتوں کا منکر اور ناشکرا۔ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور قتادہ کا قول ہے۔

② جو نعمتوں کو بھول جاتا ہے اور مصیبتوں کو شمار کرتا ہے۔

③ جس میں بھلائی کم ہو، کہتے ہیں "ارض کنود" یعنی بنجر، بے آب وگیاہ زمین۔

④ کنود وہ ہے جسے ایک برائی نے بہت سی نیکیوں سے غافل کر دیا ہو۔ [2]

مقسم علیہ کا بیان

جس چیز پر یہاں قسم اٹھائی گئی ہے وہ انسان کا "کنود" (ناشکرا) ہونا،

---

[1] التبیان :۴۸-۵۰۔ [2] مدارج ۱/ ۱۹۱۔

بخیل ہونا اور مال سے از حد محبت کرنا وغیرہ ہے۔ کَنَدَ یَکْنُدُ، کَفَرَ یَکْفُرُ کے وزن پر آتا ہے۔ "کنود" اس بنجر زمین کو کہتے ہیں جہاں کچھ بھی پیداوار نہ ہو سکے۔ اسی طرح "کندی" اس عورت کی صفت بھی آتی ہے جو اپنے شوہر کی نافرمان اور ناقدردان ہو۔ اصل لفظ "کنود" میں حق اور خیر سے روکنے کے معنی پوشیدہ ہیں۔ تمام مفسرین کے اقوال اسی معنی کو شامل ہیں۔

① ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کنُود أی کفور، ناشکرا۔

② وہ بخیل جو عطیہ سے روکتا ہے، اپنے غلام کو بھوکا رکھتا ہے اور کسی کو مصیبت میں دیکھ کر بھی اس کا دل نہیں پسیجتا۔

③ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ "کنود" وہ ہے جو اپنے ربّ کو ملامت کرتا ہے۔ مصیبتوں کو گنتا ہے اور نعمتوں کو بھول جاتا ہے۔

﴿ وَإِنَّهُۥ عَلَىٰ ذَٰلِكَ لَشَهِيدٌ ﴾ (۱۰۰/ العادیات:۷)

"اور بے شک وہ اس پر گواہ ہے۔"

اس آیت کی تفسیر میں چند اقوال ہیں:

① اِنَّه' کی ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔

② انسان اپنی حالت پر خود گواہ ہے خواہ وہ زبان سے انکار ہی کرتا ہے۔

سیاق کے لحاظ سے یہ دوسرا مطلب زیادہ مناسب ہے۔ ﴿ وَإِنَّهُۥ لِحُبِّ ٱلْخَيْرِ ﴾ (۱۰۰/ العادیات:۸) میں اِنَّہٗ سے مراد بھی انسان ہی ہے۔ اب کلام کی ترتیب یہ ہوئی کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ انسان ناشکرا ہے پھر بتلایا کہ وہ خود اس پر گواہ ہے۔ پھر آخر میں فرمایا کہ انسان مال کی محبت کی وجہ سے کنجوس واقع ہوا ہے۔

پہلے قول کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کی گواہی مراد ہوتی ہے وہاں بعد میں "علی" آتا ہے جیسا کہ فرمایا:

﴿ ثُمَّ ٱللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ ۝ ﴾ (۱۰/ یونس: ٤٦)

''پھر اللہ تعالیٰ خبردار ہے، اس سے جو وہ کرتے ہیں۔''

یعنی وہ پوری طرح واقف اور مطلع ہے۔ اگر انسانی شہادت مراد ہوتی تو بجائے ''علی'' کے ''باء'' آنا چاہیے تھی، جیسا کہ فرمایا:

﴿مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ﴾ (۹/ التوبۃ: ۱۷)

''مشرکین کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں بحالیکہ کہ وہ اپنے نفسوں پر کفر کے ساتھ گواہی دے رہے ہیں۔''

اسی طرح اگر یہاں بھی شہادت انسانی مراد ہوتی تو یوں کہا جاتا ''وَاِنَّهٗ بِذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ'' کیونکہ ''کنود'' یہاں پر مشہود بہ (جس کے ذریعے گواہی دی جائے) ہے۔ اور نفس انسان مشہود علیہا (جس کے بارے میں یا جس پر گواہی دی جائے۔)

﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ﴾ (۱۰۰/ العادیات: ۸)

''وہ خیر کی محبت میں سخت ہے۔''

باتفاق مفسرین یہاں ''خیر'' سے مراد مال ہے۔ ''شدید'' سے مراد بخیل ہے جس کو مال کی محبت نے بخل پر آمادہ کر دیا ہے۔ ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک لِحُبِّ الْخَيْرِ، ''شدید'' کے متعلق ہے۔ یہاں انسان کی دو صفتیں بیان کی گئی ہیں:

① رب تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے۔

② جو کچھ اللہ نے دیا ہے، اس میں سے خرچ نہیں کرتا۔ نہ تو مخلوق کا ہمدرد ہے اور نہ محسنِ حقیقی کا شکرگزار۔ ایک فاجر انسان ایسا ہی ہوتا ہے، بخلاف اس کے ایک مؤمن صالح کی حالت دوسری ہوتی ہے وہ اللہ کے لیے مخلص اور اس کے بندوں کے لیے محسن و ہمدرد ہوتا ہے۔

بخل اور کفر

جیسا کہ یہاں پر بخل اور کفر کو یکجا فرمایا ہے، اسی طرح قرآن کی متعدد آیات میں ان دونوں کا تذکرہ ہے:

① ﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۝ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ۝ ﴾ (۱۰۷/ الماعون: ٤۔۷)

’’پس خرابی ہے ان نمازیوں کے لیے جو اپنی نماز سے غافل ہیں جو ریاکاری کرتے ہیں اور معمولی برتنے کی چیزوں سے روکتے (بخل کرتے) ہیں۔‘‘

② ﴿ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ ﴾ (٤/ النساء: ٣٨)

’’جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو لوگوں کے دکھاوے کے لیے اور اللہ اور دن آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔‘‘

③ ﴿ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ آمَنُوا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللَّهُ ﴾

(٤/ النساء: ٣٩)

’’ان کا کیا نقصان تھا، اگر وہ قیامت اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آتے۔‘‘

اسی کے ہم معنی آیات سورۃ اللیل کے شروع میں بھی ہیں:

④ ﴿ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهُ ۝ ﴾

(۱۰٤/ الھمزۃ: ۱۔۲)

’’خرابی ہے چغل خور، عیب چین کے لیے جس نے مال جمع کیا اور گن گن کر رکھا۔‘‘

⑤ ﴿ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا ۝ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ﴾

(٤/ النساء: ٣٦، ٣٧)

’’اللہ تعالیٰ نہیں پسند کرتا منکنے والے اربابِ فخر و غرور کو جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کا حکم دیتے ہیں، اور جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے دیا ہے اس کو چھپاتے ہیں۔‘‘

اخلاص واحسان

فخر وغرور اور مال کو جمع کر کے رکھنا سب بخل کا نتیجہ ہے۔ یہ تمام صفات نماز اور زکوٰۃ کے مقصد کی عین ضد ہیں۔ کفر و بخل کے بالمقابل اخلاص و احسان کو ان آیات میں یکجا بیان فرمایا ہے:

① ﴿الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ﴾

(٢/ البقرة:٢)

"جو لوگ غیب پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔"

② ﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾

(٤/ النساء: ٣٦)

"اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔"

﴿أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ ۝ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ ۝ إِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ﴾ (١٠٠/ العاديات:٩۔١١)

"کیا پھر انسان نہیں جانتا جبکہ نکالا جائے گا جو کچھ بھی قبروں میں ہے اور الگ کیا جائے گا جو کچھ سینوں میں ہے۔ بلاشبہ ان کا رب اس دن ان کے بارے میں یقیناً خبردار ہوگا۔"

ان آیات میں اللہ تعالیٰ بندے کا انجام بتا کر اسے خوف دلاتا ہے۔ حصل کے معنی ہیں جمع کیا گیا، الگ کر دیا گیا، ظاہر اور بیان کر دیا گیا۔ یہاں قبور اور صدور کو ایک ساتھ ذکر فرمایا ہے۔

جیسا کہ حدیث میں ہے:

((ملأ الله أجوافهم وقبورهم نارًا)) [1]

[1] صحیح البخاری ٤/ ١٦٤٨ (٤٢٥٩) التفسیر: باب ﴿حافظوا على الصلوات والصلوة الوسطى﴾؛ صحیح مسلم ١/ ٤٣٦ (٢٠٣) المساجد: باب الدليل لمن قال: الصلوة الوسطى هي صلوة العصر۔

''اللہ تعالیٰ ان کے پیٹوں اور قبروں کو آگ سے بھرے۔''

سینے میں ہر قسم کے راز اور سازشیں بھری ہوتی ہیں اور قبر میں انسان کا جسم دفن ہوتا ہے قیامت کے روز رب تعالیٰ جسم کو قبر سے اور راز کو سینے سے نکال دے گا۔ جسم سطح زمین پر نظر آئے گا اور راز کے آثار و نشانات چہرہ پر آشکارا ہوں گے۔

جیسا کہ فرمایا:

﴿يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ﴾ (۵۵/ الرحمن:۴۱)

''مجرم اپنی علامت سے پہچانے جائیں گے۔''

فرمایا: ﴿سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ﴾ (۶۸/ القلم:۱۶)

''ہم عنقریب ان کی ناک پر داغ دیں گے۔''

ویسے تو اللہ تعالیٰ ہر وقت انسان کے اعمال سے باخبر ہے۔ لیکن اس دن خاص طور پر ان کی خبر رکھے گا، تاکہ ان کے اعمال کی جزا اور بدلہ دیا جاسکے، یہاں علم بول کر اس کا لازمی نتیجہ مراد لیا گیا ہے۔ [1]

والحمدللہ رب العالمین

[1] التبیان: ۵۰-۵۳۔

تفسیر سورۃ العصر

﴿ وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ ﴾ (۱۰۳/ العصر:۱۔۲)

''قسم ہے زمانے کی، بیشک تمام انسان گھاٹے میں ہیں۔''

یہ سورت بھی ان سورتوں میں سے ہے جن میں انسانی حالت پر قسم بیان کی گئی ہے اور جواب قسم مذکور ہے۔ یہ سورت باوجود اختصار کے معانی مطالب کے لحاظ سے بڑی عظمت وشان رکھتی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ لوگ اگر پوری طرح اس میں غور کریں تو ان کو کافی ہوجائے۔ عصر کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ یہاں مراد زمانہ ہے۔ عصر کے معنی دہر (زمانہ) کے لینا لغت عرب میں عام شائع ہے جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے:

ولن یلبث العصران یوم ولیلة اذا طلبا ان یدی کاماتیمّما

''زمانہ یعنی رات دن کو ٹھہراؤ نہیں ہے جبکہ ان دونوں کو کسی مقصد کے حصول کے لیے طلب کیا جائے۔''

زمانہ کی قسم اس لیے بیان ہوئی کہ اس میں عبرت وموعظت کا بہت بڑا سرمایہ موجود ہے، اس کے ہر گوشے میں قدرت کی نشانیاں روشن ہیں۔ رات دن کی گردش، عزیز و علیم کی قدرت اندازہ سے جاری ہے اس سے پوری کائنات کا نظام اور مصلحتیں مناسب ترتیب کے ساتھ قائم ہیں۔ رات دن کا یکے بعد دیگرے آنا، دونوں کا کبھی برابر اور کبھی چھوٹا بڑا ہونا، سردی، گرمی اور روشنی وتاریکی کے لحاظ سے مختلف ہونا، حیوانات کا چل پڑنا، سکون وراحت حاصل کرنا اور زمانہ کا صدیوں، سالوں، مہینوں، دنوں اور گھنٹوں میں بٹ جانا، یہ سب کچھ رب تعالیٰ کی قدرت وحکمت کے بڑے دلائل اور نشانیاں ہیں۔

اعمال کی جزا اور بدلہ پر اُس عصر کی قسم کھائی ہے۔ جس میں بندوں کے افعال وحرکات واقع ہوتے ہیں۔ اس طرح زمانہ، انسان، اعمال کی پیدائش کے

ذکر سے معاد (قیامت) پر تنبیہ فرمائی کہ جس طرح قدرت اس ابتدائی سلسلہ پیدائش سے عاجز نہیں رہی ہے اسی طرح دوبارہ پیدا کرنے سے بھی عاجز نہیں رہ سکتی۔

جس اللہ کی حکمت نے زمانہ انسان اوران کے اعمال کی پیدائش کو چاہا، اوران کو خیروشر کے لحاظ سے دوقسموں میں بانٹ دیا۔وہ اس بات سے بے زار ہے کہ مجرم و وفادار کو یکساں بدلہ دے، فاجروصالح کوایک ہی نظر سے دیکھے اور دونوں قسموں کورابح (نفع والا) خاسر (گھاٹے والا) بنادے۔(یہ اس کی شانِ عدل کے یکسر خلاف ہے۔) انسان فی نفسہ خاسرونا کام ہے۔ہاں مگروہ شخص جس پر اللہ رحم کرے اور ہدایت، اعمال صالحہ اور تبلیغ حق کی توفیق عطا فرمائے۔

﴿ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ﴾ (۱۰۳/ العصر:۲) کی تفسیر سورۂ والتین میں آیت ﴿ ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ۙ﴾ (۹۵/ التین:۵) ہے۔مومن صالح صورت میں الا کے ذریعہ مستثنیٰ (الگ) رکھا گیا ہے۔

سورۂ والعصر اوروالتین کالطیف فرق

غور و فکر سے یہاں عجیب نکتہ ہاتھ لگتاہے۔سورۂ والعصر میں نقصان اور گھاٹے کا بیان ہے اس لیے استثنا کادائرہ محدود اورتنگ رکھا گیاہے۔یعنی گھاٹے سے وہ خالی ہے جس میں یہ چار صفتیں پائی جائیں:

① ایمان ② عمل صالح ③ تبلیغ حق ④ صبر

سورۂ والتین میں بجائے خُسر (گھاٹے) کے اسفل السافلین کی طرف لوٹانے کوبیان فرمایاہے اس بنا پر مستثنیٰ کاحلقہ وسیع چھوڑا گیاہے یعنی اسفل السافلین سے وہ بچیں گے جو ایمان اورعمل صالح سے آراستہ ہوں گے۔یہاں تبلیغ حق اور صبر کا بیان نہیں ہے یہ دونوں صفتیں اصل ایمان اورعمل صالح پر زائد ہیں۔ان کے چھوٹ جانے سے مومن گھاٹے میں تورہ سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ اسفل السافلین میں ہی پہنچ جائے۔کبھی انسان اپنے ذاتی

واجبات تو بجالاتا ہے لیکن دوسروں کو بھلائی کا حکم اور برائی سے نہیں روکتا یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک زائد درجہ ہے، جو کبھی فرض عین ہوتا ہے اور کبھی فرض کفایہ (یعنی کچھ لوگوں پر) اور کبھی مستحب (پسندیدہ۔)

اسی طرح تواصی بالحق (تبلیغ حق) کی صورت میں یہ حق واجب بھی ہوتا ہے اور مستحب (غیر واجب) بھی۔یہی حال صبر کا بھی ہے ایک ضروری اور ایک غیر ضروری۔

پس جس مومن صالح نے اپنے ذاتی فرائض کے ساتھ تبلیغ حق اور تلقین صبر کا کام بھی کیا اُس نے اپنے آپ کو اس گھاٹے سے بچالیا۔جس میں وہ لوگ مبتلا ہورہے ہیں جنہوں نے صرف ایمان اور عمل صالح پر اکتفا کیا۔

یہاں پر دو چیزیں ہیں جن کا فرق ذہن نشین کرنا ضروری ہے:

① خسار مطلق، پورا نقصان ② مطلق خسار، کچھ نقصان

جس نے چاروں صفتیں اپنے اندر پیدا کرلیں وہ ہر قسم کے نقصان سے بچ گیا اور جس نے ابتدائی دو باتیں حاصل کیں وہ خسار مطلق سے تو محفوظ ہوگیا۔لیکن بہ نسبت پہلے گروہ کے کچھ نہ کچھ نقصان میں ضرور رہا۔اگر کوئی شخص ایک سودے میں نفع پائے اور دوسرے میں گھاٹا تو اس کو بھی کہہ سکتے ہیں:

"انه فی خسر" "وہ بلاشبہ گھاٹے میں ہے۔"

یہی معنی ہیں ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اس قول کے:

لقد فرّطنا قراریط کثیرۃ۔[1]

"یعنی ہم نے بہت سے جنازوں کے ساتھ نہ چلنے سے کثیر مقدار قیراط کے برابر ثواب کی ضائع کردی۔"

یہ بھی نقصان کی ایک صورت ہے لیکن مطلقاً نہیں بلکہ اس شخص کے مقابلہ

---

[1] صحیح البخاری ١/ ٤٤٥ (١٢٦٠) الجنائز: باب، فضل اتباع الجنائز؛صحیح مسلم ٢/ ٦٥٢(٩٤٥)، الجنائز: باب فضل الصلوۃ علی الجنازۃ واتباعها۔

میں جواس ثواب کو پابندی سے حاصل کرتا رہا ہو۔سورۂ والتین میں چونکہ ثم رددناہ فرمایا ہے اس لیے اصل ضروری ایمان اور عمل صالح کو بیان کیا گیا ہے۔یعنی جس نے ان دونوں کو چھوڑ دیا وہ پستی اور جہنم کی گہرائی سے نہیں بچ سکتا۔

صفات اربعہ کا باہمی تعلق

ایمان ،عمل صالح،تبلیغ حق اور تلقین صبران چاروں میں گہرا تعلق ہے۔انسان میں اللہ تعالیٰ نے دو قوتیں اور دو حالتیں رکھی ہیں:

① قوت علمی،اسی کو ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔

② قوت عملی،جو کہ عملوا الصالحات میں بیان ہوئی ہے۔

اسی عمل صالح میں دوسروں کو تبلیغ کرنا بھی شامل ہے۔اپنی ذات کے علاوہ غیروں کی اصلاح بھی کرنا ہے۔اسی طرح انسان دو حالتیں بھی رکھتا ہے:

① اپنے آپ کو کامل کرنا۔

② اپنے غیر کو درجہ کمال تک پہنچانا۔

لیکن یہ کمال وتکمیل کی حالتیں حق سے واقفیت اور اس پر صبر کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتیں۔

تمام کمالات انسانی کا احاطہ

اس چھوٹی سورت میں تمام کمالات انسانی کو نہایت جامعیت اور مناسبت کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔علم نافع،عمل صالح،اپنے نفس اور اپنے بھائی کو ایمان اور عمل صالح کی نصیحت کرنا اور دوسروں کی نصیحت کو خندہ پیشانی سے قبول کرنا۔یہ سب انسانی مدارج کمال ہیں۔

﴿ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴾ (۱۰۳/ العصر:۳)

”اور آپس میں نصیحت کی حق کے ساتھ اور آپس میں ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔“

اس آیت میں منصب امامت کی طرف اشارہ ہے۔(یعنی ایک مومن دینی

غلبہ کی صورت میں پیشوائی اور راہنمائی کا حق رکھتا ہے۔) جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا ۖ وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ﴾ (۳۲/ السجدة:۲٤)

"اور بنایا ہم نے ان کو راہنما، امام کہ ہدایت کرتے ہیں ہمارے حکم کے ساتھ، جبکہ انہوں نے صبر کیا، اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔"

پس نتیجہ یہ نکلا کہ دینی امامت وقیادت صرف یقین وصبر سے حاصل ہوسکتی ہے۔

صبر کی قسمیں

صبر کی دو قسمیں ہیں:

① صبر بالمقدور، یعنی مقدرات الٰہیہ، مصائب وصدمات پر صبر کرنا۔

② صبر بالمشروع، یعنی شریعت وقانون الٰہی کی پوری طرح پابندی کرنا۔

اس کی بھی دو نوع ہیں:

1. صبر علی الامر، احکام اسلامی پر صبر، یعنی ان کو صحیح طور پر بجالانا۔
2. صبر من النواھی، یعنی جن چیزوں اور کاموں سے روکا گیا ہے ان سے صبر اور پرہیز کرنا۔

پہلی قسم ارادہ اور فعل پر صبر اور دوسری قسم عقل وارادہ سے صبر ہے۔ صبر بالمقدور میں مومن وکافر، نیک وبد شریک ہیں۔ محض صبر کی بنا پر ثواب نہیں مل سکتا تاوقتیکہ صبر ایمان اور اختیار کی حالت میں نہ کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"میری بیٹی سے کہو کہ صبر کرے اور ثواب کی نیت رکھے۔" [1]

---

[1] صحيح البخاري ۱/ ٤٣٢ (۱۲۲٤) الجنائز: باب، ما يرخص من البكاء من غير نوح؛ صحيح مسلم ۲/ ٦٣٥ (۹۲۳) الجنائز: باب البكاء على الميت۔

قرآن میں ہے:

﴿ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِیْرٌ۝ ﴾ (۱۱/ ھود:۱۱)

''مگر جن لوگوں نے صبر کیا اور نیک اعمال کیے یہی لوگ ہیں کہ ان کے لیے بخشش اور بڑا ثواب ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا ﴾ (۳/ آل عمران:۱۲۵)

''کیوں نہیں! اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو۔''

معلوم ہوا کہ صبر بغیر ایمان وتقویٰ کے اس بدن کی طرح ہے جو یقین وتوحید سے خالی ہے۔ جس قدر شریعت پر یقین ہوگا۔ اسی قدر مصائب پر صبر کی قدرت حاصل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا یَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ۝ ﴾

(۳۰/ الرّوم:۶۰)

''پس صبر کیجیے بیشک اللہ کا وعدہ حق ہے اور آپ کو کافر بے وزن نہ کردیں۔''

اس آیت میں صبر کا حکم دیا ہے، اور ان لوگوں کی مشابہت سے روکا گیا ہے جو بے صبری کی وجہ سے یقین کی دولت سے محروم ہیں۔ جو شخص جس قدر ایمان سے محروم ہوگا اسی قدر صبر سے خالی ہوگا اور جتنی کمی صبر میں ہوگی اتنی ہی بے وقاری اور بے وزنی ہوگی۔ ایمان دار صابر، سنجیدہ اور باوقار ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنی عقل وتدبیر سے کام لیتا ہے۔ صبر وایمان سے محروم انسان ہلکا پھلکا محض جذبات پرست ہوتا ہے۔ خواہشات اور جھوٹی تمنائیں جدھر چاہیں اس کا رخ پھیر دیتی ہیں۔ جیسے بے وزن ہلکی چیزوں کو ہوائیں اڑا کر لے جاتی ہیں۔ [1]

[1] التبیان:۵۳-۵۵۔

تفسیر سورۃ الکافرون

سوال ﴿لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۙ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۚ﴾

(۱۰۹/ الکافرون:۲۔۳)

یہاں بجائے مَنْ کے جو عقلا کے لیے بولا جاتا ہے، مَا کیوں استعمال کیا گیا ہے جو کہ دراصل غیر عقلا پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر کیسے درست ہوا؟

جواب یہاں ایسے معبود کا ذکر مقصود ہے جو صحیح معنی میں عبادت کے لائق ہو۔ مَا کے ذکر سے اسی صفت کی طرف اشارہ ہے۔ مَنْ کے بیان سے یہ مقصود حاصل نہ ہوسکتا تھا، اس سے مراد صرف ذات ہوتی ہے یعنی ایسی ذات جس کی عبادت کرتا ہوں اور مَا کی صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ میں اس کی عبادت کرتا ہوں جو کہ عبادت کا اہل اور مستحق ہے۔ اس طرح باری تعالیٰ کی عبادت کرنے کی وجہ بھی معلوم ہوتی ہے۔ یہی معنی ہیں محققین نحویوں کے اس قول کے، کہ 'مَا' کا ذکر صفات کے اظہار کے لیے ہوتا ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے:

﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ (٤/ النساء:۳)

''نکاح کرو جو تم کو بھلی لگیں عورتوں میں سے۔''

یہاں اصل مقصود صفت ہے، یعنی ایسی عورت سے شادی کرو جو اچھائی اور بھلائی سے موصوف ہو۔ اسی بنا پر مَنْ کے بجائے مَا ذکر کیا گیا ہے۔

سوال اس سورۃ میں ایک ہی مفہوم کو بار بار کیوں دہرایا گیا ہے؟

جواب ﴿لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۙ﴾ (۱۰۹/ الکافرون:۳) ''میں عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو۔'' یعنی نہ تو اب میں زمانہ حال میں تمہارے معبودوں کی عبادت کرتا ہوں، نہ آیندہ کروں گا اور اس کے مقابلہ میں ہے:

﴿وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۚ﴾ (۱۰۹/ الکافرون:۳) ''اور نہ میں عبادت کرنے والا ہوں جس کی تم نے عبادت کی۔'' یعنی وحی الٰہی آنے سے پہلے میں

شرک سے بچا ہوا تھا۔ ماضی کا صیغہ لا کر اسی مفہوم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ گویا آیت کے معنی یہ ہوئے لم أعبد قط ما عبد تم'' میں نے کبھی بھی ان کی عبادت نہیں کی جن کی تم کرتے ہو۔'' اور یہی معنی اس کے مقابل آیت ﴿وَلَآ أَنتُمْ عَٰبِدُونَ مَآ أَعْبُدُ﴾ (۱۰۹/ الکافرون:۳) کے ہیں۔ ''یعنی جس کی میں ہمیشہ عبادت کرتا رہا ہوں، اس کی تم نے گزشتہ زمانہ میں بھی عبادت نہیں کی۔'' اس تفسیر کی بنا پر تکرارِ افعال کا اعتراض اٹھ گیا اور سورت نفی کے تمام زمانوں (ماضی اور حال و مستقبل) کو شامل ہوگئی۔

سوال اس میں کیا حکمت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے اعبد (مضارع کا صیغہ) استعمال کیا گیا ہے اور کفار کے ذکر میں ماضی اور مضارع دونوں قسم کے صیغے موجود ہیں؟

جواب اس انداز بیان سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نبی ﷺ کا معبود ہر زمانہ میں ایک ہی ہے۔ سیدھی راہ سے نہ پہلے کبھی کجی، ٹیڑھا پن ہوا ہے اور نہ کبھی آیندہ ہوسکتا ہے، بخلاف مشرکین کے کہ وہ دراصل اپنی خواہشات اور جذبات کی پیروی کرتے ہیں۔ آج ایک معبود کی عبادت کی تو کل دوسرے کے سامنے سر جھکا دیا۔ ہر زمانہ میں ایک نیا معبود تراش لیتے ہیں۔ اس لیے تَعْبُدُوْنَ اور عَبَدْتُّمْ ماضی اور مضارع دونوں کو بیان کر دیا۔

سوال مشرکین کے بیان میں عَابِدُوْنَ اسم فاعل کا صیغہ دونوں بار لایا گیا ہے اور نبی ﷺ کے ذکر میں ایک مرتبہ مضارع اَعْبُدُ اور دوسری آیت میں اسم فاعل عَابِدٌ بیان ہوا ہے۔ اس کی حکمت کیا ہے؟

جواب اس سورت کا مقصود یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ مشرکین کے معبودانِ باطل سے قطعی براءت اور بے زاری ظاہر کر دیں۔ لا اعبد کے معنی ہیں کہ میں ہر وقت ہر طرح سے ان کی عبادت سے بے زار ہوں۔ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ کے معنی ہیں کہ غیر اللہ کی عبادت کے وصف سے میں یکسر خالی اور بری ہوں، نہ عارضی

طور پر میں شریک کرسکتا ہوں نہ دائمی طور پر۔ وَلَا اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ کا منشا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کا وصف دائمی طور پر ان میں نہیں پایا جاسکتا۔ کبھی وہ اللہ کی طرف جھک جاتے ہیں اور کبھی اپنے خود ساختہ معبودوں کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ یہ دوام و استقلال تو اسی کو حاصل ہوسکتا ہے جو صرف ایک اللہ کا عبادت گزار بنا رہے، اسی لیے وَلَا اَنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ نہیں کہا گیا۔ اللہ کی عبادت تو وہ بھی کرتے ہیں مگر شرک کی آلائشوں کے ساتھ ۔ مطلقاً عبادتِ الٰہی کی ان سے نفی نہیں کی گئی بلکہ ان کی صفت ''عابدیت'' کا انکار کیا گیا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے جو اللہ کے ساتھ عبادت میں دوسروں کو شریک کرتا ہے، وہ اللہ کا عابد کہلا ہی نہیں سکتا۔ اس نکتہ کو سمجھ لینے کے بعد عبد کا مقام پوری طرح ظاہر ہوگیا۔ عبد یا عابد وہ ہوسکتا ہے جو بالکلیہ تمام معبودانِ باطل سے کٹ کر یکسوئی کے ساتھ اللہ کے دامن سے وابستہ ہو جائے۔ اس تفسیر کے بیان سے اس امر کی وجہ بھی ظاہر ہوگئی کہ اس سورۂ کا نام ''اخلاص'' بھی کیوں ہے اور یہ چوتھائی قرآن کے ہم پلہ کیسے ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سورۂ میں توحید کا مغز بھرا ہوا ہے۔

سوال 5 یہاں نفی کے واسطے لَنْ کے بجائے لا کیوں لایا گیا ہے ، حالانکہ لَن میں بظاہر تاکید زیادہ پائی جاتی ہے؟

جواب لن میں صرف زمانہ مستقبل کی نفی ہوتی ہے اور '' لا'' کی نفی پوری طرح حال اور مستقبل میں جاری ہوتی ہے لہٰذا یہاں ''لا'' کا ہی ذکر مناسب ہے۔ '' لَن'' اور''لا'' میں فرق کی ظاہر وجہ یہ ہے کہ ''لا'' کے آخر میں الف ہے جو کہ وسعت اور پھیلاؤ کے ساتھ اپنے مخرج سے نکلتا ہے ، اس لیے اس کے معنی میں بھی وسعت ہی مراد ہوگی۔ لیکن''لن'' کے آخر میں''ن'' ہے جس کے مخرج میں امتداد اور پھیلاؤ نہیں ہے۔ اس لیے اس کے معنی بھی محدود ہیں۔

ان کا واضح فرق حسبِ ذیل آیتوں سے بخوبی ہوسکتا ہے:

﴿لَنْ تَرٰىنِیْ﴾ (۷/ الاعراف:۱۴۳) '' تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا''

یہاں رؤیت الٰہی کی نفی ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ ایک وقتی نفی اور انکار مراد

ہے جبکہ:

﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ ﴾ (٦/ الانعام:١٠٣)

''نگاہیں ذات باری کا ادراک نہیں کر سکتیں۔''

سے دائمی نفی مراد ہے، اسی لیے ''لا'' بیان کیا گیا۔

﴿ لَنْ يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا ﴾ (٢/ البقرة:٩٥) ﴿ لَا يَتَمَنَّوْنَهُ أَبَدًا ﴾ (٦٢/ الجمعة:٧)

ان دونوں آیتوں میں انداز بیان کے فرق کا راز بھی مذکورہ بالا قاعدہ کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے۔

سوال اس سورت میں نفی محض ہے، حالانکہ توحید کے دو پہلو ہیں نفی اور اثبات......؟

جواب اس سورت میں غیر اللہ کی عبادت کی نفی اور شرک سے بار بار براءت کی گئی ہے۔ یہ اس سورت کی خاص خوبی اور اہم مقصد ہے، اسی لیے موحدین اور مشرکین دونوں گروہوں کے بیان میں لائے نفی ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اس نفی کے ساتھ اثبات بھی ہے ﴿ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ﴾ (١٠٩/ الكافرون:٢) میں عبادتِ غیر سے صرف انکار وبراءت ہے۔ ﴿ وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ ﴾ (١٠٩/ الكافرون: ٣) میں اس بات کا اعلان ہے کہ میرا ایک معبود ہے جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور تم اس سے الگ ہو۔ پس نفی و اثبات اس سورت میں یکجا ہو گئے۔

امام الحنفاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اعلان بھی اسی کے ہم معنی ہے:

﴿ إِنَّنِي بَرَاءٌ مِمَّا تَعْبُدُونَ ۝ إِلَّا الَّذِي فَطَرَنِي ﴾ (٤٣/ الزخرف:٢٦)

''بے شک میں ان سے بری اور بے زار ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو مگر وہ جس نے مجھ کو پیدا کیا۔''

اور یہی مطلب ہے گروہ موحدین اصحاب الکہف کے اس قول کا:

﴿ وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ ﴾ (١٨/ الكهف:١٦)

''اور جبکہ تم ان (مشرکین) سے الگ ہو گئے اور جن کی وہ عبادت

کرتے تھے مگر اللہ سے۔"

غور کریں تو واضح ہو جائے گا کہ اس سورۃ الکافرون میں بھی لا الہ الا اللہ کی حقیقت پوری طرح جلوہ گر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ صبح اور مغرب کی سنتوں میں سورۃ الاخلاص اور اس سورت کو پڑھا کرتے تھے۔ یہ دونوں سورتیں توحید کی دو قسموں کو شامل ہیں جن کے بغیر بندے کی نجات و فلاح ناممکن ہے۔ [1]

[1] (بدائع الفوائد ١/ ١٣٤-١٣٨) ببعض التصرف۔

مراجع ومصادر

① الجامع لأحكام القرآن: لأبی عبدالله محمد بن احمد الأنصاری القرطبی۔
ط: دارأحیاء التراث العربی، بیروت۔لبنان۔

② تفسیر البغوی المسمٰی معالم التنزیل: لأبی محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی، بتحقیق: "خالد عبدالرحمن العك" و "مروان سوار"
ط: اداره تالیفات أشرفیه بیرون گیت، ملتان۔

③ تفسیر القرآن العظیم: للحافظ عماد الدین أبی الفداء اسماعیل بن کثیر القرشی الدمشقی۔
ط: دار احیاء الکتب العربیة عیسٰی البابی الحلبی و شرکاؤه۔

④ جامع البیان فی تأویل القرآن المعروف "تفسیر طبری" محمد بن یزید بن کثیر الآملی، ابوجعفر الطبری، بتحقیق احمد محمد شاکر۔
ط: مؤسسة الرسالة، ١٤٢٠ھ

⑤ تفسیر روح البیان: اسماعیل حقی بن مصطفی الإستانبولی الحنفی الخلوتی۔
ط: داراحیاء التراث العربی۔

⑥ المعجم المفهرس لالفاظ القرآن الکریم: محمد فؤاد عبدالباقی۔
ط: داراحیاء التراث العربی بیروت۔

⑦ بدائع التفسیر "الجامع لتفسیر الإمام ابن القیم الجوزیة": جمعه، یسری السید محمد۔
ط: دارابن الجوزی، الطبعة الأولی ١٤١٤ھ۔

⑧ الضوء المنیر علی التفسیر: علی الحمد المحمد الصالحي
ط: مؤسسة النور للطباعة والتجلید بالتعاون مع مکتبة دارالسلام الریاض۔

⑨ الصحیح البخاری: لامام ابی عبدالله محمد بن اسماعیل البخاری الجعفی۔

ط: دارابن کثیر دمشق الطبعة الرابعة، ١٤٩٠ھ۔

⑩ الصحیح مسلم: لإمام أبی الحسین مسلم بن حجاج القشیری النیسابوری۔
ط: دارالفکر بیروت۔ الطبعة الثانیة ١٣٩٨ھ۔

⑪ السنن ابی داود، لامام ابی داود سلیمان بن الأشعث السبحستانی الأزدی۔ اعداد و تعلیق: عزت عبید الدعاس۔
ط: محمد علی السید، الطبعة الاولی ١٣٨٨ھ۔

⑫ الجامع الترمذی: لأبی عیسی محمد بن عیسی بن سوره، بتحقیق: احمد محمد شاکر۔

⑬ السنن ابن ماجه: لأبی عبدالله محمد بن یزید القزوینی، بتحقیق: محمد فؤاد عبدالباقی۔
ط: داراحیاء التراث العربی بیروت۔

⑭ المسند: لإمام احمد بن حنبل و بهامشه منتخب کنز العمال فی سنن والأقوال۔
ط: المکتب الإسلامی بیروت۔

⑮ المؤطا: لإمام مالك بن انس، روایة أبی مصعب الزهری المدنی بتحقیق: د/ بشار عواد معروف، محمود محمد خلیل۔
ط: مؤسسة الرسالة، الطبعة الثالثة ١٤١٨ھ۔

⑯ المعجم الکبیر: للحافظ أبی القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی بتحقیق: حمدی عبدالمجید السلفی۔
ط: الدار العربیة للطباعة بغداد، الطبعة الاولی، ١٣٩٩ھ۔

⑰ السنن الدارمی: للحافظ أبی محمد عبدالله بن عبدالرحمن الدارمی بتحقیق: السید عبدالله هاشم یمانی المدنی۔
ط: نشر السنة ملتان۔ باکستان۔

⑱ المستدرك علی الصحیحین: لإمام ابی عبدالله محمد بن عبدالله

المعروف بالحاكم النيسابوری۔

ط: مكتبة و مطابع النصر الحديثة الرياض۔

⑲ المسند أبی الطيالسی: للحافظ سليمان بن داؤد بن الجارود الفارسی البصری۔

ط: دار المعرفة بيروت۔

⑳ السنن الكبرىٰ: للحافظ أبی بكر احمد بن الحسين بن علی البيهقی۔

ط: دار الفكر بيروت۔

㉑ المصنف: للحافظ أبی بكر عبدالرزاق بن همام الصنعانی، بتحقيق: حبيب الرحمن الأعظمی۔

ط: المكتب الإسلامی بيروت، الطبعة الاولی ١٣٩٠ھ۔

㉒ المصنف: لإمام أبی بكر عبدالله بن محمد بن ابی شيبة العبسی۔

ط: ادارة القرآن و العلوم الإسلامية اشرف منزل۔ كراتشی، باكستان۔

㉓ شرح مشكل الآثار: لأبی جعفر أحمد بن محمد بن سلامة الأزدی المصری المعروف بالطحاوی، بتحقيق: شعيب الأرنؤوط۔

ط: مؤسسة الرسالة، الطبعة الأولی ١٤١٥ھ۔

㉔ موارد الظمآن إلی زوائد ابن حبان: للحافظ نور الدين علی بن أبی بكر الهيثمی، بتحقيق: محمد عبدالرزاق حمزة۔

ط: دار الكتب العلمية بيروت۔

㉕ سلسلة الأحاديث الصحيحة: محمد ناصر الدين الالبانی۔

ط: الدار السلفية الكويت، الطبعة الأولی ١٣٩٩ھ۔

㉖ ارواء الغليل فی تخريج أحاديث منار السبيل: محمد ناصر الدين الألبانی۔

ط: المكتب الاسلامی، الطبعة الاولی ١٣٩٩ھ۔

مختلف رسائل میں شائع ہونے والے تفسیری افادات از امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کی اجمالی فہرست

۱	سورۂ فاتحہ کے بعض اہم تفسیری نکات	المنبر، محدث لاہور، مئی ۲۰۰۱ء
۲	تفسیر النصف الآخر من سورۃ الفاتحۃ [۲ اقساط]	محدث، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۵ء
۳	قرآنی کلمات کی حکیمانہ ترتیب	میثاق، مارچ ۱۹۶۲ء
۴	افادات ابن القیم (دعا کے آداب و اقسام)[۳ اقساط]	الاعتصام ۳۱ مئی ر ۷ ر ۱۴ جون ۱۹۸۵ء
۵	چند قرآنی کلمات کی تاویل وتشریح[۲ اقساط]	المنیر، ۲۲ نومبر/۵ دسمبر ۱۹۵۷ء
۶	قرآنی معارف وحقائق (آیت حج کے اسرار وحِکم)	المنیر، ۲۴ مئی ۱۹۵۷ء
۷	قرآنی معارف و حقائق (سورۃ القیامۃ، سورۃ الفجر) [۳ اقساط]	المنیر، ۶، ۲۰ جون/۴ جولائی ۱۹۵۸ء
۸	تفسیر سورۃ القیامۃ	المنبر، اکتوبر ۱۹۶۴ء
۹	تفسیر سورۃ التکویر	المنیر، دسمبر ۱۹۶۴ء
۱۰	تفسیر سورۃ البروج	المنبر، ستمبر ۱۹۶۴ء
۱۱	تفسیر سورۃ البلد	المنیر، ۱۹ جولائی ۱۹۵۸ء
۱۲	تفسیر سورۂ والشمس	ہفت روزہ الحدیث امرتسر، ۵ اپریل ۱۹۴۰ء، الارشاد جدید کراچی، جنوری ۱۹۶۴ء
۱۳	تفسیر سورۃ اللیل [۳ اقساط]	المنیر، جلد ۱۰(۱۹۵۸ء) الحدیث امرتسر ۲۱، ۲۸ جون ۱۹۴۰ء
۱۴	تفسیر سورۃ العادیات	المنیر، یکم اگست ۱۹۵۸ء، محدث جون ۲۰۰۱ء

۱۵	تفسیر سورۃ العصر	المنبر، ۲۱ اگست ۱۹۶۴ء
۱۶	تفسیر سورۃ الکافرون	محدث، ستمبر ۲۰۰۱ء

ان کے علاوہ باقی تمام مضامین غیر مطبوع تھے۔